سلسلۂ مطبوعات عالمیہ جامعۂ عثمانیہ

جدید

قانون بین الممالک کا آغاز

واحد طباعت اصل فرانسیسی کا سنہ ۱۸۹۴ع بروسیل و پاریس

تالیف

ارنسٹ نیس

استاذ قانون جامعۂ بروسل

ترجمہ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب

استاذ قانون جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۳۶۴ھ م سنہ ۱۳۵۴ف م سنہ ۱۹۴۵ع

دارالطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

صفحہ

قرون متوسطہ کی جنگوں کی بے رحمی۔ واعظ، شاعر، مولف، مدبر اور سپاہی۔ ضرورت سے زیادہ ہلاکت خیز ہتیاروں کی تیسرے انوسنٹ کی طرف سے مانعت۔ غیر منصفانہ جنگ کی تائید پر شرح نگاروں کی پابندیاں مصنف۔ جنگ سے تمام تعلقات کا ٹوٹ جانا۔ اجنبی تاجر۔ قانون مذہبی کی عطا کردہ حفاظتیں۔ تنخواہ یاب فوجیں انگلستان، فرانس، اٹلی اور جرمنی میں۔ فوجی قواعد انگلستان اور اسپین میں مسلمانوں کا قانون جنگ۔ فوجی قواعد فرانس، سوئستان، نشیبستان اور جرمنی میں بحری جنگ۔ دشمن سے بات کا پاس۔ ملحدوں سے بات کا پاس۔ جنگ میں دھوکہ دینا۔ گراتیان۔ اکوی ناس کا سینٹ ٹامس۔ لنانو کاڑاں۔ کرستین دپیزان لودی کا مارتن۔ ژول فے ریتی۔ آیالا۔ البیری کس جنتی لیس۔ شیپیو جنتی لیس۔ عارضی صلح۔ زہریلے ہتیار۔ پانی میں زہر ڈالنا۔ شہروں کو جلا دینا۔ ناطرفداری کا تصور۔ ژاں بوتے رو۔ وانسس لا کاناۓ مایر ممنوعہ اسباب جنگ۔ رومی ویونانی شہنشاہوں اور پوپوں کے احکام۔ جنگ اور اسباب کے ممنوعہ ہونے کا اعلان۔ تہدید و تدارک۔ فرضی ناکہ بندی۔ ناکہ بندی کا نظریہ۔ خارہ۔ کتاب بحری احکام اور ناطرفدار عمل۔ ناطرفدار سامان دشمن جھنڈے تلے۔ معاہدے۔ قیدیوں کو غلام بنانا۔ کلیسا کا نظریہ۔ بارتولے۔ بالدے۔ عیسائیوں کی آپس کی نیز مسلمانوں سے جنگ میں قیدی۔ واقعات۔ حفاظتیں۔ فدیہ۔ تبادلہ۔ آزاد کرنے سے انکار۔ اقرار بر رہائی۔ یرغمال۔ دشمن سردار کا قید ہو جانا۔ کونارویں کی موت اور موقف۔ غنیمت۔ رومی اور قرون متوسطہ کے نظریے۔ کتاب سات ارکان اور ہرجے کا معاوضہ۔ فوجی قواعد اور مال غنیمت۔ چوتھا انوسنٹ۔ روزاتے۔ بارتولے۔ لنانو کاڑاں۔ سالس تو۔ اونورے بونے۔ آریا۔ داموویر۔ بحری غنیمت۔ عدالت امارت بحریہ۔ گرفتاری اور چوبیس گھنٹے کا نظریہ۔

باب دوازدہم۔ صلح اور صلح کے معاہدے۔ ۴۴۵

جنگ ایک استثنائی حالت ہے اور امن عادتی۔ مولف۔ دوامی امن۔ عام معافی کی شرط۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ اس ترجمے کے متعلق

پیش لفظ اور دیباچے عام طور سے پڑھے نہیں جاتے۔ لیکن یہاں کم سے کم پہلا پارۂ تحریر پڑھ لیا جائے تو ناظر کتاب کو بہت سی الجھنیں پیدا ہی نہ ہوں۔

رسم الخط اور اعراب

ہماری زبان میں تقریباً ہزار سال سے زبر، زیر، پیش کے صرف سہ گانہ عربی اعراب پر اکتفا کی جاتی رہی ہے گو حروف تہجی میں عربی پر کوئی درجن بھر اضافہ ہو گیا: کچھ زمانۂ قدیم ہی میں اور کچھ ہمارے ہی زمانے میں مثلاً دو چشمی (ھ) وغیرہ۔ اعراب پر کم توجہ کی وجہ اس کا نسبتہً کم استعمال سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن بہرحال مزید اعرابی علامتیں درکار ہیں اور خود ہماری زبان کے الفاظ کے لیے واوٴ مجہول اور یائے مجہول کی طرح مجہول پیش اور مجہول زیر کی شدید ضرورت ہے۔ انگریزی کے کثیر رواج کے باعث بہت سے انگریزی نام جو زبانوں پر چڑھ گئے ہیں وہ تو مجہول زبر کے بھی متقاضی ہیں۔ اس وقت تمام عربی ممالک میں ایک اور حرف تہجی (ڤ) رائج ہو گیا ہے جو یورپی زبانوں کے حرف (وی) کے لیے ہے۔ سنسکرت ناموں کے لیے نہیں، اس کی مقامی ضرورت بھی ہے، اور یورپی ناموں کے لیے بین الاقوامی اور علمی ضرورت بھی۔ یکسانیت اور ہم آہنگی کی خاطر (ڤ) کو بھی بلا ترمیم اختیار کیے بغیر چارہ نہیں۔

ایک علمی کتاب میں، خاص کر قانون بین الممالک میں آنے والے ناموں کی وسیع ضرورتوں کے مدنظر، کم سے کم ان تین زائد اعرابی علامتوں اور ایک نئے حرف تہجی کی ضرورت ہے۔ چونکہ یہ اس کتاب میں کثرت سے برتے گئے ہیں، اس لیے ان کی تھوڑی سی مزید توضیح بے محل نہ ہوگی:۔

موجودہ	اضافہ کردہ
ـِ معروف زیر مثلاً اِس، اِیمان وغیرہ میں	ـٖ مجہول زیر مثلاً پہ ایک وغیرہ میں
ـُ معروف پیش اُس، دُور، نُور	ـٗ مجہول پیش ڈہ چور (= ڈاکو)
ـَ معروف زبر وَس قَلم	ـٚ مجہول زبر ہالٹن ناشنل اٹ یہ انگریزی آواز، الف اور یائے مجہول کے بین بین ہے۔
ـٓ معروف مد آسمان	مجہول مد آلن آڈم مجہول زبر ہی کی طرح لیکن زیادہ لمبی آواز
....	ڤ مثلاً لڤ ڈیل ٹوڤر لڤوڤ یہ آواز (ف) اور (و) کے بین بین ہے اور نیچے کے ہونٹ کو اوپر کے دانتوں سے دبانے پر نکلتی ہے۔

اس کے بعد اس کی مطلق ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ ناموں کو دو دو رسم الخطوں میں لکھا جائے۔ البتہ کتاب کے آخر اشاریے میں اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ مختلف یورپی زبانوں میں مختلف حروف کی آوازوں میں بے انتہا فرق ہے مثلاً (J) کا تلفظ انگریزی میں (ج) ہے تو فرانسیسی میں (ژ) اور جرمن میں (ی) وغیرہ وغیرہ۔ مزید برآں

جن جن کتابوں کا حوالہ ہے ان کے ناموں کا بھی ہم نے ترجمہ دیا ہے، اور اشاریے میں اصل زبان کا نام اسی کے رسم الخط میں دیا گیا ہے۔

زبان

اصل کتاب فرانسیسی زبان میں ہے۔ اس زبان سے ہمارے ہاں بہت کم ترجمے ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۸۰۰ء کے حیدر آبادی انگریزی "دوامی معاہدۂ حلیفی" نے فرانس کے ساتھ مملکت آصفیہ کے پرانے اور گہرے رابطے بالکل توڑ دیے اور باوجود پھلچری (پونڈی شیری) اور کارے کال کی "مشروط الخدمت انعام جاگیر" فرانسیسیوں کے قبضے میں بحال رہنے دینے کے، فرانسیسی تمدن اور ادبیات سے استفادہ ایک پوری صدی تک رک گیا، تا آنکہ سید علی بلگرامی نے "تمدن ہند" اور "تمدن عرب" کو فرانسیسی سے ترجمہ کر کے علمی تعاون کا یہ رشتہ پھر سے جوڑنے کی ہلکی سی کوشش نہ کی۔ دوسری طرف گارسیں دتاسی وغیرہ کے روایات جامعۂ پاریس میں اس قدر مستحکم ہیں کہ سنہ ۱۹۳۵ء اور سنہ ۱۹۳۹ء میں وہاں کے مدرسۂ السنۂ شرقیہ میں یورپی طلبہ نذیر احمد وغیرہ کی کتابیں فرفر پڑھتے دیکھے گئے۔

بلدۂ حیدر آباد سے خاص کر فرانسیسی اثرات مٹ نہ سکے۔ یہ سطریں محلۂ ترپ بازار میں لکھی جا رہی ہیں اور ہماری "نئی فوج" کے فرانسیسی سپہ سالار موسیو رئے منوں کے متعلقین میں سے کسی کا مکان کوئی تین چار نسلوں سے "ترپ باغ" کے نام سے ہمارے خاندان کی ملکیت میں چلا آ رہا ہے اور ڈیڑھ صدی کے ہمہ گیر انگریزی اثرات بھی اس "ترپ" کو "توڑ" نہ کر سکے۔ ہمارے ہاں کی "نظم جمعیت" نامی فوج میں تو ان پرانے روابط کے اثرات اب بھی کثیر(۱) اصطلاحی الفاظ میں برقرار ہیں۔

لیکن یہ سب بھی اس بات کے لیے قطعاً ناکافی ہیں کہ فرانسیسی محاورے ترجمے پر ہم لوگوں کو آسانی سے سمجھ میں آ جائیں۔ انشا پردازی میں ترجمہ بڑی مشق اور خاص صلاحیتیں چاہتا ہے؛ اور میرے لیے کسی کتاب کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں آئے ہوئے نو یا دس یورپی

زبانوں کے اقتباسات کوئی خاص دشواری نہ رکھتے لیکن پانچ پانچ سو ہزار ہزار برس پہلے کی زبانوں کے جملے بلکہ صفحوں کے صفحے مولف نے اپنے ناظرین پر ضرورت سے زیادہ حسن ظن رکھ کر نقل کر دوائے ہیں۔ اس بارے میں مترجم کی کچھ سرگزشت سنئے۔ قرون متوسطہ کی "بگڑی ہوئی" لاطینی کے بہت سے الفاظ میرے زیر استعمال لغت میں نہ ملے۔ ایسی چند عبارتیں ایک مقامی عیسائی مدرسے کے صدر کو بتائی گئیں۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ انتظار کروا کر انھوں نے معذرت کہلا بھیجی کہ وہ ان کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح پرانی فرانسی کے کچھ اقتباسات، ایک ایسے فرد کو بتائے گئے جس کی مادری زبان فرانسیی ہے اور جو خود ادبیات کا طیلسانی۔ سوائے ایک یا دو لفظوں کے قیاسی معنوں کے وہاں بھی معذرت ہی مل سکی۔ ناتسی ملحمۂ کبری نے متعلقہ دور کی زبانوں کے لغت منگو اسکنے کے راستے بند کر رکھے ہیں۔ آخر میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اپنی تدریسی ضرورتوں سے اس ترجمے کی بڑی عجلت تھی۔ ترجمے کو کوئی ڈیڑھ دو مہینوں میں ختم کرنا پڑا اور، پھر تفصیلی نظر ثانی اور اصل سے لفظ بلفظ مقابلے کا موقع پائے بغیر اسے چھپنے کے لیے بھیج دینا پڑا۔ یہ غیر ذمہ دارانہ معذرتیں نہیں، درد دل ہے۔ نہ معلوم کب تلافی کا موقع ملے۔

کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے جدید ادبی رجحان کے موافق آسان سے آسان زبان برتی جائے۔ ایک چیزیں تو رائج الفاظ کو بھی عمداً چھوڑ دیا گیا اور مثال کے طور پر "سولھواں لوئی" اور "اٹھارواں لوئی" لکھے گئے ہیں اور بیجا فارسیت کے "لوئی شانزدہم" اور "لوئی ہشدہم" سے پرہیز کیا گیا ہے۔

کتاب کا نام بھی دو ایک توضیحی لفظ چاہتا ہے۔ ہماری اخباری دنیا میں "بین الاقوام" کا لفظ انگریزی کے لفظی ترجمے کے باعث جاری ہے۔ لیکن ہمارا موضوع چونکہ "قوموں" کے نہیں بلکہ "مملکتوں"

کے باہمی برتاؤ کے قواعد ہیں اس لیے "بین الممالک" کی اصطلاح برتی گئی ہے، جو اب بالکل نامانوس بھی نہیں رہی ہے۔ خود انگریزی زبان کے علمی حلقوں میں اب "انٹرنا شنل" کی جگہ "انٹراسٹےٹل" کا لفظ پھیل رہا ہے۔ اصل میں ایک زمانے میں سیاسی قوم ہی سب کچھ تھی، نسل اور زبان اور اسی طرح کی چیزوں کا لحاظ نہ تھا۔ اب قوم کے لفظ سے جو معنے سب سے پہلے ذہن میں آتے ہیں، وہ نسلی قومیت کے ہیں۔

اصطلاحیں ہماری زبان میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، اور انگریزی الفاظ آسانی سے کھپ جاتے ہیں کیونکہ ان زبانوں کے بہت سے الفاظ پہلے ہی سے ہمارے ہاں موجود ہیں۔ اب نئی اصطلاحوں میں علاوہ اور امور کے اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ حتی الامکان مانوس الفاظ ہی سے مشتق ہوں اور ہماری زبان میں آسانی کے ساتھ گھل مل سکتی ہوں۔

ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زبان بھی اس وقت دشواری محسوس کرنے لگتی ہے جب کسی ایسی زبان، ایسے تمدن یا ایسے موضوع سے سابقہ پڑے جس سے سابق میں تعلق نہ رہا ہو۔ انگریزی یا عربی سے اردو میں ترجمہ اب کافی آسان ہے اور بہت سے لوگوں کو تیزی کی خاطر محض املا نویس کافی نہیں ہوتا، مختصر نویس کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اردو کے بہت اچھے ماہر عرب یا انگریز کو اردو سے ترجمہ مقابلۃً بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان کی زبانوں میں اردو سے کم ترجمے ہوئے ہیں۔

جس شخص نے فن ترجمہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہو کہ مثلاً عربی میں کس طرح یونانی، سریانی، پہلوی، سنسکرت وغیرہ سے، لاطینی میں عربی وغیرہ سے، انگریزی میں لاطینی وغیرہ سے ترجمے ہوئے تو وہ فوراً محسوس کرلیتا ہے کہ ترجمی ادب کے ابتدائی، درمیانی اور آخری دور میں اس سے کہیں زیادہ فرق ہوتا ہے جتنا خود زبان میں اس عرصے میں۔ عربی

میں ہزار ایک سال پہلے جو اولین ترجمے ہوئے تھے، ان میں سے کچھ اب بھی محفوظ ہیں۔ ان کا سمجھنا کسی عرب کے لیے بھی اس سے کہیں زیادہ دشوار ثابت ہوا ہے، جتنا ہمارے دارالترجمے کے اولین ترجموں کا ہمارے لیے۔ قابل سے قابل اور فن داں سے فن داں مترجم ملنے کے باوجود، عربی کو جو دشواریاں رہیں وہ ہمارے لیے سبق آموز ہیں۔

مثلاً: ہم آج کتنا پن، کیا پن، اگر پن، وہ پن، میں پن وغیرہ کے حاصل مصدر سنیں تو فوراً رد کردیں گے لیکن کمیت، کیفیت، لمیت، انیت، ہویت، انانیت بھی عربی کے لیے ایک زمانے میں ویسے ہی نامانوس اور ناگوار تھے۔

دوسرے: بعض نئے مفہوم یا علموں کے نام شروع میں بعینہ اپنا لیے گئے مثلاً اثولوجیا، ماتماطیقا۔ پھر یہی الفاظ دوسرے دور میں "ربوبیت" اور "تعلیم" بنے۔ اور آخر میں یہی "الٰہیات" اور "ریاضی" بنکر اب تک چلے آرہے ہیں۔

یا: جغرافیا کی جگہ صورۃ الارض اور صور الاقالیم، اور موسیقی کی جگہ غناء کہنے کی کوشش کی گئی مگر یہ سخت جان اور بے حیا نکلے۔

اور: جنس، قانون، ہندسہ، فلسفہ وغیرہ کو بدلنے کی شاید کبھی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ تریاق، اساطیر وغیرہ تو غالباً قبل اسلام کا حق قدامت جتاتے اور "ملکی" بنے رہے؛ اور بعد کے عرب ماہرین اشتقاقیات ان کو خالص عربی مادوں سے بتانے لگے۔

بہرحال ابتدائی دور کے بغیر درمیانی دور آنہیں سکتا اور نہ ان دونوں بنیادی دوروں کے گزرنے کے بغیر آخری دور زریں کے آنے کے عجلت پسند خواہشمند، حقایق اور حکمتات کی دنیا میں نظر آتے ہیں۔

ہمارے دارالترجمے کی گراں خرچی پہ بعض بھولے مخلص فوراً انگلیاں اٹھانے لگتے ہیں۔ لیکن وہ بھولتے ہیں کہ اردو سے کہیں زیادہ فطری صلاحیتیں رکھنے والی عربی زبان کو عصری علمی زبان اور ترجموں کی

اہل بنانے کے لیے عباسی بغداد کے دار الحکمت، اور فاطمی مصر کے دار العلم، اور اُموی قرطبہ کے دار الکتب نے جو رقمیں صرف کیں، ان کے اعداد پر اب ہم یقین بھی نہیں کریں گے کہ اچھی کتابوں پر ان کے ہموزن سونا بھی معاوضہ ملتا رہا۔ اگر ہم نے اپنے دَور اول میں کبھی کبھی ہموزن چاندی دیدی تو کونسی بڑی علم نوازی اور مقصد پروری کرلی! نہ تو یہ صرفہ ضایع شدہ اور اسراف سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر ہماری رفتار ترقی اتنی تیز ہو سکتی تھی۔ خوش قسمتی تھی کہ جلالت مآب حضرت سلطان العلوم کے عثمانی امن وفراوانی، اور حاتمی داد و دہش کے دور میں ہمارے ہاں اس کام کا آغاز ہوا، ورنہ ہم اپنے ہموطن پیشروؤں سے آگے کب نکل جاتے سب ہی سے پیچھے رہتے۔

ترجموں کی مدامی ضرورت

یوں تو کسی زبان کے علمی بچپن یا کسی بالکل نئے فن کی تحصیل کے وقت تمام اہم اور بنیادی کتابوں کے ترجمے کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے۔ لیکن چند ترجموں کی ضرورت بہر حال ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ایجاد اور کمال کسی ایک قوم کی میراث نہیں اور جب تک دنیا میں اختلاف السنہ باقی ہے، اپنی زبان اور اپنے تمدن کو عصری رکھنے کے لیے دنیا کی ہر زبان کی اچھی کتابوں کا ترجمہ ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔ بڑی بدقسمتی ہوگی اگر ہمارا دار الترجمہ ابھی دَور اول ہی کے اختتام پر تچھنت بن جائے اور مختلف علوم کا تا حال کیا ہوا ترجمہ ہی منتہائے علم قرار دے لے۔ ابھی تو قدیم امہات الکتب ہی ختم نہیں ہوئیں، روزمرہ نکلنے والی مشرقی و مغربی السنہ کی قابل ترجمہ کتابیں ہر سال سیکڑوں ہی ہوتی ہیں۔

مولف کے حالات

زیر ترجمہ کتاب کا مولف آرنسٹ نیس ہے جو بلجیم کی جامعہ بروسیل کا پروفیسر تھا۔ جنگ مانع ہے کہ اس کے مزید حالات معلوم کیے جائیں۔ بہر حال اتنا ضرور معلوم ہے کہ علاوہ قانونی تدریس کے، اسے عدل گستری کا عملی تجربہ بھی رہا ہے اور

وہ ایک بڑے رتبے کا حاکم عدالت رہ چکا ہے۔ قانون بین الممالک کی بین الاقوامی انجمن کا سرگرم رکن ہونے کے علاوہ اُس نے درجن کتابیں بھی فرانسیسی میں لکھی ہیں۔ علمی رسالوں کے مضمون اس کے ماسوا ہیں۔

زیر ترجمہ کتاب ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے تک اس کی جو کتابیں چھپی تھیں ان میں سے خود مولف نے حسب ذیل کو اہم قرار دیا ہے:۔

۱۔ پاپائی بلحاظ قانون بین الممالک ——— (اس کا انگریزی ترجمہ پادری پائنن. بی لیوں نے ۱۸۷۹ء میں لندن میں شایع کیا۔ فرانسیسی اصل کی تاریخ معلوم نہیں)۔

۲۔ بحری جنگ ——— مطبوعہ بروسیل ۱۸۸۱ء

۳۔ قانون جنگ اور گروتیوس کے پیشرو ——— م بروسیل ۱۸۸۲ء۔

۴۔ اُونورے بُونے کی تالیف شجرۂ حروب ——— م بروسیل ۱۸۸۳ء

۵۔ سفارت کاری کا آغاز ——— م بروسیل ۱۸۸۴ء

۶۔ اصول قانون بین الممالک (لوریمر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ) ——— م بروسیل ۱۸۸۵ء

۷۔ فرانشوا لُوراں، اس کے حالات اور کارنامے ——— م بروسیل ۱۸۸۷ء۔

۸۔ بنتھام کی بعض غیر مطبوعہ یادداشتیں ——— م بروسیل ۱۸۸۷ء

۹۔ انگلستان کے قانون بین الممالک کی خیالاتی اور تالیفاتی تاریخ ——— م بروسیل ۱۸۸۸ء۔

۱۰۔ توماس کامپانیلا ——— م بروسیل ۱۸۸۹ء

۱۱۔ امرندیوں (امریکا کے اصلی باشندوں) کے حقوق اور اسپینی مولف ——— م بروسیل ۱۸۹۰ء

۱۲ سیاہ غلامی اہل قانون اور اہل عدالت کی نظروں میں ——— م بروسیل ۱۸۹۰ء۔

۱۳- جدید قانون عامہ کے بانی ——— م بروسیل ۱۸۹۰ء

۱۴- قانونِ قدرت کے اصول دو جلدوں میں (لوریمر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ) ——— م پاریس ۱۸۹۰ء

۱۵- فرانس میں اٹھارھویں صدی تک کے سیاسی نظریے اور قانون بین الممالک ——— م پاریس ۱۸۹۱ء

۱۶- برٹش میوزیم کے کاغذاتِ منتھام ——— م بروسیل ۱۸۹۱ء۔

۱۷- انگلستان کے سیاسی نظریے ——— م بروسیل ۱۸۹۲ء۔

۱۸- موجودہ زیر ترجمہ کتاب ——— م بروسیل وپاریس ۱۸۹۴ء

اس کتاب کی کئی خصوصیتیں ہیں۔ ایک تو اپنے موضوع کی مستند اور متداول کتاب ہے جس کا ہر کوئی حوالہ دیتا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر مولف کی وسعتِ قلبی ہے کہ اپنوں کی کوتاہیاں اور غیروں کی خوبیاں اور احسان ماننے میں اسے ذرا بھی تامل نہیں معلوم ہوتا۔ کم مغربی مولف ہیں جنھوں نے جدید قانون بین الممالک پر کثیر مشرقی اثرات کو اس صراحت سے تسلیم کیا، سراہا، اور ثابت کیا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ مشرقی ادبیات سے براہ راست استفادہ نہ کرسکنے اور ترجموں میں سے بھی چند مشہور ہی پر اکتفا کرنے کے باعث بعض جگہ واقعاتی غلطیاں ہیں تو بعض جگہ بچپن کی اور خانگی سنی سنائی باتوں کو حقائق سمجھ کر پیش کردیا گیا ہے ——— ان کی طرف حسب ضرورت مترجم نے حاشیے میں توجہ دلادی ہے ——— لیکن ان غلط واقعات سے اس نے مشرق کی بعض چیزوں پر اعتراض کیا ہے تو یہ تعصب اور عناد سے کہیں زیادہ ناطرفدار تماشبین کے موقتی جذبات کا فوری ردعمل کہا جاسکتا ہے۔

یہ بھی عرض کرنا ہے کہ اصل کتاب میں کوئی اشاریہ نہیں ہے اور یہ غیر دلچسپ گر ضروری اور ساتھ ہی	آخر میں

کٹھن کام بھی مترجم ہی کو کرنا ہے۔

میں ان ناظروں کا پیشگی شکریہ عرض کرتا ہوں جو میری کسی سہو اور خامی سے واقف ہوں تو اس سے اپنے احباب ہی کو نہیں مجھے بھی متنبہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ یہ مجھ پر ہی نہیں علم پر بھی احسان ہوگا۔ فقط

محمد حمید اللہ

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

۱۵ محرم الحرام سنہ ۱۳۶۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

"مملکتوں کے قانون" یا اگر جرمی بنتھم کی رائج کردہ اصطلاح کو استعمال کریں تو "قانونِ بین الممالک" کے متعلق یہ سوال ہوتا رہا ہے کہ آیا وہ واقعی کوئی قانون ہے یا نہیں، مگر آج کل اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس مشہور انگریز کے ہم مسلک لوگوں نے قانون کا جو محدود تصور قائم کر لیا تھا، اس کے باعث اس سوال کا جواب نفی میں دینے کے لیے قابل لحاظ وجہ پیدا ہو گئی تھی۔ انگریزی اصطلاح "لا" (قانون) کے مفہوم میں ان لوگوں نے تین بنیادی تصورات ضروری خیال کیے تھے: اولاً اس کا ایک حکم کی حیثیت رکھنا، دوسرے اس کی عدم تعمیل پر تہدید و تدارک کا مہیا کرنا، اور تیسرے ایک ایسے اقتدار کا پایا جانا جو اس قانون کے نفاذ کا حکم دے سکے۔ ان لوگوں نے ایک ایسے اقتدار کی ضرورت خیال کی جو سزا دے سکے۔ ان کے خیال میں اس سزا کا اطلاق ایک ناگزیر تدارک ہے چونکہ قانون بین الممالک میں ان کو نہ تو کوئی واقعی حکم دینے والی قوت نظر آئی (کیونکہ مملکتیں خود مختار تصور کی جاتی ہیں) اور نہ ہی کوئی واقعی تدارک (کیونکہ ان کی رائے میں صرف عالم انسانی کی رائے عامہ ہی بالآخر تعریف یا ملامت کے ذریعے سے مملکتوں کے کسی فعل کو پسند یا ناپسند کرتی ہے اور بس)۔

بے شبہ ابھی تک قانون بین الممالک کے لیے کوئی ایسا اقتدار

نہیں پایا جاتا جو اس کے قواعد بنانے پر مامور سمجھا جائے لیکن ہم اس چیز کو نہ بھلائیں کہ عام قانون ملک بھی بہت دنوں تک اس انتظار میں رہا کہ کوئی قانون ساز آئے اور اس کو ایک معین طور سے بیان کرے۔ تدوین کا زمانہ رواج کے بعد آتا ہے اور رواج شیوخ قبیلہ کے عدالتی فیصلوں کا جانشین ہے اور کچھ نہیں۔

بے شبہہ قانون بین الممالک کے لیے ابھی تک کوئی عدالتی اقتدار مستحکم طور سے قائم نہیں ہوا ہے لیکن خود عام قانون ملک کے سلسلے میں اگر کوئی ایسا اقتدار پایا جاتا ہے جو قانون کے نفاذ پر مامور ہے تو یہ بھی ایک استثنائی صورت ہی ہے نہ کہ کوئی ضروری کلیہ۔

اصل میں قانون کا وجود سزا کے اطلاق سے بالکل بے نیاز ہے۔ II

قانون بین الممالک کے اس نازک نکتے کو غالباً جرمی بنتھم سے زیادہ کسی اور نے احتیاط کے ساتھ نہیں واضح کیا ہے۔ اپنی قیمتی زندگی کے آخری سالوں میں اس نے اس موضوع پر بہت سے صفحے سیاہ کیے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ قانون بین الممالک کے لیے اس بات کی ضرورت نہیں کہ کوئی قوت حاکمہ پائی جائے، چاہے وہ مملکتوں کے نمایندوں کی کانفرنس ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح کی کانفرنس کے انعقاد کی اس نے تجویز پیش کی تھی، مگر اس کو اس نے محض یہ فریضہ سپرد کیا تھا کہ مقدمات کا فیصلہ کرے، (نفاذ سے اس کو کوئی تعلق نہ ہو)۔ ہم مکرر یہ چیز بیان کرتے ہیں کہ قانون بین الممالک کو ایک قانونی حیثیت حاصل ہے۔ وہ محض مملکتوں کے ایک اخلاق کا نام ہرگز نہیں ہے۔

یہ قانون روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔ بہت دنوں تک اس نے اپنے آپ کو قواعد جنگ تک محدود رکھا جنھوں نے حقیقت میں اس کے تخم کا کام دیا۔ اس کے بعد سفارتی نظام کا زمانہ آتا ہے۔ جنگ کو قواعد وضوابط کا پابند بنانے کے لیے ابتداءً عنفی طریقہ استعمال کیا گیا اور مختلف چیزوں کی ممانعتیں صادر کی جانے لگیں۔ چنانچہ ظالمانہ برتاو کو نادرست

ٹھیرایا گیا۔ پھر ایسے طریقوں کے استعمال کو باضابطہ طور سے بُرا قرار دیا گیا۔ مستقل سفیروں کے تقرر نے قانون بین الممالک کے لیے ایک تعمیری دور کا آغاز کیا۔ ہمارے زمانے میں بہت سے ادارے وجود میں آ چکے اور ترقی کر رہے ہیں، جن سے اس کا پتا چلتا ہے کہ بین الممالک انتظام نے کتنی نہ عظیم الشان ترقی کر لی ہے۔

ہر انسانی کام کے دو حصے ہوتے ہیں: ایک تو ہمعصروں کا حصہ اور دوسرے ان لوگوں کا حصہ جو اس ابدی کشمکش میں اس جہان سے گزر چکے ہیں۔ اور کشمکش انسانیت کے لیے ناگزیر ہے۔ قانون بین الممالک کی حد تک بھی یہ بالکل صحیح ہے۔ وہ صرف طبیعت انسانی کی پیداوار ہے۔ انسان ہی اس کو وضع کرتا ہے جس طرح کہ وہ عام قانون ملک گویا جس طرح وہ قانون سیاسی کو معین کرتا ہے۔ رفتار زمانہ سے ایک کے بعد دوسری نسلیں آتی رہیں اور ہر ایک نے اس عظیم الشان کام میں اپنا حصہ لیا اور ہر ایک نے اس مشترکہ خزانے کو معمور کرنے میں ہاتھ بٹایا۔

کیا مثالوں کی ضرورت ہے؟ یہ فینیقیہ تھا جس نے حقیقت میں ہم کو بحری قانون عطا کیا۔ اب تک بھی یونان کا فلسفہ اپنے قوی اثرات ہم پر استعمال کر رہا ہے۔ روما کی سیاسی اور قانونی صلاحیت نے دنیائے جدید کو بھی حیات بخشی، جس طرح کہ قرون متوسطہ کو اس نے زندہ کیا تھا۔ قرون متوسطہ نے بھی اس بارے میں اپنا حصہ لیا ہے۔

قدیم تمدن چھٹی صدی عیسوی میں غائب ہو گیا۔ یورپی قابلیتوں کی پیدائش بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی سے سمجھی جاتی ہے۔ ان دونوں کا درمیانی زمانہ روح انسانی کی روایات کے مطابق اس چیز کے زیر اثر رہا جس کو ہم "عربی علم" کا نام دینے لگے ہیں۔ عیسائیت نے بھی تین صدیوں تک زور و شور سے حکومت کی۔ اس کے بعد وہ نشاۃ ثانیہ وجود میں آیا جس نے مغربی دنیا کا براہ راست قدامت متمدنہ سے اتصال پیدا کر دیا۔

قانون بین الممالک کی تاریخ انسانیت کی پوری تاریخ پر حاوی ہو جائے گی۔

III

چنانچہ ایک فرانسیسی مولف نے حال میں اس کو لامتناہی معقولیت کے ساتھ یوں واضح کیا ہے:۔

"اگر دو جماعتیں ساتھ ساتھ پائی جائیں تو یہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ ان میں ایسے مفادات پیدا ہوں جن کے حل کے لیے قواعد بنانے کی ضرورت پڑے، وہ جنگ کریں گی اور اس کے بعد صلح۔ اور خود بین الممالک ادارے اپنی بین اور نمایاں کمزوری و نزاکت کے باوجود ایسی چیز کی نمایندگی کرتے ہیں جو کم سے کم تبدل پذیر اور زیادہ سے زیادہ منتقل ہو"۔[1]

موجودہ جماعت انسانی جن بڑے عناصر پر مشتمل ہے ان کا اس میں راست یا بالواسطہ حصہ لینا صفحات آیندہ میں بار بار نظر آتا رہے گا بہر حال یہ ایک ایسا دور ہے جس کا مطالعہ دیگر ادوار سے زیادہ ضروری ہے اور یہی وہ دور ہے جس میں ہمارا جدید تمدن پیدا ہوتا نظر آتا ہے۔

قرون متوسطہ کی آخری صدیوں میں قانون بین الممالک کے جو ادارے وجود میں آئے وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اس زمانے کے نظریے بڑی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ لوگوں کو معلوم نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرون متوسطہ اصل میں مباحثوں کا دور ہے۔ چنانچہ پہلی نظر میں ہمیں وہ ایک ایسا زمانہ نظر آئے گا جب طبقتیں غیر متزلزل ضبط کی پابند تھیں یہ بھی نظر آئے گا کہ چند بہت بلند تصورات (مثلاً تصور عیسائیت، پاپائیت اور مقدس رومی شہنشاہیت کا نظریہ، اور جاگیر داری نظام) واقعۃً انسانیت کو گھیرے ہوئے تھے۔[2] ان چیزوں کا زیادہ قریب سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت ایسی نہیں ہے۔ خاصکر جن چیزوں کا قانون بین الممالک سے تعلق ہے ان کی حد تک قرون متوسطہ کے مولفوں نے اکثر ایک قابل ستائش بہادرانہ طبیعت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہم صرف پاپائیت اور

---

[1] موسیو لاکلا فیئیر کی فرانسیسی کتاب "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد اول دیباچہ صفحہ (۱)۔

[2] گے بار کی فرانسیسی کتاب "اطالوی نشاۃ ثانیہ اور فلسفۂ تاریخ" صفحہ (۶)۔

شہنشاہیت کے مسائل کا ذکر نہیں کر رہے ہیں، جن کے اندر خود مختاری اور
کشوری سماج کے اہم امور داخل ہو جاتے ہیں، بلکہ ہمارا اشارہ ان تمام
اقسام کے امور کی طرف ہے جو مملکتوں کے مخاصمانہ یا مسالمانہ تعلقات
کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سوال سے بحث کی جانے لگی کہ
آیا جنگ ایک جائز چیز بھی ہے یا نہیں؟ اور ان اسباب کا، جن کے تحت
ہتیار اُٹھانا درست قرار دیا جا سکتا ہے، اس شدت اور وضاحت سے
اس زمانے میں مطالعہ کیا جاتا تھا کہ اس کے بعد سے اب تک پھر کبھی
نہ ہوا۔ ہمیں معلوم ہے کہ خانگی جنگ اور انتقام دمواخذہ عرصے تک
قانونی ادارے بنے رہے۔ ان کی تک اس زمانے میں تنقید شروع
ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان کی اولاً مخالفت ہونے لگی اور بالآخر ان کو ایسے
اداروں میں شامل کر دیا گیا جو حق اور صداقت سے عاری سمجھے جاتے ہیں۔
غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کے متعلق بھی پر جوش مباحثے ہوتے رہے
اور ان کے متعلق بھی ہمیں ایسے شرافت مآب مفکرین کے خیالات
سنائی دیتے ہیں جو "قبل از وقت پیدا ہوئے تھے اور جو آیندہ صدیوں
کے لوگ تھے"۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس بات کی ضرورت کا اعلان
کیا تھا کہ رواداری برتی جائے۔ ثالثی اور تحکیم کی حوصلہ افزائی کی گئی
اور ان پر عمل کیا جانے لگا۔ رائے عامہ سے کچھ اتنی اپیل کی جاتی رہی کہ
ہماری انیسویں صدی کے اختتام پر بھی نہیں ہوتی ہے توازن قوت کے
نظریے کو ایک قابل احترام حیثیت عطا ہوئی۔ پندرھویں صدی عیسوی کی
عظیم الشان دریافتوں کے باعث حصول اراضی کے مسائل پیدا ہوئے۔
اور اس کے کچھ ہی بعد سمندری آزادی کا معاملہ۔ اسی پر سب کچھ نہیں
ختم ہو جاتا۔ اگر کچھ لوگ ایسے تھے جو حقایق پسند تھے اور حوادث و واقعات
کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کر کے فیصلہ کرتے تھے تو اسی زمانے میں
کچھ ایسی پر جوش طبیعتیں بھی وجود میں آئیں جو جذبات سے لبریز تھیں
اور ابدی امن کا میٹھا خواب دیکھتی تھیں۔

IV

اگر ہم مختلف قوموں کے کارناموں کا مطالعہ کریں، جن کے متعلق مِشلے نے "انسانیت کے عظیم الشان راز" کی دلچسپ اصطلاح استعمال کی ہے، تو دنیا کی تاریخ ہمیں خوشنما ہی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسی صورت میں وہ اس مقصد کو سب سے زیادہ پورا کرتی ہے جو آرٹراں شوں نے اس سے متعلق کیا ہے۔ اور ایسی صورت میں وہ سیاست اور اخلاق کی سب سے زیادہ جیتی جاگتی تصویر نظر آسکتی ہے۔ قانون بین الممالک کے آغاز کا مطالعہ اگر اس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو وہ بہت سبق آموز ہے: ہر قوم کے پیش نظر ایک کام رہا۔ ہر صدی کا ایک مقصد رہا۔ اٹلی نے مفنن اور سیاست کار پیدا کیے۔ اسپین نے اپنے مشہور علماء اور شارل کیں (پانچویں چارلس) کی طاقتور سلطنت کے عہدہ دار پیدا کیے۔ فرانس نے اَونورے بونے اور کرسٹین ڈپیزان جیسے عہد آفریں تحریکوں کے بانی پیدا کیے۔ انگلستان نے اپنے حامیان بادشاہت پیدا کیے اور انہیں لوگوں نے حقیقت میں جدید قانون بین الممالک کی بنیاد ڈالی۔ اسی لیے ہمیں اس علم کے آغاز کو گروتیوس کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ بے شبہہ اس کی لاطینی کتاب "قواعد جنگ و صلح" تاریخ میں عہد آفریں حیثیت رکھتی ہے۔ جس زمانے میں دنیا میں صرف "قوت" کا بول بالا تھا، تو ہالینڈ کے اس مشہور مولف نے مملکتوں کو وہ قواعد یاد دلائے جن پر ان کے تعلقات مبنی ہونے چاہئیں۔ لیکن گروتیوس سے پہلے بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی جاتی رہی تھی جو بے شبہہ اکثر صورتوں میں جستہ جستہ امور کے متعلق تھی لیکن وہ بہر حال ایک ناقابل انکار صلاحیت، ایک ناقابل تردید زور، اور قریب قریب ہمیشہ انسانیت کے ساتھ ایک عشق رکھتے ہوئے تھی، جو ان کے بعد والوں میں بھی ہمیں کبھی کبھی غائب نظر آتی ہے۔

بہر طور قانون بین الممالک کی تاریخ ایک تسلی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ بڑی بڑی شخصیتوں نے رد بیچارے یاس انگیز نظریے" کی مخالفت میں،

اپنے قطعی ایقان کے ذریعے سے اس کو مکمل بنانے میں حصہ لیا ہے۔ ارتقا
و ترقی پر ایقان، ایک استحکام اور قوت حاصل کر جاتا ہے جب ہم
V قانون بین الممالک کا مطالعہ کرتے ہیں اور سب سے زیادہ یہیں ہم کو
یہ چیز نظر آتی ہے کہ انسانیت کی بہتری کے لیے بے پناہ امنگیں جلوہ گر ہیں۔
جھگڑے سخت ہیں، دراز ہیں، مگر ان کا نتیجہ کامیابی ہی ہوتا ہے۔ اور ہر دفعہ
یہ کامیابی عقل اور مشیت انسانی کے باعث ہی حاصل ہوئی ہے۔

باب اول

قرونِ متوسطہ کا تصور اور علمِ قانونِ بین الممالک

قانون بین الممالک کا کوئی ٹھیک تصور قرونِ متوسط کے مولفوں کی تحریروں میں سچ پوچھیے تو نہیں ملتا۔ ان لوگوں نے ایک گرم جوشی کے ساتھ قانونِ روما کا نئے سرے سے مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے کلیسائی قانون کا علم ایجاد کیا۔ انھوں نے قانون رواجی کی عمارت تعمیر کی، انھوں نے خاص کر ارسطو کے اثرات کے تحت قانونِ سیاسی کے مسائل کی چھان بین شروع کی۔ لیکن قانونِ بین الممالک، بحیثیت ایک کل کے، ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔ بے شبہہ وہ قانونِ قدرت کے اندر گھلا ملا ضرور ایک حد تک پایا جاتا تھا، لیکن اس طور سے کہ وہ بھی اور قانونِ قدرت بھی، ہر دو قانونِ کلیسائی اور قانونِ روما کے اندر مخلوط ہو گئے تھے۔

رفتہ رفتہ قانونِ قدرت نے اپنے کو الگ کیا۔ چنانچہ لوگ اس کا مطالعہ ڈرتے ڈرتے یوستی نیان (جسٹی نین) کی تالیفوں کے کسی نہ کسی باب کے موقع پر کرنے لگے تھے یا اس وقت جب کہ پوپوں کے کسی نہ کسی احکام و تحریرات

میں مندرجہ قواعد کی بحث ہو۔ رفتہ رفتہ قانون جنگ بھی انھیں ابواب اور
انھیں قواعد کے سلسلے میں موضوع بحث بننے لگا۔ آہستہ آہستہ قانون سفارت
کی بھی تشریح اور ترقی ہونے لگی۔ قانون جنگ یا قانون سفارت کے مطالعے
کے سلسلے میں جو بعض مسائل پیدا ہوئے تھے انھوں نے وسعت بھی اختیار کی۔
اس بارے میں عیسائیت کے خیالات کی تائید کی جاتی ہے، مثال کے طور پر
غیر مذہب والوں کے حقوق کا سوال۔ بے شبہہ ان تمام مباحث کے سلسلے
میں ابھی تک بحیثیت مجموعی ایک فن کی حیثیت نہیں پیدا ہوئی تھی۔
لیکن ایک واقعہ متحقق ہے کہ علم قانون کی دونوں نئی شاخوں یعنی
قانون قدرت اور قانون بین الممالک ہر دو کے آغاز اور پیدائش
کے لیے ہمیں انھیں کے ہاں تلاش کی ضرورت ہوگی۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ قانون قدرت کا اثر بہت دنوں تک
قانون بین الممالک پر چھایا رہا۔ ایک سے زیادہ خود مختار ملکتوں کا
وقت واحد میں پایا جانا حقیقت میں صرف اسی متبادل امر کو پیش کرتا ہے کہ
لوگ یہ تصور کریں کہ یہ ملکتیں کسی بھی قانون کی پابند نہیں ہیں، اور یہ کہ
ان کے متعلق یہ بھی خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ قانون قدرت کا موضوع ہیں۔
بہرحال اس چیز کو ہم اچھی طرح ذہن نشین کریں کہ قدرتی مساوات اور ایک
قدرتی حالت کے پائے جانے کے نظریے تاریخ انسانی میں صحت بخش
کام انجام دے چکے ہیں کیونکہ تمام قدیم برائیوں کو انھیں کے نام سے برا
ٹھیرایا جاسکا، ان پر حملہ کیا جاسکا، اور ان کو تباہ کیا جاسکا۔

بہت دنوں تک قانون بین الممالک کی صحیح صحیح تعریف نہیں کی جاسکی۔
اُلپئین نے قانون کی جو مشہور تعریف کی تھی اسے عام طور سے قبول
کیا جاتا ہے کہ: قانون یا تو قانون قدرت ہوگا یا قانون اقوام یا قانون ملک۔
قانون قدرت، جاندار مخلوقات کا قانون ہے۔ قانون اقوام کی اصطلاح
مبہم اور غیر معین ہے۔ قرون متوسطہ کے مولف اس قانون اقوام کے
تبدیل ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ وہ اس کو نہایت

احتیاط کے ساتھ قانون قدرت سے ممتاز کرتے ہیں، بلکہ وہ ان کی باہمی مماثل چیزوں کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ قانون بین الممالک کو قانون کی کس قسم میں داخل کیا جائے جب کہ اس سے اس کا جدید تصور مراد لیا جائے یعنی "قوموں یا مملکتوں کے مابین چلنے والا قانون" — یہ اصطلاح اصل میں فرانسواد سے فی توریا نے استعمال کی تھی اور ریشارز زوشہ نے اس کو چرا لیا تھا۔ پادری سیس بیئیر نے "قانون مابین اقوام" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ روما کے چند مولفوں کے ہاں قانون اقوام کی اصطلاح سے وہ چیزیں مراد ہوتی تھیں جو قانون کا موضوع ہوں۔ اور قانون جنگ، قواعد جنگ، قانون جنگ و صلح، قواعد جنگ و قانون حکومت، قواعد جنگ و قوانین فتح کی اصطلاحوں سے وہ چیزیں مراد ہوتی تھیں جو قانون کی غرض وغایت ہوں افلاطون اور ارسطو یونانی سرزمین تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے برخلاف سسیرو نے تسلیم کیا تھا کہ کسی جائز جنگ میں قانون فیتیالی اور دیگر بہت سے قوانین رومیوں اور ان کے دشمنوں دونوں کے لیے مشترک تھے۔ لیکن یہ تصور قرون متوسطہ کے مولفین کی اکثریت کے ہاں مدغم ہو کر رہ گیا تھا۔

یہ ایک عجیب چیز ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب کہ قانون بین الممالک بنا ہی نہ تھا اس کی ایک ایسی تعریف — شاید تعریف کی جگہ تشریح کہنا زیادہ صحیح ہوگا — وجود میں آگئی تھی جو جدید تصور سے بہت قریب ہے چنانچہ اشبیلیہ کے پادری اِسی ڈور نے (جو ساتویں صدی عیسوی کے آغاز کا مولف تھا) ایک کتاب لاطینی میں ایتیمولوگیا (فقہ اللغہ) لکھی تھی جو اس زمانے کے جملہ علوم کا خلاصہ اور ایک واقعی دائرۃ المعارف ہے۔ اس میں اس نے قانون کو قانون قدرت، قانون ملک اور قانون اقوام میں تقسیم کیا ہے، اور اس کی رائے میں قانون قدرت جملہ اقوام کا مشترکہ قانون ہے اور اس کی ہر جگہ تعمیل ہوتی ہے مگر اس لیے نہیں کہ وہ کوئی

9

قانون ہو بلکہ قدرتی انتاد ہی کی وجہ سے[1]۔ وہ اس کے تحت نکاح، نسل اور بچوں کی تعلیم و تربیت کو داخل کرتا ہے۔ قانونِ اقوام اس کی رائے میں کم و بیش اس چیز سے مشابہ ہے جسے ہم قانونِ بین الممالک کہتے ہیں[2]۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس تقسیم کے علاوہ ایک قانونِ فوج بھی تسلیم کرتا ہے جس کی تعریف[3] کسی قانونِ جنگ کی کتاب کے ابواب کے عنوانات سے مشابہ ہے۔ جو چیز وہاں قابلِ ملاحظہ ہے وہ یہ ہے کہ اشبیلیہ کے اِسی دور نے جو آخری چیزیں بیان کی ہیں وہ حقیقت میں اُلپیئن ہی سے ماخوذ ہیں جس نے اپنی کتاب "احکام" کے حصۂ اول میں قانونِ فوج کا قانونِ اقوام ہی کے ساتھ ذکر کیا تھا اور جس نے قانونِ اقوام کی اصطلاح کبھی تو ایک وسیع معنوں میں اور کبھی محدود معنوں میں استعمال کی تھی[4]۔

---

[1]۔ (لاطینی میں): وہ جملہ اقوام کا مشترکہ قانون ہے۔ اس کی تعمیل قدرتی انتاد کے باعث ہوتی ہے، کسی کے قانون بنانے کے باعث نہیں"، فقہ اللغۃ، کتاب ۵، باب ۴ تا ۷۔

[2]۔ (لاطینی میں): "قانونِ اقوام کا تعلق کسی جگہ پر قبضہ کرنے، عمارت بنانے، ساز و سامانِ جنگ، جنگ، قیدیوں، غلاموں، دشمن کی گرفت سے بازیابی، حلیفی، صلح، عہدنامہ یا عارضی صلح، سفیروں پر دست درازی نہ کرنے کی پابندی اور ناجنسوں سے نکاح کی ممانعت سے ہے"۔

[3]۔ (لاطینی میں): "قانونِ فوجی کا تعلق جنگ کرنے کے رواجات و مراسم، حلیفی قائم کرنے کے معاہدے، مقابلے کے لیے جانے یا جنگ پر مامور ہونے والوں کو نشانِ امتیاز عطا کرنے سے ہے۔ نیز اس نشان دہی کو قبول کرنے، جگہ چھوڑ دینے پر سپاہیوں کو تعزیر کرنے، تنخواہ مقرر کرنے، رتبوں کے مدارج، اعلیٰ ترین اعزاز مثلاً تاج یا مالا عطا کرنے، مالِ غنیمت کا فیصلہ کرنے اور اشخاص کی نوعیت اور جانفشانی کے لحاظ سے تقسیم کرنے اور حکمران کے حصے سے بھی"۔

[4]۔ ڈِرکسن کی جرمن کتاب "رومی تاریخ قانون اور علوم قدیمہ کے ماخذوں کی تنقید و تشریح کے لیے دستیاب شدہ تحریریں" جلد (۱) صفحہ ۱۹۵ — ری ثیبے کی فرانسیسی کتاب "گروتیوس سے پہلے کے

اُلپئین کی تعریف کا شبیلیہ کے اسی دَور کی تالیف میں آجانا خود ایک
قابل ذکر امر ہے۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک چیز قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ
یہ تعریفیں قرون متوسطہ میں، وہ انتہائی تقدس حاصل کر چکی تھیں جو ان
کے لیے اس زمانے میں ممکن تھا۔ یعنی یہ تعریفیں فقہ اللغہ سے لے کر گراتیان
کی لاطینی کتاب "پوپوں کے احکام کا مجموعہ" میں منتقل ہو گئی تھیں۔

گراتیان کی یہ کتاب جیسی کچھ تھی لوگ اس سے واقف ہیں۔ بارھویں صدی عیسوی
کے نصف اول میں قانون کلیسائی کے تحریری عناصر میں جو لاتعداد متضاد
امور نظر آتے تھے، ان کے متعلق گراتیان نے (جو خیال کیا جاتا ہے کہ بولونیا
میں سینٹ فیلکس کے راہب گھر میں پروفیسر تھا)، اس بات کی کوشش کی کہ
ایک ایسا مجموعہ تیار کرے جس سے تمام تضاد اور اختلاف دور ہو جائیں۔
یہ محض خانگی کوشش تھی۔ مولف کو کوئی سرکاری حیثیت حاصل نہ تھی۔ مگر
جلدی ہی کتاب کو ایک عظیم الشان اہمیت حاصل ہو گئی۔ گراتیان نے
اپنی کتاب کو لاطینی میں "مجموعۂ قوانین متضادہ" سے موسوم کیا تھا مگر
بعد میں لوگ اس کو "احکام" کے نام سے یاد کرنے لگے اور اس کا نہایت گہرا
مطالعہ کیا جانے لگا۔ یہ کتاب نصاب میں شامل کی گئی۔ اس کے حاشیہ نگار
اور شرح نویس پیدا ہو گئے۔ لوگ عرصے تک یقین کرتے رہے کہ پوپ
تیسرے اِیوجین نے اس کتاب کی توثیق کر دی تھی۔ یہ واقعہ کہ مختلف
پوپ اس قصے کا ذکر کرتے رہے اور اس کو سچا سمجھتے رہے، اس بات کا
کافی ثبوت ہے کہ اس کتاب کو کتنا تقدس نہ حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس
زمانے میں اس کتاب کا نام "سردار اور آقا گراتیان کے احکام زرین"
رائج تھا۔

جب یہ تعریفیں گراتیان کی کتاب "احکام" میں داخل ہو گئیں، تو
پھر وہ قرون متوسط کے نصف دوم میں جاری و ساری رہیں اور ان کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ادبیات قانون بین الممالک پر یادداشت"

متعدد تشریحیں ہوتی رہیں۔ اور خود عہد جدید کے آغاز کے وقت مختلف مولفوں نے جو معقولیت پسند اصطلاح استعمال کی وہ افادے میں ان سے کچھ بھی بڑھی ہوئی نہ تھی۔

خیالات کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے چند واقعات خاصے دلچسپ ہیں۔ "سات ارکان" نامی اسپینی کتاب ۱۲۶۵ء میں مکمل ہوئی۔ یہ ایک اہم قانون سازانہ یادگار ہے۔ قابل قانون دانوں مثلاً ژاک روینر فرنان مارتی نیز اور زولدان نے قسطلیہ کے بادشاہ دسویں الفونسو کو اس بات میں مدد دی تھی کہ وہ اپنے کام کو مکمل کرے۔ ان کے پیش نظر وہ تعریفیں بھی تھیں جو قانون روما کی ڈائجسٹ میں بیان ہوئی ہیں اور وہ تعریفیں بھی جو اشبیلیہ کے اسی ذور نے اپنی لاطینی فقہ اللغہ میں دی ہیں۔ مگر انھوں نے اول الذکر ہی کو نقل کیا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک قانون قدرت جملہ جاندار مخلوقات کے قانون کا نام ہے اور قانون اقوام جملہ انسانوں کے قانون عمومی کا نام۔ اس کے برخلاف اسی زمانے میں ایک ڈومی نیکن پادری نے قانون بین الممالک کی تشریح اشبیلیہ کے اسی ذور سے اخذ کی۔ اس کا نام ونیس سان ڈبوئے ہے۔ اس نے "بڑا آئینہ" نامی ایک وسیع دائرۃ المعارف لاطینی میں تالیف کی۔ اس نے تین اقسام بیان کیے: قدرتی ملاحظات، عقائدی ملاحظات، اور تاریخی ملاحظات۔ برا کٹن کے ہنری نے "انگلستان کے قوانین اور رواجات" نامی لاطینی کتاب ۱۲۵۶ء تا ۱۲۵۹ء کے مابین تالیف کی۔ یہ آزون کی کتاب "خلاصہ" اور یوستی نیان کے "احکام" پر اپنی رائے مبنی کر کے قانون بین الممالک کی یوں تعریف کرتا ہے کہ: وہ قانون جسے قومیں (مملکتیں) برتتی ہیں اور جو قانون قدرت سے ماخوذ ہے۔

اس موضوع کے پورے مواد کے متعلق جو عہد لے سے تصورات تھے وہ بظاہر بعد کی دو اور صدیوں تک کافی ہی خیال کیے جاتے رہے۔ اور نئے مولفوں کو ان میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ البتہ

اس زمانے میں چند خاص ابواب کے متعلق خصوصی دلچسپی لی گئی، مثلاً قانون جنگ اور اس کے مختلف ادارے، اور قانون سفارت۔ سولھویں صدی عیسوی میں پراٹسٹنٹ مولف جن میں اولدن ڈورپ سب کا سرکردہ تھا، قانون قدرت کی جانچ کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکے کہ قانون بین الممالک کیا ہے[1]۔ یہ ایک اسپینی تھا جس کی قسمت میں اس قانون کی تعریف لکھی تھی۔

فرانسوا دے فیتوریا کہتا ہے کہ "قانون بین الممالک وہ قانون ہے جسے فطرتی عقل نے تمام قوموں کے مابین قائم کیا ہے" — (یہی الفاظ مکرر اصل لاطینی میں) — اس کے نظام میں یہ قانون ایک واقعی قانون ہے جو معاشرہ پسندی کی قابلیت پر مبنی ہے۔ کیونکہ ایک قدرتی معاشرہ پایا جاتا ہے جس میں باہمی تعلقات ہوتے ہیں، باہمی میل جول ہوتا ہے اور قوموں کے مابین ایک ربط پایا جاتا ہے۔ ہر قوم کو کسی دوسری قوم سے تعلقات قائم کرنے کا اتنا حق ہوتا ہے کہ اگر اس حق کے استعمال سے روک دیا جائے تو جنگ درست ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں فرانسوا دے فی توریا نے صاف اور واضح طور سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ مملکتیں ایک دوسرے کی محتاج ہوتی ہیں، ان کے حقوق اور ان کے فرائض باہم مساوی طور سے پائے جاتے ہیں۔ یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اصل میں یہ معلوم کرتا ہے کہ آیا قانون بین الممالک میں کوئی قانونی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا وہ محض کوئی بین الممالک اخلاق یا مدارات کا نام ہے۔ اس سوال کا جواب دینا، جیسا کہ جامعہ سالامانکا کے اس پروفیسر نے دیا، اصل میں اس بحث کا پیشگی ہی فیصلہ کر دینا تھا، جس نے بعد میں صدیوں تک ماہرین کو مشغول رکھا[2]۔

---

[1] فون کالٹن بورن کی جرمن کتاب "ہوگو گروتیوس کے پیشرو قانون قدرت و قانون اقوام کے نیز دور اصلاح کی سیاسیات کے متعلق" صفحہ ۲۳۳۔

[2] زوش نے قانون مابین اقوام کی اصطلاح استعمال کی ہے اور سب لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ

جنتی لیس، ہیں اگرچہ دیگر قابل لحاظ خوبیاں پائی جاتی ہیں لیکن خاص اس بارے میں اس کے ہاں وضاحت اور تعیّن نہیں پایا جاتا۔ اس کی رائے میں قانون بین الممالک قوموں کے ایک سمجھوتے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ سمجھوتہ خاص کر طویل رواج کے ذریعے سے معلوم ہو سکتا ہے۔

فرانشو اشوا ریتس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے قوموں پر قانونی پابندی عائد کرنے والے قواعد کے وجود سے متعلق نہایت معین خیالات ظاہر کئے تھے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "نوع انسانی اگرچہ مختلف قوموں اور بادشاہتوں میں بٹی ہوئی ہے لیکن پھر بھی اس میں بہت کچھ ایک اتحاد پایا جاتا ہے۔ اور یہ اتحاد نہ صرف معینہ اور مخصوص امور میں ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ سیاسی اور اخلاقی اتحاد ہے۔ اس اتحاد کا پتا باہمی محبت اور ہمدردی کے قدرتی احساس کے ذریعے سے چلتا ہے۔ اور یہ احساس اپنے آپ کو سب تک وسیع کر لیتا ہے حتیٰ کہ اجنبیوں تک بھی، خواہ وہ کسی قوم کے کیوں نہ ہوں۔ ہر مملکت خواہ وہ جمہوریت ہو یا بادشاہت، اپنی حد تک مکمل ہوتی ہے۔ اور وہ اس بڑے جسد کا بہرحال ایک عضو ہوتی ہے جس پر نوع انسانی مشتمل ہے کبھی کوئی مملکت اپنے آپ اتنی بے نیاز نہیں ہو سکتی کہ اسے کسی باہمی امداد، کسی میل جول، کسی مفاد یا ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آپس کے ربط ضبط کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اس لیے مملکتوں کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک ایسا قانون پایا جائے جو اس طرح کے

12

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اصطلاح اسی کی ایجاد ہے مگر حقیقت میں اس نے یہ اصطلاح فرانشوا دے فی توریا سے مستعار لی ہے اور اگرچہ وہ تھیتوریا کی لاطینی کتاب "دینیاتی مباحث" کو نقل کرتا ہے مگر اس غرض سے نہیں کہ اس اصطلاح کی ایجاد کے لیے اس کا شکریہ ادا کرے، بلکہ شہنشاہ کے اس ادعا کی تردید کے لیے کہ وہ بادشاہوں اور حکمرانوں کا سردار ہے۔

باہمی مواصلات اور معاشرت میں ان کی رہنمائی اور ان کی ہدایت کرے۔ بے شبہ اس نقطۂ نظر سے فطرتی عقل بہت کچھ کام آسکتی ہے، لیکن یہ فطرتی عقل کافی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ تمام ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ اسی لیے خصوصی قوانین، رسم و رواج کے ذریعے سے وجود میں آئے ہیں[1]" (دیکھئے سوارِیتس کی لاطینی کتاب "کتاب قوانین و خدائے مقنن"، حصہ دوم باب ۱۹ فصل ۹)۔

---

[1] یہ عبارت اصل لاطینی میں۔

باب دوم

پاپائی اور شہنشاہت

مغربی رومی شہنشاہت پر مہلک وار ہو چکا تھا، حتیٰ کہ وحشی آگے بڑھنے لگے اور اپنی سلطنتیں قائم کرنے لگے تھے اور جو کچھ حصہ رومی سلطنت کا بچ رہا وہ اٹلی کی حد تک محدود تھا۔ اور اس ملک نے بھی جلدی ہی اپنے کو دشمن کے رحم و کرم پر پایا۔

سنہ ۴۷۶ء میں اوڈواکر کے حکم سے مغربی رومی شہنشاہت کے آخری حکمران رومولوس اوگسٹولس نے سینیٹ میں اپنے استعفے کا اعلان کیا اور مجلس کا ایک وفد مشرقی رومی شہنشاہ زینون کے دربار میں حاضر ہوا، تاکہ اس سے یہ معروضہ کرے کہ اس کے خیال میں اٹلی میں اب مزید علیحدہ شہنشاہوں کا ہونا غیر ضروری ہے کیوں کہ ایک ہی حکمران کی عظمت و جلالت اس بات کے لیے کافی ہے کہ مشرق و مغرب دونوں کی مدافعت کر سکے۔

تین صدیاں گزر گئیں۔ پھر شارلمان نے کوشش کی کہ مغربی

یورپ میں اتحاد قائم کرے۔ جب اس بڑے فرنگی بادشاہ کے جانشینوں کے ہاتھوں یہ کوشش ناکام ہوگئی تو اقتدار اعلیٰ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے یہ ٹکڑے ٹکڑے ہونا قرون متوسطہ کی ایک خصوصیت رہی ہے۔

یونانی تصور مملکت، جسے رومیوں نے اتنی قوت سے ترقی دی تھی، جرمنوں کو نہ بھایا۔ یہ بے انتہا انفرادیت پسند تھے۔ اس لیے انھیں قدیم نظام حکومت ناگزیر طور سے ناپسند تھا۔ قدیم نظام چونکہ انھیں ذرا بھی نہ بھاتا تھا، اس لیے مرکزی اقتدار کی دھجیاں بکھر جانے سے پھر دوبارہ اتحاد کا قائم ہونا بظاہر ناممکن نظر آنے لگا۔ ہزار بھر الگ الگ سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ ہر طرف جاگیرداری نظام پھیل گیا۔ پشلے کے الفاظ میں "تقسیم کی ذیلی تقسیم ہونے لگی۔ ذرے کو جزء لایتجزی ہونے کی خواہش ہونے لگی ہر کوئی علیحدہ ہونا چاہنے لگا۔ کوئی عقاب کے ساتھ جا بیٹھا، تو کوئی نالے کے پیچھے جا گھسا۔ اور جلدی ہی لوگوں نے بھلا دیا کہ ان کے اپنے تعلقے، ان کی اپنی وادی کے پرے بھی کوئی دنیا بستی ہے۔ اس نئے تصور نے جڑیں پکڑیں اور وہ زمین پر جم گیا"[۱]

پھر بھی اتحاد کی طرف جو رجحان تھا، اس نے اپنے کو ایک دہری شکل میں ظاہر کیا۔ مختلف قوموں میں مرکزی اقتدار قائم ہونے لگا۔ اور ایک وسیع تر سرزمین میں، جسے ہم "بین الممالک تعلقات کی دنیا" کا نام دینا پسند کرتے ہیں، اس بات کے نظریے ترقی کرنے لگے کہ نہایت مقتدر پاپائیت اور نہایت مقتدر شہنشاہت کو وجود میں لایا جائے۔

عالمگیر حکمرانی کا خیال اگر پورا ہو جائے، چاہے شہنشاہ کے ذریعے سے ہو، چاہے پوپ کے ذریعے سے تو قانون بین الممالک کا وجود میں آنا محال ہو جائے۔ یہ خیال چونکہ خالص نظریاتی دنیا تک محدود رہا اس لیے اس نے اکثر ایک صحت بخش اثر ڈالا۔ اور ایک سے زیادہ نیا اصول نیز

14

---

[۱] پشلے کی فرانسیسی "تاریخ فرانس" حصہ دوم، باب سوم۔

بہیمانہ قوت پر انصاف کو ایک سے زیادہ نتیٰ اس بنا پر ممکن ہو سکے کہ روحانی اور دنیادی عالم میں اتحاد کا ایک مفروضہ قائم کیا گیا تھا۔
ایک "بیرونی کلیسا" کا تصور حقیقت میں کوئی عیسائی تصور نہ تھا بلکہ وہ انجیلی اسپرٹ سے ایک روگردانی اور یہودیت کی طرف عود کرنے پر مشتمل تھا۔ حضرت موسیٰ نے مذہبی خدمات انجام دینے والوں کا ایک نظام قائم کر دیا تھا جو بھینٹوں، چڑھاوؤں اور قربانیوں کا اہتمام کرتا اور خدا اور بندے کے مابین واسطے کا کام دیتا۔ حضرت موسیٰ نے مخلوق کا خالق سے براہ راست ربط دوبارہ قائم کر دیا تھا۔ بے شبہہ اس نظام کے مطابق جملہ عیسائی یکساں صفات سے متصف نہیں سمجھے گئے تھے، لیکن جو شخص دینی تعلیم دینے مامور ہوتا وہ تعلیم پانے والوں سے برتر نہیں ہوا کرتا تھا۔ [او خود گم است کرا رہبری کند]۔
"بیرونی اتحاد" کے مقابلے میں "روحانی اتحاد" زیادہ حقیقی اور زیادہ بلند ہوتا ہے۔ مگر اس نے فروغ حاصل نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک عمومیت پسندانہ نظام قائم ہوا اور جماعتوں کی حکمرانی وہی افسر کرتے جو انھیں میں سے ہوتے اور اعلیٰ صلاحیت کے باعث آزادانہ طور پر چنے جاتے۔ بعد میں عمومیت پسندانہ نظام کی جگہ اسقفوں اور پادریوں کے اعیانی نظام نے لے لی۔ اسقف یہ دعویٰ کرنے لگے کہ انھیں اقتدار براہ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر اس بڑے دائرے میں مساوات قائم بھی رہی تو یہ ایک واقعہ ہے کہ روحانی اقتدار کے تصور نے جگہ پکڑ لی تھی۔ اپنی نوبت پر اسقفانہ اعیانیت بھی غائب ہوگئی۔ اور اس زمانے میں دنیا جس سماجی اضمحلال کا شکار تھی، اس میں یہ کمزور نظام پنپنے کے قابل نہ تھا۔ اسی لیے پاپائیت کے لیے اس نے جگہ خالی کر دی۔ اور یورپ ہی میں کلیسا کا اقتدار مرتکز ہوگیا، اور بادشاہت کے

15

لہ۔ نیانڈر کی جرمن "تاریخ مذہب عیسائیت" (صفحہ ۳۹۶) ومابعد۔

روایتی تصورات اور رسم رواج کے باضابطہ نظام پر چھا گیا۔
روما کے اسقفوں نے جلدی ہی دیگر عیسائی جماعتوں کے اسقفوں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ ابتدائی کلیسا ہی میں لوگوں نے دیکھا کہ پوپ وکٹور نے ایشیائے کوچک کے عیسائیوں کو اپنی جماعت سے خارج قرار دیدیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں پوپ اسٹیفن نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس نے افریقہ اور ایشیا کے کلیساؤں پر بپتسمے کے جائز ہونے کے متعلق روما کی روایتیں جبراً عائد کر دی ہیں۔ دوسری صدی عیسوی کے اختتام کے قریب جو تحریک پیدا ہوئی تھی، وہ بھی ان دعووں کی تائید وتقویت کا باعث بنی۔
پادریوں کی صوبہ وار مجالس شوریٰ کے نظام نے اس بارے میں ایک عہد آفریں انقلاب پیدا کیا۔ مجلس شوریٰ کا اجلاس صوبے کے صدر شہر میں ہوتا اور اس شہر کا اسقف یعنی مٹراپولیٹن یا مطران (یا بہ تخت کا پادری) اس کی صدارت کرتا۔ اسی وجہ سے اس کو ایک خصوصی امتیاز حاصل ہو گیا۔ یہ تحریک ترقی ہی حاصل کرتی گئی۔ اس کی تنظیمیں پھیلتی گئیں اور بڑے بڑے علاقوں پر حاوی ہوتی گئیں۔ اس کے باعث ان چند شہروں کو جہاں اسقف ہوتے تھے، ایک امتیاز حاصل ہونے لگا۔ شہر روما کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ اٹلی کا کلیسائی صدر مقام ہے۔ جلدی ہی اس کے ساتھ اسکندریہ اور انطاکیہ نے بھی اس اعزاز میں شرکت حاصل کر لی کہ وہ عیسائیت کے سب سے اہم مرکزوں میں سے ایک ہیں۔ مختلف حالات نے روما کے اقتدار کو بڑھانے میں حصہ لیا۔ اس روایت نے عام طور پر وثوق کا درجہ حاصل کر لیا کہ سینٹ پیٹر وہاں آیا تھا۔ اور اس طرح پورے مغرب میں روما ہی وہ واحد مقام تھا جہاں کی اسقفی ایک حواری نے قائم کی تھی۔ اور اولیت کا جو اعزاز سینٹ پیٹر کو حاصل ہوا تھا، وہ اس کے مزعومہ جانشینوں کو بھی حاصل ہونے لگا۔ سارڈیک میں جو مجلس شوریٰ ہوئی تھی اس نے اس اولیت کو

تقدس دیدیا اور منتوب استقفوں کو اجازت دی کہ وہ روما میں مرافعہ پیش کریں۔ اور شہنشاہ تیسرے فالن ٹینین نے ایک فرمان کے ذریعے سے پوپ لیو اعظم کی سرداری کو تسلیم کر لیا تھا۔

یہ چیز نظر انداز نہیں کیجانی چاہیے کہ سیاسی ضروریات کا لحاظ کرکے جب قسطنطین نے عیسائیت کو رومی شہنشاہت کا سرکاری مذہب قرار دیا تو وہ مذہبی معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ اس کو مقتدرِ اعلیٰ کے فرائض انجام دینے کے سلسلے میں اس کا بھی حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ چیز بھی نظر انداز نہیں کیجانی چاہیے کہ عیسائی شہنشاہوں نے پادری اعظم کا لقب اختیار کر لیا اور یہ کہ گراتیان وہ پہلا شخص ہے جس نے اس کو قبول کرنے سے ۳۸۲ء میں انکار کیا تھا۔

16

رومی شہنشاہت کے زوال کے بعد اوسترو گوتھ حکمرانوں نے عام طور پر مغربی نظام کلیسا کو ایک ایسی آزادی دے رکھی تھی جس سے مشرق کے کلیسا محروم تھے۔ قسطنطنیہ کے شہنشاہ کلیسائی قوانین بھی اسی طرح وضع کرتے تھے جس طرح قوانین ملک۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ کلیسائی قوانین بطریرکوں کے پاس بھیجتے تو قوانین ملک صوبوں کے حاکموں کے پاس بھیجتے۔ تھیوڈورک نے پادریوں کے ایک اجلاس شوریٰ کو یہ اجازت دی تھی کہ وہ روحانی معاملات میں غیر مذہبی لوگوں کے گھس آنے کو ناجائز اور نادرست قرار دے۔ بے شبہہ ہمیشہ یکساں رواداری نہیں برتی جاتی رہی۔ پوپ جان اول قید خانے میں مرا۔ اور اس کے جانشین تیسرے فیلکس کو بادشاہ نے یہ اختیار دیا تھا کہ سینیٹ یا پادریوں یا رومی رعایا میں سے کسی ایک کو اپنے لیے منتخب کرلے۔ لیکن نہ تو ان واقعات نے اور نہ ہی یونانی شہنشاہوں کے اٹلی کو فتح کر لینے نے اس بات میں روڑے اٹکائے کہ پاپائیت کا نظام روز افزوں ترقی ہی کرتا جائے۔

پوپ کے دعووں سے بیشمار احتجاج شروع ہوئے۔ مشرق نے ان دعووں کو کبھی تسلیم نہیں کیا اسکندریہ اور انطاکیہ کے بطریرکوں نے ان کے

سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ قسطنطنیہ کے بطریرک نے کال سی ڈون کی مجلس شوریٰ کے فیصلے پر تکیہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ اس کو روما یعنی پوپ کے برابر ہی حقوق حاصل ہیں۔ پھر بھی روما کامیابی ہی حاصل کرتا چلا گیا، کیونکہ اس کو اتحاد پیدا کرنے میں جتنی کامیابی ہوئی، مشرق اس سے محروم رہا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مشرقی کلیسا یونانیوں کے زیر اثر تھا۔ اور یونانی نسل، طبعاً افتراق پسند تھی۔

ملک کے کشوری اقتدار کی موجودگی کے باعث پاپائیت نے اپنے لیے ایک ماتحتانہ حیثیت کو جاری رکھا۔ یوستی نیان نے اپنے ہاتھوں میں روحانی اور دنیاوی ہردو اقتدار جمع کر لیے تھے۔ اس نے روما کو اعزاز و اکرام سے لاد دیا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی ذاتی برتری کو برقرار رکھنے میں ذرا بھی کمی نہیں کی۔ اس نے اپنے پروردوں میں سے دو کو پوپ نامزد کروایا اور پوپ گریگری اعظم نے شہنشاہ موریس کے نام جو مؤدبانہ خط لکھا ہے، اس سے بہتر کوئی اور چیز اس بات کو واضح نہیں کر سکے گی کہ پوپ اور شہنشاہ کی باہم حیثیت کیا تھی۔

اٹلی میں شہنشاہی اقتدار کے کمزور پڑ جانے اور لومبارڈ علاقے والے جرمنوں کے حملوں کے باوجود روما کا تعلق قسطنطنیہ کے شہنشاہوں سے باقی رہا۔ چنانچہ پوپ یا تو ان شہنشاہانِ قسطنطنیہ سے یا ان کے نائب یعنی صوبہ راؤینے کے نائب السلطنت سے اپنے انتخاب کی توثیق حاصل کرتے رہے اور ٹیکسوں کی ادائی کے پابند رہے۔

کارلوفنجیوں کا دور آیا تو انھوں نے بھی بیزنطینی روایات کی پیروی پر اکتفا کی۔ انھوں نے جب پوپوں کو لومبارڈیول اور یونانیوں سے نجات دلائی، تو انھوں نے پوپوں کو تقریباً وہی حیثیت دی جو اپنی وسیع شہنشاہت کے اسقفوں کو دی تھی۔

جب شارلمان کی پوپ تیسرے لیو کے ہاتھوں تاج پوشی ہوئی تو

17

نظریے کی حد تک اقتدار شہنشاہی منتقل ہو گیا۔ مشرقی رومی شہنشاہت کی قیصرہ ایرینے نے جب اپنے بیٹے قسطنطین کو معزول کیا تو روما کا انتخاب بھی وہی اثر رکھتا تھا جو قسطنطنیہ کا۔ پوپ نے اعلیٰ ترین افسر مذہبی کی حیثیت میں کارروائی نہ کی بلکہ روما کے باشندوں کے ترجمان کی حیثیت سے۔ اور اس نے فرنگی بادشاہ کے سر پر جب سونے کا تاج رکھا تو وہ روما کے باشندوں کی پرجوش تائید کی وجہ سے تھا۔ شارلمان کی شہنشاہت نے بعد میں مقدس رومی جرمانی شہنشاہت کا نام اختیار کیا کیونکہ اٹلی اور جرمنی کا اقتدار اعلیٰ ایک ہی جرمن حکمران کو حاصل ہو گیا تھا۔ یہ مقدس رومی شہنشاہت حقیقت میں جرمنی کے بادشاہ اوتون اعظم کی تخلیق کہی جا سکتی ہے۔

اٹلی میں تراج اپنے اوج عروج پر تھا۔ وہاں بھی جاگیرداری نظام پھیل گیا تھا اور مختلف ڈیوک، مارکوئیس، ہیز ایبٹ رے، شوسے فرنیول، اسپولیت اور ٹسکنی کے بڑے بڑے علاقوں کے کاونٹ (جاگیردار) سرداری کے لیے آپس میں جھگڑتے تھے۔ کلیسائے سینیٹ پیٹر یعنی مسکن پاپائیت میں یکے بعد دیگرے نااہل پوپ آتے گئے۔ پوپ کی اپیل کے جواب میں شہنشاہ اوتون بڑی بڑی فوجیں لے کر سلسلہ کوہ آلپ میں گھس آیا اور اٹلی اور صوبہ پافیا کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ جب اس نے اس بات کا حلف اٹھا لیا کہ وہ مقام مقدس یعنی پوپ کے مسکن کی حفاظت کرے گا اور شہر کے حقوق کا احترام کرے گا تو پھر وہ روما کی طرف روانہ ہوا جہاں اس کی ۲ فروری ۹۶۲ء کو پوپ بارھویں جان کے ہاتھوں تاجپوشی عمل میں آئی۔ شہر روما کے باشندوں کی رضامندی، اس رسم کے لیے ایک اہم عنصر تصور کی گئی۔ اور پوپ نے اپنے آپ کو اوتون کی رعیت تسلیم کر لیا۔ اور عامۂ رعایا نے یہ حلف اٹھایا کہ وہ آئندہ اس کی رضامندی کے بغیر کسی کو پوپ منتخب نہیں کریں گے۔[۱]

---

[۱] جیمس برائیس کی انگریزی کتاب "مقدس رومی شہنشاہت اور موجودہ جرمن شہنشاہت"

اس کے بعد کی صدی میں مقدس رومی شہنشاہت تیسرے ہنری کے دور میں اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ جرمنی میں اس کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ خود اٹلی میں اس کے اقتدار کا یہ حال تھا کہ اس نے مقام مقدس یعنے پاپائیت کے تین امیدواروں کو معزول کر دیا اور مجلس شورائے مذہبی سے اس نے یہ اقتدار حاصل کر لیا کہ پوپ کا انتخاب وہ خود کرسکے[1]۔

پاپائیت اور شہنشاہت کے باہم مل کر ایک برتر اقتدار ہونے کا جو تصور تھا، وہ اپنے مطمح نظر کو تو کبھی پورے طور سے حاصل نہ کرسکا۔ لیکن پھر بھی شارلمان اور اوٹو اعظم اور تیسرے ہنری کے زمانوں میں اس مطمح نظر سے، زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کی جاسکی۔

قرون متوسطہ میں حکومت الٰہیہ کا تصور جاری و ساری رہا۔ سینٹ آگسٹائن کے الفاظ میں شہر "خود خدا کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر" قائم تھا۔ اکویناس کے سینٹ ٹامس، ایجیدیو کولونا، دانتے اور نکولاس دکوزا اسی اصول اتحاد کی تائید میں جان لڑاتے رہے جس کی سینٹ آگسٹائن نے تلقین کی تھی۔ چنانچہ ان کی رائے میں عالم انسانی ایک واحد کل ہے جو خدا نے قائم کیا ہے۔ اس پر ایک ہی حکمران کی حکمرانی ہونی چاہیئے اور صوفیانہ نقطۂ نظر سے پورا عالم انسانی ایک ہی جسم پر مشتمل ہے، ایک ہی قوم ہے، ایک ہی بادشاہت ہے۔

اتحاد بہر حال مطمح نظر رہا۔ اور خود پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں آنداؤ کا بیٹر یہ کہہ کر اس کی تائید کرتا رہا کہ ارسطو جیسے سر برآوردہ فلسفی نے بھی (جس کے متعلق ابن رشد نے یہ کہا تھا کہ وہ قانون نگار فطرت تھا)، یہ کہا تھا کہ ایک سے زیادہ سرداروں کا ہونا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کا فرانسیسی ترجمہ از ڈومرگ باب ہشتم۔

[1] دیکھیے حوالہ بالا برائس کی کتاب "مقدس رومی شہنشاہت" باب ہشتم

ایک برائی ہے۔ اور حکمران ایک ہی ہونا چاہیے۔
بہر حال اعتدال پسندوں کے نزدیک خدا نے، اپنے آسمان کا بادشاہ ہونے کی حیثیت میں، پوپ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اور خدا نے، خود کے زمین کا بادشاہ ہونے کی حیثیت میں شہنشاہ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ غرض ہر دو حضرت مسیح کے جانشین تھے: ایک روحانی سردار تھا، تو دوسرا دنیاوی سردار۔ دوسرے الفاظ میں کلیسا اور مقدس رومی شہنشاہت دونوں حقیقت میں ایک ہی چیز تھے۔ اور یہ دونوں اسی ایک چیز کے دو رخ کہے جاسکتے ہیں۔[۱]
بہت دنوں تک خود شہنشاہت کے اقتدار کے متعلق غالیانہ نظریے رکھنے والے بھی روحانی اقتدار کا احترام ملحوظ رکھتے رہے۔ جب پوپ چوتھے آدریان نے اپنی بڑائی کے دعوے شروع کیے تو شہنشاہ فریڈرک بار بروسہ نے اپنے خط میں انجیل لوقا کی اس عبارت کا حوالہ دیا جس میں حضرت مسیح کا قول نقل ہوا ہے کہ: "اور شاگردوں نے کہا: استاد! یہاں دو تلواریں ہیں۔ اور یسوع مسیح نے ان سے کہا: یہ کافی ہے۔" دو تلواروں کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس کا ذکر فرانسیسی کتاب "سکسنی کا آئینہ" میں یوں ہوا ہے: "خدا نے دو تلواریں عیسائیت کی حفاظت کے لیے رکھی ہیں: روحانی تلوار پوپ کے سپرد کی گئی ہے، اور مادی تلوار شہنشاہ کے۔"
پاپائیت کے نظریے کو پوپ ساتویں گریگری نے ترقی دی۔ جب وہ ہلڈے برانڈ نامی ایک معمولی راہب تھا تو اس نے یہ چیز اس زمانے کے مقام تقدس یعنی پوپ کو سمجھائی تھی اور یکے بعد دیگرے اس نے چار پوپوں کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ کلیسا کے احیاء کی کوشش کریں اور روحانی اقتدار پوپ کے ہاتھوں آجانے کا اطمینان حاصل کریں۔

۱۔ دیکھیے ایضاً صفحہ ۱۳۴۔

اور جب وہ خود پوپ بنا تو اس نے اس کوشش کو جاری رکھا اور اس کو ایک عظیم الشان تحریک کی صورت دے دی کہ پوپ کو کشوری اقتدار پر برتری حاصل ہو۔ اس کے باعث مغربی کلیسا میں راہبیت کی روح غالب آگئی۔ مشرقی کلیسا میں یہی روح گناسٹک اور مانوی (ثنویت) عقیدے کی صورت میں جلوہ گر ہوئی اور وہاں والوں نے جسم انسانی کو ایک قید خانہ تصور کیا اور شہری معاشرے کو ایک رکاوٹ خیال کیا اور بالآخر اس سے تقشف پیدا ہوا۔ اس کے برخلاف مغرب میں رومی ذہنیت کے اثرات کے تحت اس نے ایک عملی مقصد تک رسائی حاصل کی جو اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ پوری دنیا کو روحانی اقتدار فتح کرے[1] 19

عیسائیت کو دو برائیاں گھن کی طرح کھا رہی تھیں: ایک تو مقدس چیزوں کی فروخت اور دوسرے پادریوں کے اخلاق کا بگڑ جانا۔ ساتواں گریگری اپنی زندگی بھر ان برائیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔[2] اس کے پیشرو اسقفیت کے خلاف لڑتے رہے، تو یہ پوری پادریت کے خلاف لڑتا رہا۔ اس کے کام کا یہ حصہ کامیابی سے سرفراز رہا۔ کلیسا کے اتحاد کے متعلق اطمینان حاصل ہو گیا اور خود پوپ کے روحانی اقتدار کو تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن یہ کامیابی کافی نہ تھی۔ سینٹ آگسٹائن نے جس خدائی شہر کا تصور پیش کیا تھا ساتویں گریگری نے اس کو وجود میں لانا چاہا مگر اس طور سے نہیں کہ اعیانیت قائم ہو جس کا خواب ہپّو کے اسقف یعنے سینٹ آگسٹائن نے دیکھا تھا، بلکہ ایک "فردی حکومت" کی صورت میں۔ اور اس طرح نہیں کہ حضرت مسیح غیر مرئی

---

[1] ۔ ہلمن کی انگریزی "تاریخ عیسائیت لاطینی" جلد ۴ صفحہ ۱۲۹۔

[2] ۔ لوران کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث"، جلد ششم باب پاپائیت وشہنشاہت صفحہ ۱۹۲ و مابعد۔

سردار رہیں بلکہ اس طور سے کہ پوپ روحانی بادشاہت کا قیصر ہو۔ یہیں سے نئے جھگڑے پیدا ہوئے اور یہیں سے قرون متوسط کی پاپائیت کے خود سرانہ نظریے وجود میں آئے جن کا منشا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک نہایت مطلق العنان "حکومت الٰہیہ" قائم کی جائے۔

ساتویں گریگری نے مقدس رومی شہنشاہت کے خلاف جو ہولناک جنگیں برپا کرائیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ اس نے صرف جرمنی ہی میں کلیسا اور کلیسا کے سردار کا اقتدار اعلیٰ نہیں منوایا بلکہ اس نے فرانس میں اپنے نمائندوں کو حکم لکھ بھیجا کہ یہ ضروری ہے کہ "ہر فرانسیسی پر واجب کیا جائے اور ان کو حکم دیا جائے کہ سچی اطاعت کے طور پر ہر گھر سالانہ کم سے کم ایک دینار ادا کیا کرے"۔ اس نے اسپین کے حکمرانوں سے کہا تھا کہ "طویل زمانے سے تمہاری سلطنت سینٹ پیٹر کی جائداد ہے"۔ اس نے ولیم فاتح کو لکھ بھیجا تھا کہ "ماتحت ہونے کا حلف لو"۔ کورسیکا سارڈینیا اور ہنگری کے باشندوں کو بھی اس نے مماثل الفاظ میں مخاطب کیا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ بہادری کا کارنامہ اس نے جرمنی کے شہنشاہ چوتھے ہنری سے جھگڑے میں دکھایا۔ اس جھگڑے میں قلعۂ کانوسا کا منظر سب سے زیادہ یادگار واقعہ ہے۔ اور یہ لڑائی حقیقت میں ایک عالمگیر شہنشاہت کے لیے لڑی گئی تھی۔ اصل میں وہ مقدس اشیا کی فروخت کے سلسلے میں چھڑی تھی۔ چوتھا ہنری تخت نشین ہو رہا تھا اور اس نے روما کے مطالبات کو ماننے سے انکار کیا تھا۔ پوپ کو یقین تھا کہ اسے مقدس رومی شہنشاہت کے اندر جو بہت سے ماتحت حکمران شریک تھے، وہ پوری مدد دیں گے۔ اس لیے اس نے بے جھجک اس مسئلے کو اعلیٰ ترین مجلس مذہب یعنی کونسل میں پیش کر دیا۔ جرمنی نے احتجاج کیا اور اس کے اسقفوں نے گریگری کے علی الرغم جواب دیا اور ٹورمس کی کونسل میں خود اسی کو پاپائی سے معزول کر دیا۔ اس پر پوپ نے شہنشاہ کو جات باہر کر دیا اور اس کی رعیت

20 کو اس کی اطاعت کے حلف سے بری قرار دیا۔ پوپ کے فرمان میں لکھا تھا: "میں ہنری کے لیے ممنوع قرار دیتا ہوں کہ وہ ٹیوٹانی اور اطالوی سلطنت پر حکومت کرے۔ اور میں ان تمام عیسائیوں کو حلف سے بری قرار دیتا ہوں جنھوں نے اس کے لیے حلف اٹھایا ہو یا آئندہ اٹھانے والے ہوں۔ اور میں سب کے لیے اس کی ممانعت کرتا ہوں کہ اس کی خدمت بطور بادشاہ کے کریں"

یہ کشمکش بڑی سخت تھی۔ اور اس میں فتح و شکست بار بار پلڑے بدلتی رہی۔ پہلی دفعہ شہنشاہ کو شکست ہوئی تو اس نے قلعہ کانوسا آکر ساتویں گریگری سے رحم کی التجا کی۔ مگر جلدی ہی اس نے پھر ہتھیار اٹھائے اور برابر مقابلہ کرتا رہا۔ نہ تو (۶۵) لڑائیوں نے اور نہ بدنامی و فضیحت نے اور نہ ہی رفیقوں کی غداری نے اس کی ہمت کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کی۔ صرف ایک بیٹے کی بیوفائی اس کی ہمت شکنی کا باعث ہوئی۔ لیکن ساتویں گریگری کے فتوحات ہوئین اشتاوفن کی ہیروی نسل سے ٹکراتے رہ گئے۔ اور جب جلاد کے تبر نے اس پر عظمت خاندان کے آخری نمائندے کے سر کو مقتل میں لڑھکانے میں کامیابی حاصل کی، تو یہ لڑائی اتنا طول کھینچ چکی تھی کہ پوپوں کی عالمگیر حکمرانی کا قائم ہونا ہمیشہ کے لیے ناممکن ہو چکا تھا[1]۔

ایک مورخ نے ساتویں گریگری کو "معلم ناممکنات" کا خطاب دیا ہے۔ اس مشہور پوپ نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ اس کی تجویزوں کو جامۂ عمل نہیں پہنایا جا سکتا۔ بے شبہ اس نے ایک شہنشاہ کو اس بات پر مجبور کیا تھا کہ تین دن تک اپنی خطاؤں کی معافی کے لیے گڑگڑاتا رہے۔ مگر اس کے بعد خود گریگری کو بھی شکست اٹھانی پڑی اور ابدی شہر یعنے روما سے دور اس نے اپنی جان کو جان آفریں کے سپرد

[1] پوراں کی کتاب مذکور، حوالۂ مذکور۔

اس طور سے کہا کہ اس کی رعیت اس سے بگڑ چکی تھی اور اس کے ساتھی اس کو چھوڑ چکے تھے۔ شہنشاہ جو تھے ہنری کو موقع ملا کہ کانوسا کا انتقام لے چنانچہ اس نے مکرر ساتویں گریگری کو پاپائی سے معزول کرایا۔ اور بے قاعدہ پوپ تیسرے کلیمان کو روما پہنچایا اور اپنے کو اٹلی کے بادشاہ کی حیثیت سے مذہبی حلقوں سے بھی تسلیم کرا لیا۔ ساتویں گریگری کو پاپائیت مجسم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے پادریوں کو ان ہولناک لاطینی الفاظ میں لڑائی پر آمادہ کیا تھا کہ "ملعون ہے وہ شخص جو اپنی تلوار کو خون آلود نہ کرے"۔ یہ چیز اس کے جانشینوں کے لیے ماٹو بن گئی۔ یہ غیر مفید نہ ہوگا کہ اس کے نظریوں کا زیادہ قریب سے مطالعہ کیا جائے۔

اس کے خیالات کی بنیاد سے سب واقف ہیں کہ کیتھولک راہبوں کے تصور کے مطابق آدمی میں دو ممتاز اور متضاد عناصر پائے جاتے ہیں یعنی روح اور جسم۔ اب معاشرے کے نظام روح کی نمائندگی کون کرے؟ کلیسا۔ اور جسم کی نمائندگی کون کرے؟ غیر مذہبی عوام کا سماج۔ اس غیر مذہبی سماج یعنی مملکت کی زندگی کوئی حقیقی زندگی نہیں ہے۔ اور انسانیت اس وقت تک نجات حاصل نہیں کر سکتی جب تک وہ کلیسا کی رہنمائی کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دے۔

جس طور سے ساتویں گریگری نے اپنے نظریے کی توضیح کی وہ ایک سے زیادہ دلچسپیوں کی حامل ہے۔ اس کے فرمانوں، اس کے خطوط اور اس کے احکام سے ہمیں نظر آ سکتا ہے کہ ان دونوں اقتداروں میں وہ کس طور سے امتیاز کرتا تھا۔[1] اس کے "احکام" میں ہمیں یہ لکھا نظر آتا ہے کہ "پوپ کا نام دنیا میں اچھوتا ہے۔ وہ شہنشاہوں کو معزول کر سکتا ہے، اور ان کی رعیت کو حلف اطاعت سے بری قرار دے سکتا ہے"۔ ساتویں گریگری کے "خطوط" بھی ایسے ہی نعلی ہیں۔

21

---

[1] گیزلر کی جرمن "تاریخ کلیسا" جلد (۲) حصہ اول فصل (۲۳) اور حصہ دوم فصل (۴۸)۔

چنانچہ "سینٹ پیٹر کا سکن چونکہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ مذہبی چیزوں کو جس طرح چاہے باندھے یا کھول دے۔ اس لیے بدرجۂ اولیٰ اس کو مادی چیزوں کے متعلق بھی ایسا ہی اقتدار حاصل ہے۔" یہ وہ راست اقتدار تھا جس کے متعلق پوپ کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کا استعمال کرسکتا ہے۔ اور یہ وہ مطلق العنان اقتدار تھا جو اس کے اپنے اعلانوں کے مطابق اس کو حاصل تھا۔

ساتویں گریگری کے "خیالات" ان دونوں اقتدارات کی انفرادی حیثیتوں کے متعلق بھی اتنے ہی واضح اور قطعی ہیں۔ چنانچہ اس کے ایک خط سے ہم کو مکمل طور سے اس کا علم ہوجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "بادشاہوں کی اصل انسانوں سے ہے اور انسانوں کو شیطان نے ورغلا کر اس کوشش پر آمادہ کیا ہے کہ اپنے ہمجنسوں پر غلبہ حاصل کریں۔ اس کوشش پر انھیں ایک اندھی ہوس اور ایک ناقابل برداشت حرص آمادہ کرتی ہے۔ جن ذرائع سے وہ اپنے مقصد کو حاصل کرتے ہیں وہ چوری، بیوفائی، قتل انسان، اور تمام دیگر ممکنہ جرائم ہیں۔ اور یہی وہ ناپاک انسان ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے مسیح ربانی کو اپنے قدموں میں جھکا دیا! اس دعوے سے فرشتوں کے مطرود سردار یعنی شیطان کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس نے "خدا کے بیٹے" کو ان الفاظ میں زمین کی بادشاہتوں کا لالچ دیا تھا کہ: اگر تو میری پوجا کرے تو میں تجھے یہ تمام چیزیں دیدوں گا۔ یہ وہ امتیاز ہے جسے خدا سے ناواقف انسانوں نے گھڑ لیا ہے۔ کیا اس امتیاز کو اُس امتیاز کے آگے سر تسلیم نہیں خم کردینا چاہیے جسے قدرت نے اپنے اعزاز کے لیے قائم کیا ہے اور جو اسی قدرت نے اپنی مرحمت سے دنیا کو عطا کیا ہے۔" گویا دنیاوی و مادی اقتدار کی اصل شیطان سے ہے، اور روحانی اقتدار خدا سے حاصل ہوتا ہے۔ دنیاوی طاقت جہنم سے حاصل ہوتی ہے، اور کلیسائی طاقت کی اصل آسمانی ہے۔ صرف یہی نہیں! خود کلیسا کے اندر ساتویں گریگری نے

ایک مہلک تقسیم قائم کی یعنی جملہ راسخ العقیدہ لوگ پادریوں سے بالکل الگ قرار دیے گئے اور جملہ رعایا کو راعیوں کے خلاف ہر قسم کی کاروائی اختیار کر سکنے سے محروم کر دیا گیا۔[1]

22 واقعات نے ساتویں گریگری کے اِن اِدعاوں کی کملی تردید کر دی جو اسے دنیاوی اقتدار کو اپنے ماتحت بنانے کے متعلق تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ چوتھے ہنری کے جھگڑوں میں اسے ناکامی ہوئی۔ ولیم فاتح نے اُن کے مطالبات کو حقارت کے ساتھ رد کر دیا تھا۔ دیگر مواقع پر بھی اس کی کوششوں کو ناکامی نصیب ہوئی۔ لیکن یہ بہرحال تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے دعوے خواہ کتنے ہی غیر معتدل اور مغرورانہ کیوں نہ سمجھے جائیں عوام کی ذہنیت میں ضرور سرایت کر گئے۔ جیسا کہ بلونچلی نے واضح کیا ہے کہ ساتویں گریگری کے زمانے سے پوپ کو اعلیٰ تر مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے اور عیسائی تصورات کے مطابق اس کا رتبہ شہنشاہ سے بھی بلند ہے۔ جرمنی کی مخالفت سے ایک عالمگیر کلیسائی فردی حکومت قائم نہ ہو سکی۔ لیکن شہنشاہوں کو بھی پوپوں پر اختیار باقی نہ رہ سکا۔ خیال یہ قائم ہو گیا کہ عالم عیسائی میں پوپ کا اقتدار اعلیٰ مقدم سمجھا جائے۔ اور یہ کہ دیگر مقتدرانِ اعلیٰ اس کی اطاعت کریں۔

تیرھویں صدی عیسوی میں چند بڑے قانون ساز پوپوں مثلاً تیسرے انوسنٹ، نویں گریگری اور چوتھے انوسنٹ نے جو مغرورانہ سیاست جاری کی تھی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سینٹ پیٹر کو جو عالمگیر اقتدار حاصل تھا اس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ کلیسا اس عالمگیر اقتدار کا وارث سمجھا جائے؛ یہ کہ شہنشاہ باقی امور کے متعلق پوپ ہی کا نائب سمجھا جائے؛ یہ کہ مقدس رومی شہنشاہیت، جو دنیاوی اقتدار کا سب سے بلند مظاہرہ تھی، وہ بھی مقام مقدس یعنے پوپ کی ماتحت ہے؛ اور یہ کہ پوپ

[1] گریگوروتیوس کی جرمن "تاریخ شہر روما قرون متوسط میں" جلد ۴ صفہ ۲۵۔

مختلف حکمران کرتے ہیں لیکن کلیسا کے لیے اور پوپ کی ہدایت کے تحت۔
نواں گرگیجری اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ
سچ پوچھو تو پوری دنیا کا مقتدر آقا پوپ ہی ہے: دنیا کی چیزوں کا
بھی، دنیا کے اشخاص کا بھی۔

قسطنطین کے عطیے سے سب واقف ہیں۔ یہ دستاویز آٹھویں صدی
عیسوی کے نصف دوم میں جعلی طور سے تیار کی گئی تھی۔ وہ اس بات
پر مبنی قرار دی جاتی ہے کہ قسطنطین کا جذام دور ہو گیا تھا اور پوپ
سِلِ وِسْتر نے اسے بپتسمہ دیا تھا۔ شکریے کے جذبات سے مملو ہو کر
شہنشاہ نے پوپ کو شہر روما، ملک اٹلی، مغربی صوبے یعنے لمبارڈی،
علاقۂ وینیس اور علاقۂ اِسترِیا عطیے میں دیدے۔ نویں گرگیجری نے
اس مشہور دستاویز پر جن الفاظ میں شرح لکھی وہ یہ ہیں: اس نے
فریڈرک دوم کو لکھا کہ "یہ ایک مشہور اور معروف واقعہ ہے کہ یہ
قسطنطین عالمگیر بادشاہت کا مالک تھا۔ اس نے نہ صرف شہر روما کے
باشندوں، بلکہ پوری رومی شہنشاہت کے باشندوں کی رضامندی
سے یہ ارادہ کیا ہے کہ حواریوں کے شہزادے کا نائب (یعنے پوپ)
جو عالم پادریت کی اور پوری دنیا والوں کی روحوں کا سردار تھا،
وہ اب پوری دنیا کی چیزوں اور لوگوں کا بھی حکمران ہو جائے۔
قسطنطین کا خیال ہے کہ خدا نے جس کو آسمانی چیزوں کا زمین پر نگران
مقرر کیا ہے، وہی دنیاوی چیزوں کا بھی انتظام کرے۔ اسی لیے اس
نے پاپائے روما کو ہمیشہ کے لیے عصا و علامات شہنشاہی دیدیے ہیں؛
نیز شہر روما اور اس کی اپنی ڈچی (ریاست) اور خود پوری شہنشاہت
بھی۔ اس کا تصور یہ ہے کہ یہ نہایت بری بات ہوگی کہ جس جگہ کے لیے آسمانی
شہنشاہ نے عیسائی مذہب کے سردار کو مامور کیا ہو اس جگہ کوئی اور دنیاوی شہنشاہ کسی طریقے
کا بھی اقتدار استعمال کرسکے۔ اسی لیے اس نے اٹلی کو پوپ کے سپرد کر کے اپنے لیے یونان
میں ایک نیا مسکن منتخب کرلیا ہے۔ اور کلیسا نے اس کا جو شمار لمحان کے

(جو شہنشاہت کے تاجدار سے بھی برتر ہے) وہ حکمرانوں کا حکمران" ہے۔[1]

قانونِ مذہبی کے مولف اگر مقام مقدس یا پاپائی کے دعووں کی تائید کرتے رہے تو قانونِ ملک کے مؤلف شہنشاہت پسندانہ نظریوں کی۔ اول الذکر نے یہ ثابت کیا کہ پوپ کے اقتدار میں ہونا، بہ نسبت شہنشاہ کے اقتدار میں ہونے کے، زیادہ قرینِ عقل ہے۔ اور مذہبی قانون کی شرح نے یہاں تک دعویٰ کر دیا کہ شہنشاہ کو پوپ کسی بھی گناہ کے باعث معزول کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لاطینی جملہ یہ ہے "شہنشاہ کو کس گناہ کے باعث معزول کیا جاسکتا ہے؟ کسی بھی۔ اگر وہ ناقابلِ اصلاح یا غیر مفید بن جائے تو اسے معزول کر سکتے ہیں"۔

پوپوں کا اندازِ بیان قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے جو پر غرور دعوے کیے تھے، ان کے چند مظاہرات کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے:۔

سواب کے فلپ، برونزوک کے اوتون اور دوسرے فریڈرک نے جب تاج شہنشاہی کے لیے رقیب بن کر جھگڑنا شروع کیا تو پوپ تیسرے انوسنٹ نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ کلیہ قاعدہ قرار دیا کہ اصولاً اور قطعاً شہنشاہت تو مقام مقدس ہی کو حاصل ہوتی ہے اور یہ صرف پوپ ہی کے لیے ممکن ہے کہ وہ کسی کو تاج و تخت شہنشاہی اپنی برکت کے ذریعے سے عطا کرے۔ کسی کو شہنشاہ نامزد کرنے کے حق کا ناگزیر نتیجہ اس نے یہ اخذ کیا کہ وہ اس کو معزول اور تبدیل بھی کر سکتا ہے۔

28

اپنے احکام میں سے ایک میں وہ بیان کرتا ہے کہ انجیل لوقا میں جن دو تلواروں کا ذکر ہے وہ روحانی اور دنیاوی اقتدار کی تمثیل کے طور پر بیان ہوئی ہیں، اور یہ دونوں تلواریں پوپ ہی کو حاصل ہیں۔ ایک کا استعمال پوپ شخصی طور سے کرتا ہے، دوسرے کا استعمال اگرچہ

---

[1] ہوشیار برے اول کی لاطینی کتاب "فریڈرک دوم کے سیاسی کارنامے" جلد (۱) دیباچہ صفحہ ۴۳۸۔

کندھوں پر رکھ کر مرکز شہنشاہت کو اب جرمنی میں منتقل کر دیا ہے۔ اگر کلیسا نے تیرے پیشروؤں اور تجھ کو تخت شہنشاہی پر بیٹھنے کے لیے بلایا اور تجھ کو (یعنی فریڈرک دوم کو) تیری تاجپوشی کے دن تلوار کی طاقت بھی عطا کرنی منظور کی، تو اس کے معنے یہ نہ تھے کہ کلیسا نے اپنے اقتدار میں کسی طرح کی بھی کمی کرنی منظور کی تھی"[1]

24

چوتھے انوسنٹ نے شہنشاہ دوسرے فریڈرک کو معزول کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ اس کی رعایا اپنے حلف وفاداری سے بری ہے اور وہ تمام لوگ جو پھر بھی شہنشاہ سے وفاداری ظاہر کریں وہ جات باہر سمجھے جائیں۔ یہ اعلان کرتے ہوئے اس نے خود حضرت مسیح کے ان الفاظ کی بنا پر اپنا حق جتایا تھا کہ "جس کسی کو زمین میں سرداری دی جائے اسی کو آسمان میں بھی سرداری دی جائے گی"

شہنشاہت پسندانہ نظریے کو زیادہ تر قانون ملک کے مولفوں نے ترقی دی۔ یہ لوگ قانون روما کے بے انتہا دلدادہ تھے۔ اور اس قانون کی شرح لکھتے ہوئے بارھویں صدی عیسوی ہی سے اس کے نظریات مطلق العنانی کو انھوں نے پوری طرح نظام جاگیرداری میں منتقل کر دیا۔

۱۱۵۸ء میں رونکالیہ کے میدان میں مجلس شہنشاہی کا اجلاس ہوا اور اس میں فریڈرک باربروسہ نے بلگار، مارٹن گوسیا، اور پورتا را ئینائے کے ژاک اور ہوگو نامی بولونیا کے چار ماہرین قانون سے (جن کے ساتھ لومبارڈی شہروں کے نمایندے بھی شریک تھے) وہ مشہور فیصلہ کروا لیا جس کے ذریعے سے اس کو اس اہم معاملے میں مکمل اقتدار حاصل ہو گیا کہ ماتحت حکمرانوں اور جمہوریتوں کے

[1] ایضاً صفحہ ۳۰۴

تعلقات کا شہنشاہیت کے ساتھ تعین خود ہی کر سکے۔ اس اجلاس کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن شہنشاہ نے مارٹن اور بلگار کے ساتھ سیر کرتے وقت یہ دریافت کیا کہ آیا ان کی رائے میں وہ دنیا کا آقا ہے؟ مارٹن نے اثبات میں جواب دیا۔ بلگار نے ایک شرط لگائی اور کہا کہ وہ اس سے استفادہ تو کر سکتا ہے لیکن اس کا مالک نہیں ہے۔ فریڈرک نے اول الذکر کو ایک گھوڑا انعام میں دیا۔ اس پر بلگار نے لاطینی میں کہا "میں نے گھوڑا اس لیے کھو دیا کہ گھوڑے کے عوض حق بات کہی اور یہ ٹھیک نہ تھا۔"

چاہے یہ قصہ سچا ہو یا نہیں، اس سے بڑی عمدگی کے ساتھ ان خیالات کی ترجمانی ہو جاتی ہے جو اس مکتب کے لوگ شہنشاہوں کے متعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ شہنشاہوں کے مغرور ترین دعووں کی تائید کرنے والے بھی قانون ملک کے ماہروں میں مل جاتے تھے۔ بے شبہ واقعے کی حد تک جرمن شہنشاہوں کے مطالبوں اور دعووں سے انسانیت کے لیے کبھی کوئی حقیقی خطرہ نہیں پیدا ہوا۔ یہ "حکمران عالم" کے خطاب سے ملقب ہوتے تھے، لیکن اکثر وہ جرمنی پر تک اطمینان کے ساتھ حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ اور وہ حکمران جن کو یہ اختیار حاصل سمجھا جاتا تھا کہ جس بادشاہ کو چاہیں تخت پر بٹھائیں اور جس کو چاہیں معزول کریں، وہ بھی اکثر اپنے طاقتور ماتحتوں کے سامنے لرزا کرتے تھے۔ قانون روما کے شارحین نے شہنشاہت کے متعلق جو بلند تصور قائم کیا، اس کو جس احترام سے ملبوس کیا اور اس کے لیے جو اختیارات انھوں نے تسلیم کیے، وہ دلچسپ چیز ہیں۔ اتحاد کی ضرورت بہت بڑی رہی ہوگی کیونکہ اس کو حاصل کرنے کی خواہش نے بڑے بڑے دماغوں کو بھی اس طرح کے مبالغوں پر آمادہ کر دیا۔ ایک قابل ذکر چیز یہ ہے کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوں جوں شہنشاہت کمزور تر ہوتی گئی ویسے ویسے دنیا کے سیاسی نظام میں اس کو جو

25

رتبہ حاصل تھا وہ شاندار تر الفاظ میں پیش کیا جانے لگا۔
فریڈرک دوم کی سیاست میں اصلاح کی جو خواہشیں نظر آتی ہیں وہ بڑی عجیب و غریب تھیں۔ اس نے چاہا کہ جرمنی اور اٹلی کو ایک ہی اقتدار کے تحت لا لیا جائے اور پوپ کو دوبارہ خالص روحانی مسائل تک محدود کر دیا جائے۔ اس کے بعد جو خطرناک کشمکش ہوئی اس کے دوران میں یہ نظر آیا کہ اس نے اپنی ابتدائی تجویزوں میں ترمیم کر دی ہے اور اس بات کا خواب دیکھنے لگا ہے کہ پاپائی اقتدار کا خاتمہ ہی کر دے اور اس کے اختیارات کو بھی شہنشاہ کے اختیارات میں شامل کر دے۔ شہنشاہ نے خود کے "تقدس میں پوپ سے" برتر ہونے کا اعلان کیا اور یہ ظاہر کیا کہ یسوع مسیح کے نائب ہونے کے فرائض وہ پوپ کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور سے انجام دے سکتا ہے۔ پوپ کے حوالی موالی میں ان خیالات نے مبالغہ آمیز طور سے اپنا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ پوپ کا احترام اس طور سے کیا جانے لگا کہ گویا وہ زندہ خدا کا اوتار ہے اور اس کے وزیر اعظم پیٹر ڈلا فینیہ کے متعلق — جو ایک ہمعصر خیال کر لیا جاتا ہے — یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ جدید کلیسا کا سنگ زاویہ ہے۔[1]
فریڈرک دوم ناکام ہوا۔ اس کشمکش میں اس کے جانشین غائب ہو گئے مگر اس کشمکش نے ذہنوں پر ایک محو نہ ہونے والا نشان چھوڑ دیا۔ بہت دن تک اقتدار شہنشاہی کے حامی، خانوادۂ ہوئن اشٹاوفن کے حکمرانوں کو، جنھیں کلیسا نے جات باہر کر دیا تھا، مقدس اولیاء خیال کرتے رہے اور یہ تصور کیا جاتا رہا کہ دوسرا فریڈرک مر نہیں سکتا کیونکہ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ پادریوں کو نکال باہر کرے۔ ایک ہمعصر مولف نے بیان کیا ہے کہ

---

[1] ایضاً صفحہ ۷۰ و ما بعد

یہاں تک پیشین گوئی کی گئی کہ وہ اپنی راکھ سے ایک انتقام لینے والا، ایک تیسرا فریڈرک پیدا کرے گا جو پوپ اور اس کے نظام پادریت کا خاتمہ کردے گا۔ سوئیستان (سوئٹزرلینڈ) کے ایک مورخ وِنٹر تور کے کے جان نے بیان کیا ہے کہ باویریا کے لوئیس کی وفات پر مختلف قوموں کے لوگوں نے بلکہ تمام قوموں کے لوگوں نے کھلم کھلا یہ اعلان کیا کہ فریڈرک دوم پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ دوبارہ آنیوالا ہے تاکہ اس کلیسا کی اصلاح کردے جو ایک انتہائی پستی اور فساد میں مبتلا ہوگیا تھا۔ جو لوگ اس خیال کے حامی تھے انھوں نے کہا کہ "وہ یہ ضروری ہے کہ وہ آئے حتیٰ کہ اس وقت بھی جب اس کے ایک ہزار ٹکڑے کیوں نہ کردیے گئے ہوں اور اس وقت بھی جب وہ کسی چتا کے شعلوں سے راکھ ہی کیوں نہ ہوگیا ہو۔ یہ فطرت کا فیصلہ ہے کہ یہ ایسا ہی ہو۔ اور یہ فیصلہ ناگزیر ہے۔"

اتحاد کے اصول نے دانتے کو بھی پھسلا لیا تھا چنانچہ اس کی رائے میں اتحاد ہی جملہ خوبی کا ماخذ ہوسکتا ہے۔ "وہ سب سے بڑی چیز سب سے بڑا اتحاد ہے۔ اور سب سے بڑا اتحاد سب سے بڑی بھلائی ہے"۔ یہ الفاظ اس کے نظریے کا نچوڑ ہیں۔ اس کی رائے میں فردی بادشاہت ہی وہ واحد طریقۂ حکومت ہے جس سے اعلیٰ ترین بھلائی یعنے عالمگیر امن کے متعلق اطمینان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دانتے کے مقابلے میں کم قابل لوگ مثلاً اس کا ہمعصر چینو اور اس کے بعد کے زمانے کا بارتولے بھی اس کے اس یقین میں شریک رہے۔

اس بارے میں اتفاق رائے نہیں ہے کہ دانتے نے اپنی کتاب "مونارکیا" یعنے "بادشاہت" کب تالیف کی؟ کیا وہ سنہ ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ تالیف ہوئی یا دانتے نے اس کو خود ساتویں ہنری کے بڑائی میں لکھا جب کہ وہ اس اٹلی میں اپنا شہنشاہی اقتدار جمانے کے لیے آیا تھا جہاں اس کے آباد اجداد طویل عرصے تک کشمکش کرتے رہے تھے؟

26

یا یہ کہ اس نے اس کو ساتویں ہنری کی موت کے بعد مرتب کیا؟ معلوم نہیں۔ جہاں تک کتاب کا تعلق ہے یہ امر قابل ملاحظہ ہے کہ اس میں پاپائیت پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا ہے۔ ساتویں ہنری نے ذرا بھی پوپ پانچویں کلیماں سے جنگ نہ کی تھی۔ دانتے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شہنشاہ کو، جو قیصروں کا وارث ہے، عالمگیر بادشاہت کا بھی حق حاصل ہے۔ دانتے یہ تحقیق کرنا چاہتا تھا کہ آیا فردی بادشاہت دنیا کی بھلائی کے لیے ضروری ہے، آیا رومی قوم درست طور سے بادشاہت کی مستحق ہے، آیا بادشاہ کا اقتدار براہ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے یا کسی منسٹر(؟ پادری) کے واسطے سے یا خدا کے کسی نائب کے توسط سے۔

برائیس نے لکھا ہے کہ "حکمرانوں اور شہروں بلکہ خود ہر شہر کے مختلف طبقوں میں باہم جو ختم نہ ہونے والے جھگڑے چلے آرہے تھے، ان سے تھک کر، اور یہ دیکھ کر کہ فتنہ و فساد کو کم کرنے کا جو واحد ذریعہ شہری آزادی کی صورت میں پایا جاتا تھا، وہ بھی گھریلو استبداد کاروں کی ترقی سے غائب ہوتا جارہا تھا، اس لیے دانتے نے ایک جذبات انگیز صدا بلند کی کہ کوئی ایسی قوت وجود میں آئے جو اس طوفان میں سکون پیدا کرسکے۔ لیکن اس لیے نہیں کہ آزادی کا خاتمہ کرے یا مقامی خود اختیارانہ حکومت کو پامال کرے بلکہ اس لیے کہ ان کی اصلاح اور ان میں اعتدال پیدا کرے اور بے بس اٹلی میں اتحاد اور امن کو بحال کرے۔ دانتے کا استدلال شروع سے آخر تک منطق کے بالکل مطابق ہے اور وہ نوبت بہ نوبت کبھی مقنن کی حیثیت میں گفتگو کرتا ہے، کبھی ماہر دینیات کی، اور کبھی ماورائے طبیعیات متکلم کی۔ اور اس کی (لافانی نظم) ڈیوائن کامیڈی کے لکھنے والے یعنی شاعر کی حیثیت صرف اس وقت غمازی کرتی نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اسلوب میں

کوٹ کوٹ کر زور بھرا ہوا ہے، وہ غیر مرئی چیز کو نہایت واضح طور سے دیکھ لیتا ہے اور کہیں کہیں ایک آدھ درخشاں و تابان استعارہ استعمال کر دیتا ہے۔[1]

27

دانتے کی رائے میں شہنشاہت کے ذریعے سے عالمگیر امن حاصل ہو سکے گا۔ اور یہی سب سے بڑی اور سب سے اچھی بھلائی ہے۔ چنانچہ اس کے (لاطینی) الفاظ میں "عالمگیر امن ہی وہ بہترین چیز ہے جو ہماری بھلائی کے لیے درکار ہے"۔ اس کی تجویز میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس پوری بادشاہت میں ایک ہی قانون پایا جائے، بلکہ ہر قوم اپنا علٰحدہ قانون بنا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ بعض مشترک مفاد پائے جائیں گے، اس لیے امن کی خاطر ان مفادات کا انتظام کرنے کا حق شہنشاہ کو حاصل ہو۔

یہ شہنشاہت صرف "امن" ہی نہ ہوگی بلکہ "آزادی" بھی۔ بنی نوع انسان کو اس وقت تک بھلائی میسر نہیں آسکتی جب تک کہ اصول آزادی سے متمتع نہ ہو۔ اور یہ ایک بادشاہ ہی کے تحت ممکن ہے کہ کوئی شخص زیادہ سے زیادہ آزاد رہ سکے۔

دانتے نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شہنشاہ پوپ سے بے نیاز ہے: "انسان کا دوگونہ مقصد ہوتا ہے۔ اور اسی لیے اسے دہری رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے: ایک طرف تو ابدی زندگی ہے اور اسی کے متعلق پوپ کو رہنما مقرر کیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف دنیاوی بھلائی ہے، جس کا رہنما شہنشاہ مقرر ہے۔ خدا شہنشاہ کا انتخاب کرتا ہے، اور خدا ہی اس کو استقلال عطا کرتا ہے۔ انتخاب کنندہ

---

[1] جیمس برائیس کی انگریزی کتاب "مقدس رومی شہنشاہت" کا فرانسیسی ترجمہ جو اہیل دومرگ نے کیا تھا صفحہ ۳۴۵ [ہم نے اصل انگریزی کے صفحہ ۲۶۵ سے یہ ترجمہ کیا ہے تاکہ ترجمہ در ترجمہ ہونے سے فرق بہت زیادہ نہ ہو جائے۔ مترجم]

مشیت خداوندی کے اعلان کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ لیکن شہنشاہ، جو دنیاوی معاملات کا مقتدر اعلیٰ ہے، چند معاملات میں پوپ کا محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ دنیاوی بھلائی ایک فروتر حیثیت رکھتی ہے، بہ نسبت آسمانی بھلائی کے۔ اسی لیے قیصر کو چاہیے کہ پیٹر کا وہ احترام کرے جو وہ اپنے باپ کا بھی نہیں کرتا۔" حقیقت میں اس ممتاز شاعر (دانتے) کے سیاسی تصورات میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جسے جسارت کہا جائے بلکہ جن پادریوں نے باویریا کے لوئیس کا ساتھ دینے اور تائید کرنے کے لیے بغاوت کی تھی، انھیں کو جسارت اور بدعت کا علمبردار کہنا چاہیے۔

پیسٹوا کے مقنن اور شاعر چینوسینی بولدی نے بھی ساتویں ہنری کی حمایت کی تھی۔ لیکن وہ قرون متوسط کے عام تصور سے آگے نہ بڑھ سکا کہ ہر دو اقتدار یعنے دنیاوی اور روحانی دونوں خدا ہی کی نمایندگی کرتے ہیں۔

اطالوی مقنن اپنی تالیفوں میں ارسطو کی تعلیمات پر اکتفا نہیں کرتے ہیں۔ بے شبہہ وہ ارسطو سے اسی طرح استفادہ کرتے ہیں جس طرح اکوبناس کے سینٹ ٹامس نے کیا تھا، لیکن وہ اس کے ماسوا قانون روما کی بھی پیروی کرتے ہیں۔ البتہ وہ اس بات کی احتیاط کرتے تھے کہ وہ انتہا پسندی تک نہ پہنچ جائیں۔

رومی تصور کے مطابق شہنشاہ کو ایک مذہبی حیثیت بھی حاصل تھی: وہ اعلیٰ ترین مذہبی افسر بھی تھا۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہ خیال ابتدائی عیسائی شہنشاہوں کے زمانوں میں بھی رہا۔ ماہرین قانون اس خیال کی حمایت کی جرأت نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر جینو کہتا ہے کہ پوپ اور شہنشاہ دونوں کے اقتدارات یکساں عظمت رکھتے ہیں۔ اور اس کی رائے میں ہر دو اقتداروں کا ماخذ ذات خداوندی ہی ہے۔ ان میں باہم فرق صرف یہ ہے کہ ہر دو کا دائرۂ عمل جدا جدا ہے۔

28

ان میں آپس میں جھگڑا زیادہ تر انسانی غلطیوں کی وجہ سے ہوا، نہ کہ ان کے اقتدارات ہی میں کوئی طبیعی اختلاف پایا جاتا ہو۔ کلیسا کو شہنشاہت پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ اسی طرح شہنشاہ کو بھی نہ چاہیئے کہ پوپ پر حکومت چلائے۔ پوپ کے احکام، مملکت کے معاملات میں قانون کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اسی طرح سرکاری کشوری قوانین، جو کلیسا کی آزادی میں مخل ہوں، قابل تعمیل نہیں ہیں۔ جینو کی رائے میں پوپ کو دنیاوی اقتدار حاصل نہیں ہے اور پوپ کے ہاتھوں تاجپوشی سے شہنشاہی عظمت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ شہنشاہ صرف اس لیے شہنشاہ ہوتا ہے کہ اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پوپ ہی کی طرح، اس کا بھی کوئی اعلیٰ تر افسر نہیں ہوتا: وہ شہنشاہت براہ راست خدا ہی سے حاصل کرتا ہے۔[1]

برائیس کا خیال ہے کہ ساتویں ہنری کے ساتھ اٹلی میں تاریخ شہنشاہت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "دانتے کی کتاب ایک قبر کا کتبہ کہی جاسکتی ہے نہ کہ کوئی پیشین گوئی"۔[2] چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں جو اطالوی مقنن پیدا ہوئے ان کی تالیفوں پر یہ بیان بدرجۂ اولیٰ صادق آتا ہے۔

سنہ ۱۳۵۴ء میں چوتھے شارل نے اپنی حماقت آمیز اطالوی مہم اختیار کی۔ ایک مورخ کہتا ہے: "ایسا نظر آتا تھا کہ وہ اٹلی کو ایک جنگی گھوڑے پر سوار نہتے لوگوں کے بیچ میں سے عبور کر رہا تھا، گویا کہ کوئی تاجر ہو جسے میلے کو پہنچنے کی جلدی ہو"۔

بارتولے اس کی حمایت کرتا ہے۔ مگر یہ کتنے افسوسناک نظریے ہیں۔

---

[1] ۔ بجیاپلی کی اطالوی کتاب "پستویا (پستوا) کے جینو کی سوانح عمری اور قانونی تالیفیں" صفحہ ۵۰ و مابعد۔

[2] ۔ برائیس کی انگریزی کتاب "مقدس رومی شہنشاہت" (فرانسیسی ترجمہ صفحہ ۳۴۵)

بارتولے خاموشی کے ساتھ قسطنطین کی عطا کو درست تسلیم کرتا ہے کیونکہ اسے "مقام مقدس" کا ڈر ہے۔ وہ اپنے مفادات کے لحاظ سے تو حامیان شہنشاہت سے تھا، لیکن وہ حامیان پوپ پر بھی حملے کی جسارت نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے طرز عمل کو یہ کہہ کر درست قرار دیتا ہے کہ پرانے الفاظ نے اب اپنے معنے کھو دیے ہیں۔ فریق بندی تبدیل ہو چکی ہے اور اب آداب برتاؤ کی ایک چیز رہ گئی ہے۔ وہ ہر اس شخص کو ملحد قرار دیتا ہے جو شہنشاہ کو دنیا کا آقا نہ تسلیم کرے اور اس نے اعلان کیا کہ قیصروں کا جانشین قانونوں سے بالا ہے۔ (اصل لاطینی میں:) "قانونوں سے آزاد" ہے۔ ان الفاظ کے باوجود یہ کہنے میں اسے کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کہ پاپائیت کو شہنشاہت پر برتری حاصل ہے اور یہ کہ شہنشاہت، پاپائیت کے دست نگر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محض انتخاب کافی نہیں۔ انتخاب سے منتخب شدہ شخص ایک آقا اور ایک عام سردار تو بنتا ہے، شہنشاہ نہیں۔ اس سے بڑھ کر اس نے یہ بھی کہا ہے کہ شہنشاہ کی جگہ خالی ہو تو کلیسا منصرمی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ اصل میں ایک پاپائی دعویٰ تھا اور بارتولے نے اپنی عظیم شہرت کی مدد سے اس کی تصدیق کی تھی جس طرح کہ اس نے شہنشاہوں کے دعووں کی بھی تصدیق کی تھی۔ اس نے چوتھے شارل کو کام کرتے دیکھا تھا۔ اور وہ بیان کرتا ہے کہ شہنشاہ مذکور محض بے زور ہے اور کوئی معنے نہیں رکھتا۔ مگر اس کے باوجود وہ شہنشاہت کے ہمہ گیر اقتدار پر ایمان لانے سے بھی ذرا نہیں ہچکچاتا۔ اور اس کی رائے میں فرانس کا بادشاہ تک شہنشاہ کی رعایا تھا۔ چنانچہ اس نے (لاطینی میں) کہا تھا: "میں یقین کرتا ہوں کہ فرانس کا بادشاہ شہنشاہ کی رعیت ہے[1]"

29

[1] کیا پلی کا اطالوی مضمون "بارتولے کے سیاسی تصورات" رسالہ آر کی فیو جوریدیکو ۱۸۸۱ء جلد (۲۷)

بارتولے اور بہت سے دوسرے اطالوی مقننوں نے شہنشاہت پسندانہ نظریے کی جو خاموش تائید کی اس کو ایک حد تک عملی اہمیت حاصل ہے۔ اس مشہور مقنن یعنے بارتولے نے کہا تھا: "جب تک شہنشاہت کو استقامت حاصل تھی، اس وقت تک تمام دنیا امن و امان سے بہرہ ور تھی جیسا کہ آگسٹس کے زمانے میں۔ اور جب شہنشاہت کو زوال آیا تو چو طرف ظلم وستم کا راج ہوگیا۔" اس برائی کا ایک علاج ہونا چاہیے۔ اور اس نے درد بھری آواز میں (لاطینی میں) کہا تھا کہ: "آج کل اٹلی میں ہر طرف مظالم کا دور دورہ ہے۔" دیگر ممالک کے مولفوں نے اتحاد کے لیے کوشش کی ضرورت اگر ظاہر کی تو ان کے ذہن میں بھی اس کے مماثل ملحوظات ہی رہے ہوں گے۔ اتحاد بے شبہہ اکثر "مقامی خود مختاری" کے خلاف ہوتا تھا۔ اگرچہ ابتداءً یہ تحریک جاگیرداری نظام کے خلاف اٹھی، جو نہ صرف بیحد کمینہ ہوگیا تھا، بلکہ اسی قدر تکلیف دہ اور ہولناک بھی بن گیا تھا۔ کیا قانون کا مقصد اعلیٰ یہ نہیں ہے کہ امن و نظام قائم کرکے آزادی سے بہرہ ور ہونے کا موقع پیدا کیا جائے؟ اور کیا اہل قانون کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ نظام قائم رکھنے کی خواہش کریں، خواہ کسی ذریعے سے؟۔

سترھویں صدی عیسوی کے وسط سے قریب زمانے میں آرتھر ڈک نے اس سوال سے بحث کی تھی کہ اپنی جنگوں اور اپنے قوانین میں رومیوں نے کس حد تک انصاف کو ملحوظ رکھا تھا۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جن قوموں پر رومیوں نے مظالم ڈھائے تھے، انھیں حق ہے کہ ہزار سال کے بعد اپنے سر سے جوّا اتار پھینکیں۔ آرتھر ڈک نے یہ رائے قائم کی کہ وہ لوگ بڑی سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ جرمنی کو یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ کھوئے ہوئے صوبے واپس کیے جائیں۔ یہ محض مفروضہ نہیں ہے بلکہ اس کے مماثل دعوے حقیقت میں پیش کیے گئے۔ مگر واقعات نے ان کی تائید نہ کی۔ اوتون اعظم وہ

آخری شہنشاہ ہے جس کی سرداری کو فرانس نے تسلیم کیا تھا۔ انگلستان میں یوں کہنا چاہیے کہ شہنشاہت پسندانہ نظریہ محسوس ہوئے بغیر گزر گیا۔ اور اگر علمی طور سے بعض واقعات سے بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ انگلستان کے متعلق بھی مقدس رومی شہنشاہت کے ماتحت ہونا معنوی طور سے مستنبط کیا جا سکے، تو حقیقت میں یہ ماتحتی عالم سیاست خارجہ کی ایک رسمی چیز تھی اور ایڈروڈ دوم کے مغرورانہ (لاطینی) اعلان کی کبھی تردید نہ کی جا سکی کہ: "انگلستان کی حکومت کو شہنشاہت کی ہر ماتحتی سے آزاد کرا دیا گیا ہے۔"

30

قسطیلہ کے دسویں الفونسو کی اسپینی کتاب "سات ارکان" میں بھی اس کے مماثل دعوے کیئے گئے تھے۔ اس نے خود کوشش کی تھی کہ شہنشاہ کا رتبہ اُسے حاصل ہو جائے۔ اس کتاب کے رکن دوم کی فصل اول میں جو دیباچہ اور قاعدہ بیان ہوا ہے اس میں لکھا ہے کہ "شہنشاہ کے لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی شخص کی بھی دنیاوی معاملات میں اطاعت کرے بجز پوپ کے۔" قاعدۂ پنجم میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ بادشاہ اپنی مملکت میں دنیاوی معاملات کی حد تک بالکل اسی طرح خدا کے نائب ہوتے ہیں جس طرح شہنشاہ اپنی شہنشاہت میں۔ اس کی شرح میں لکھا ہے کہ "بادشاہ اپنی بادشاہت میں حقیقت میں مقتدر اعلیٰ ہوتا ہے۔" دسویں الفونسو کے نظام کے مطابق بادشاہوں کو بھی وہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو شہنشاہوں کو بلکہ کچھ زیادہ ہی، کیونکہ یہ حق جانشینی کے باعث بادشاہ ہوتے ہیں، جب کہ شہنشاہ صرف اس لیے شہنشاہ ہوتا ہے کہ اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بادشاہ قلعے عطا کر سکتا ہے، شہنشاہ ایسا نہیں کر سکے گا کیونکہ اسے اپنی شہنشاہت بڑھانی چاہیے گھٹانی نہیں: (لاطینی میں) "وہ کیونکہ اسے چاہیے کہ اپنی سلطنت کو بڑھائے نہ کہ گھٹائے۔"

ایک بعد کے زمانے کے اسپینی ماہر قانون نے بیان کیا ہے کہ

اسپین کا بادشاہ اپنی مملکت میں مقتدر اعلیٰ ہے۔ اور ہر چیز اس کی ذات میں جمع ہوگئی ہے۔" (مگر یہی الفاظ اصل لاطینی میں)۔

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں فرقہ سینٹ آگسٹائن کے ایک پیرو اونورے بونے نے ایک طویل بحث یہ معلوم کرنے کے لیے کی ہے کہ "کوئی کیونکر اس خیال کی تائید کرسکتا ہے کہ سلطنت فرانس شہنشاہ کی رعیت نہ سمجھی جائے؟"۔ وہ اپنی تائید میں جو دلائل پیش کرتا ہے ان میں سے ایک کلیسا کا مفاد بھی ہے۔ بہت سے جھگڑے ہوتے رہے ہیں۔ جائز پوپوں کے خلاف (۲۲) بے ضابطہ پوپ بنے ہیں اور اکثر جائز پوپ کو فرانس میں پناہ لینی پڑی ہے۔ فرانس کے بادشاہ نے کبھی بھی کسی الحاد یا تفرقے کی تائید نہیں کی۔ اس کے بعد بونے کہتا ہے: "لیکن اگر میں بائبل کو سمجھ سکا ہوں تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بارہ سے زیادہ شہنشاہوں کے حالات میں یہ دیکھا ہے کہ وہ ملحد اور تفرقہ پسند تھے۔" فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" کے مولف (یعنی بونے) نے اپنے آپ کو انگلستان اور اسپین کے صرف اس طرز عمل کی حد تک جو شہنشاہت کے متعلق پایا جاتا تھا، محدود رکھا ہے۔ جہاں تک انگلستان کا تعلق ہے اس نے لیوک کے ڈومینیکن پادری تولومیو کی شہادت پیش کی ہے۔ یہ پادری غالباً اکویناس کے سینٹ ٹامس کی لاطینی کتاب "حکمرانوں کی رہبری" کے آخری حصے کا لکھنے والا بھی تھا اور اسی نے لاطینی زبان میں "جدید تاریخ کلیسا" اور کتاب "سنہ وار تاریخ" بھی تالیف کی تھی۔ وہ بیان کرتا ہے کہ انگلستان کلیسا کے ماتحت ہے۔ اور بونے کی رائے کے مطابق اس طرح انگلستان شہنشاہت سے علحدہ ہو جاتا ہے۔ رہا اسپین، سو بونے اس کے متعلق کسی فیصلے کے اظہار کی جرأت نہیں کرتا۔[1]

31

[1]۔ فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" مولفہ اونورے بونے باب (۸۳)

بہر حال اسی چودھویں صدی عیسوی کے آغاز پر بیبیر دِ بوا نامی ایک ماہر قانون نے ایک مغرورانہ نظریے کی تائید کی تھی۔ اس شخص نے یکے بعد دیگرے، پہلے ایڈورڈ اور "خوبصورت فلپ" کی ملازمت اختیار کی اس کا نظریہ یہ تھا کہ شہنشاہت ہمیشہ کے لیے اور ناقابل علیحدگی طور پر تاج فرانس کے ساتھ مرتبط ہو چکی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ سب لوگ اس خواہش میں متفق ہیں کہ تمام دنیا شاہِ فرانس کے ماتحت ہو جائے اور اس نظام العمل کو جامۂ عمل پہنانے، یعنے تمام دیگر حکومتوں کو ماتحت بنانے، کے لیے اس نے پاپائیت سے مدد لینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی۔ تقریباً اسی زمانے میں اوکام نے لکھا تھا کہ فرانس شہنشاہت سے الگ اور آزاد ہے۔ اس کی دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ تھی کہ تقسیم پانچ سو سال پہلے عمل میں لائی جا چکی ہے۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ اگر شہنشاہ اس کا حق رکھتا ہے کہ اپنی شہنشاہت کے لیے قوانین بنائے تو فرانس کا بادشاہ بھی اپنی بادشاہت کے لیے ایسا کر سکتا ہے وہ کہتا ہے کہ "حقیقت میں اس کے برخلاف ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ اگر ایسا ہونا ضروری سمجھا جائے کہ نئی صورتوں کے پیدا ہونے پر نئے احکام دئے جائیں، جیسا کہ پیش آتا رہتا ہے تو یہ احکام کون دے گا، اگر بادشاہ تک جو سب سے بڑا افسر ہے، ایسا نہ کر سکے؟"

بڑے ملکوں میں یہ خیال رائج رہا ہے کہ تاج شہنشاہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ خاصکر انگلستان کے قانون عمومی میں یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ انگریزی بادشاہت ایک شہنشاہت ہے اور تاج، شہنشاہ ہی کے لیے مخصوص ہے جیسا کہ پارلیمان کے مختلف قوانین اور خاصکر قانون نشان (۲۴) ہنری ہشتم کمیش نشان (۱۲) اور قانون نشان (۲۵) ہنری ہشتم کمیشن نشان (۲۸) میں اعلان کیا گیا ہے کہ بادشاہ سلطنت انگلستان کا افسر اعلیٰ ہے، نہ صرف معاملات ملکی میں بلکہ معاملات کلیسائی میں بھی۔ اس لیے کرۂ زمین پر وہ کسی کا ماتحت نہیں، نہ کسی اور انسان کا وہ

دست نگر، اور نہ ہی کسی کے سامنے جوابدہ۔

بلاکسٹن نے بیان کیا ہے کہ "جن قوانین میں شہنشاہت اور شہنشاہی کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ان کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ بادشاہ اپنے ممالک محروسہ میں اس سے کم خود مختار اور کم اقتدار اعلیٰ کا حامل نہیں ہے جتنا کوئی اور شہنشاہ اپنی شہنشاہت میں۔"

بعض ممالک میں بعض ذہین مولف یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بادشاہ کے خطاب میں کچھ ایسے عناصر بھی ہیں جو شہنشاہ کے خطاب سے برتر ہیں۔ چنانچہ ژاں ژدین نے "حکمرانوں کی جلالت" نامی فرانسیسی کتاب میں لکھا ہے کہ بادشاہ اپنی بادشاہت میں جو حیثیت رکھتا ہے اس سے بڑھ کر اور اس سے بلند تر دنیا میں کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اور وہ لکھتا ہے کہ حضرت مسیح ہمارے خداوند نے کبھی اپنے کو شہنشاہ نہیں کہلوایا بلکہ بادشاہ۔"

32

پوپوں کے مغرورانہ دعووں کی بھی ایسی ہی شدید مخالفت ہوتی رہی۔ دنیاوی طاقت اور مذہبی طاقت میں جو کشمکش ہوتی رہی اس کی تاریخ لکھنے کے یہ معنے ہیں کہ قرون متوسط کی آخری صدیوں کے متعلق جملہ سلطنتوں کی تاریخ لکھدی جائے۔[1] بہر حال کچھ معلومات ضروری ہوں گے۔

انگلستان کی حد تک ہم دیکھ چکے ہیں کہ ولیم فاتح نے پوپ کے دعووں کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔ پوپ دوسرے الگزانڈر نے اس کو اپنے اثر سے مدد دی تھی اور اسے انگلستان میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی تاکہ اس علاقے کو دوبارہ مقام مقدس یعنے پوپ کا مطیع بنایا جائے۔ لیکن جب پوپ ساتویں گرگری نے، جس نے

[1] فریڈ برگ کی جرمن کتاب "مملکت اور کلیسا کے حدود اور ان کی تعدی کے خلاف ضمانتیں" مطبوعہ ۱۸۷۲ء۔

اپنے پیشرو کی گفت و شنید میں حصہ لیا تھا، نئے بادشاہ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس سے بحیثیت ماتحت، اطاعت کا حلف لے، تو بادشاہ نے اس سے انکار کر دیا اور پادریانہ روح کو ٹھکراتے ہوئے اس نے اسقفوں کو روما جانے ہی کی ممانعت کر دی۔

کنٹربری کے اسقف اعظم کے انتخاب کے وقت جو جھگڑے پیدا ہوئے تھے، اس کے نتیجے کے طور پر پوپ تیسرے انوسنٹ نے انگلستان کے خلاف اپنا مانعتی حکم صادر کیا۔ اور بادشاہ کو جات باہر کرتے ہوئے رعایا کو اس کے حلف اطاعت سے بری قرار دیا۔ اسی طرح اس نے بادشاہ "جان بے علاقہ" کو تخت سے معزول قرار دیا اور اس کا تاج فلپ آگسٹس کو عطا کر دیا۔ جان اس سے ڈر گیا، اور اس نے ایک منشور میں تمام راسخ العقیدہ لوگوں کو مخاطب کر کے اعلان کیا کہ اس نے "انگلستان کی بادشاہت مع اس کے جملہ حقوق اور مقبوضات کے پوپ کے تفویض کر دیے ہیں، یہ کہ وہ اب سے اپنے متعلق کلیسائے روما کے خراج گزار کی حیثیت سے برتاؤ کرے گا، یہ کہ وہ انوسنٹ اور اس کے جانشینوں کی مکمل اطاعت کا حلف اٹھاتا ہے۔ اور یہ کہ اپنی ماتحتی کی علامت کے طور پر وہ ایک سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا۔" پوپ نے اس کو دوبارہ بحال کر دیا اور چاہا کہ اس کی مدد کرے جب کہ ملک کے امراء نے ہتھیار اٹھا کر اس سے مطالبہ کیا کہ قومی آزادیوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ ان واقعات سے جو سبق ملا وہ یہ تھا کہ انگلستان کے امراء ہوں کہ انگلستان کے پادری، کوئی بھی بادشاہ کی اندھی اطاعت کے لیے آمادہ نہ تھا۔

اس کے بعد کے دور میں "مقام مقدس" نے انگلستان کو پوپ کا ایک صوبہ قرار دیا اور پوپ کے بھیجے ہوئے نائب یہ دعویٰ کرتے رہے کہ انھیں وہاں اعلیٰ ترین اقتدار حاصل ہے۔ اور پوپ نے

اس ملک پر بوجھل خراج عائد کر دیا۔ لیکن روما کے مطالبات سے ایک عام مخالفت پیدا ہو گئی اور پہلے ایڈورڈ کو اپنی پارلیمان میں ایک ٹھوس تائید اس غرض کے لیے حاصل ہو گئی کہ پوپ آٹھویں بونی فاس کی بات کو مسترد کر دے جو چاہتا تھا کہ بادشاہ کو مجبور کر کے اس سے یہ تسلیم کرالے کہ اس کو اسکاٹ لینڈ پر جو حقوق حاصل ہیں وہ پوپ ہی کو حاصل ہیں۔ دوسرے ایڈورڈ کے زمانے میں روما نے ایک آخری کامیاب کوشش کی بادشاہ نے اس کو تسلیم کرلیا کہ خراج کی ادائی واجب ہے۔ لیکن جب ۱۳[illegible]ء میں پوپ پانچویں اربان نے (۳۵) سالہ خراج کے جو اواطلب رہ گیا تھا، مطالبے کی جسارت کی تو تیسرے ایڈورڈ نے اس کو ماننے سے انکار کیا اور اس بارے میں بھی وہ قوم کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔

33

ایک فرانسیسی مولف نے ان امتیازی خصوصیات کو نمایاں کیا ہے جو فرانسیسی قانون یا پارلیمان میں اور فرانسیسی اسقفیت میں اور فرانسیسی بادشاہت میں پائے جاتے ہیں۔ قانونی یا پارلیمانی فرانسیسیت نہیں چاہتی تھی کہ آیندہ سے کلیسائی یا کشوری انصاف روا رکھے، اور پوپ سے مرافعہ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اسقفی فرانسیسیت کی حالت کچھ اور ہی تھی، اور شاہی فرانسیسیت کی کچھ اور ہی۔ آخرالذکر کا ایک بلند مرتبہ ہے یعنے "مملکت اپنے گھر میں آقا سمجھی جائے"۔۔ اس کے نظریے کا یہ پہلا جملہ ہے ـــــ اور یہ کہ "مملکت کا مظاہرہ بادشاہ کی شخصیت میں ہوتا ہے"، اور یہ اس کے نظریے کا دوسرا جزء ہے[1]۔ بادشاہ کو جو مطلق العنان اختیار حاصل تھا، وہ ایک سہ گانہ

[1]۔ آنوتو کے دیباچے اور تعلیقات کے ساتھ چھپا ہوا فرانسیسی "مجموعۂ ہدایات جو فرانس کے سفیروں اور ایلچیوں کو حلتہائ وییٹ فالیا سے انقلاب فرانس تک دیے جاتے رہے" مطبوعۂ روما ۱۸۸۸ء صفحہ ۴۔

حیثیت میں پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ سیاسی نقطۂ نظر سے اندرونی معاملات میں حکومت نہایت انتہائی استبدادیت پر مشتمل ہوگئی۔ کلیسا اور مملکت کے تعلقات کے نقطۂ نظر سے تاج کے حقوق کی حمایت انتہائی جوش اور سرگرمی سے کی گئی۔ اور دیگر بین الممالک نقطۂ نظر سے، اکثر اس خواہش میں کہ فرانس کے بادشاہ کو ایک بلند مرتبہ دلایا جائے مولفین بالآخر قانون بین الممالک کی نفی تک پہنچ گئے۔

پوپ آٹھویں بونی فاس اور بادشاہ "خوبصورت فلپ" میں جو کشمکش ہوئی اس سے پہلی مرتبہ کلیسا اور مملکت کے تعلقات کی علمی بحث کا موقع پیدا ہوا، ورنہ اس سے پہلے ناکمل مباحث شایع ہوتے رہے۔ اب ہم مکمل تالیفوں سے دوچار ہوتے ہیں، جو صرف اس بات تک محدود نہ تھیں کہ مشہور و معروف نظریوں کو دہرادیں بلکہ نئے نظریے بھی پیش کیے جانے لگے۔ فرانس کی بادشاہت میں اور پوپ میں جو جھگڑا چھڑا، اس کا اختتام اول الذکر کی کامیابی کے ساتھ ہوا۔ اور یہ پوپ گیارھویں بے نوا اور خاصکر پوپ پانچویں کلیمان کے دور کا واقعہ ہے۔ اور پاپائیت ستّر سال تک تاج فرانس کی ماتحت ہوجاتی ہے۔ اس کشمکش کے زیادہ دیرپا نتائج بھی نکلے۔ چنانچہ اس کے باعث فرانس کا اتحاد مستحکم ہوگیا اور جب ۱۰ اپریل ۱۳۰۲ء کو پاریس کے گرجائے نوتردام میں "نمایندگان عمومی" (یعنے پورے ملک کے نمایندگان کلیسا اور نمایندگان امراء اور مابقی تہائی مملکت کے نمایندوں) نے اجتماع کیا اور بادشاہ کے جائز حقوق کی تائید کی تو کہنا چاہیے کہ پہلی مرتبہ پورے فرانس نے ایک ہی طرح سوچا اور ایک قومی خیال وجود میں آیا۔

مختلف سیاسی تالیفیں بھی اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ ان میں سے ایک سلسلۂ سینٹ فرانسس کے مشہور مرید و معتقد ولیم آدکام کی تالیف ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ مشہور حقیقت پسند ڈنس اِسکاٹ کا شاگرد تھا، جس کے جملہ

قوم خود کو کبھی اقتدار اعلیٰ سے محروم نہیں کر دیتی بلکہ اس کے برخلاف قوت تنفیذی اسی کے ماتحت ہوتی ہے اور قوم ہی کو حق ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا انتخاب کرے جو اس بات پر مامور ہوتے ہیں کہ قانون کو نافذ کریں 39 اسی بنا پر قوم ہی کو حق ہوتا ہے کہ ان کارکنوں کی جانچ کرے اور ان کو بدلے یا معزول کرے جو اپنے فرائض کی انجام دہی سے قاصر رہیں۔[1]

مارسیلیے اور تراں دیلوں کے تراں نے اقتدار اعلیٰ کا جو نظریہ پیش کیا وہ قدیم یونان ہی کا نظریہ ہے۔ چنانچہ: "کسی مملکت میں صرف ایک مقتدر اعلیٰ قوت ہوتی ہے۔ اور ایک سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتی۔ اگر متعدد ہوں تو نہ تو قوانین ممکن ہوں گے، نہ حکومت، نہ انصاف۔ دو اشخاص یا دو اجساد کو اقتدار اعلیٰ دیدیجئے تو ایک جس چیز کی خواہش کرے گا تو دوسرا اس کو نہیں چاہے گا۔ ان دونوں میں سے کس کی اطاعت شہریوں کے لیے ضروری ہوگی؟ اگر ان دونوں کے قوانین باہم متضاد ہوں تو کس کو ترجیح ہوگی؟ اگر ہر ایک کو اختیار سماعت کا حق ہو تو ایک ہی شہری ایک ہی بنائے نالش پر ایک ہی وقت دو مختلف عدالتوں میں بلایا جاسکے گا۔ اب وہ کس عدالت کے سامنے حاضر ہو؟ کیا دونوں کے سامنے یا کسی کے سامنے بھی نہیں؟ نظریے کی حد تک یہ چیز لغو ہوگی، تو واقعے کی حد تک نراج پیدا ہوگا۔ اور سماج ختم ہو جائے گا۔"[2]

وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں: مذہب، تصور اقتدار کے ایک منافی چیز سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ "حقیقت میں اقتدار کے ساتھ ضمنی طور پر جبر کا ہونا سمجھا جاتا ہے۔ اور مذہب اور جبر دو ایسے تصورات ہیں جو ایک دوسرے کے منافی ہیں...... جبر کرنے کا

---

[1] پاول ژانے کی فرانسیسی کتاب "اخلاقی اور سیاسی فلسفے کی تاریخ" جلد (۱) صفحہ (۴۴۳) و مابعد۔

[2] لوراں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد (۶) باب پاپائیت و شہنشاہیت صفحہ ۱۱۴ و مابعد اور اسی مولف کی فرانسیسی کتاب "کلیسا و مملکت" جلد (۱) صفحہ ۲۴۴)۔

اقتدار یا سزا دینے کی طاقت صرف مملکت کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کو کلیسا کے تفویض بھی کردے تو کلیسا اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا کیونکہ کلیسا جبر استعمال نہیں کر سکتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ کلیسا کو کوئی حقیقی دنیاوی اقتدار حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ انجیل ایک تعلیم کا نام ہے۔ اگر طبیب یہ تعلیم دیتا ہے کہ صحت کی کس طرح حفاظت کی جائے اور کس طرح اسے بحال کیا جائے تو کیا اس کی بنا پر طبیب کو زندگی اور موت کا اختیار حاصل ہو جائے گا؛ پادری روح کا طبیب ہے اور اُسے موت اور حیات ابدی کے متعلق طبیب دنیاوی سے زیادہ اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا!"۔

کتاب "حامئ امن" کے مولف بالکل یہ بات پسند نہیں کرتے کہ ایمان کے مسائل میں مادی جبر کام میں آئے؛ اس طرح وہ کشوری رواداری تک پہنچ جاتے ہیں۔ ملحد ہوں کہ غیر مذہب والے، صرف خدا کے سامنے اور وہ بھی آیندہ زندگی میں جوابدہ ہوں گے۔ اور پادری کا صرف یہ کام ہے کہ ان کو متنبہ کردے اور ان کو ان کے انجام سے پیش آگاہی بخش دے۔" اگر کشوری قانون ہمیشہ معقولیت کے مطابق رہے" تو الحاد اور غیر مذہب کی پابندی کے باعث کبھی کسی کو مادی سزائیں نہ دیجا سکیں گی۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے" اور ایسا پیش آتا رہتا ہے کہ کشوری قانون غیر مذہب والوں کو ملک میں آنے کی ممانعت کر دیتا ہے، لیکن ایسی صورت میں پادری کو کوئی حق نہیں ہوتا کہ اس کے متعلق کوئی رائے دے۔ کشوری حاکم عدالت سزا صرف اس لیے دیتا ہے کہ مملکت کے ایک قانون کی خلاف ورزی عمل میں آئی ہے!"

مارسیلے اور ژاں دیوں کا ژاں اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ پوپوں کو کوئی خدائی حق پہنچتا ہو اور وہ سینٹ پیٹر کی اولیت کو نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: کوئی اس کو ثابت نہیں کر سکتا کہ وہ [سینٹ پیٹر] روما میں رہا ہو۔" ان مولفوں کی رائے کے مطابق حواریوں کے سردار یعنے حضرت مسیح کو جو تقدم تسلیم کیا جاتا ہے

40

وہ ان کی عمر [؟ان کے زمانے] اور ان کے ایمان کی برتری کے باعث تھا۔ کتاب "حامئ امن" کے مولف یہ بھی کہتے ہیں کہ کلیسا کی غرض یہ نہیں ہے کہ اس دنیا کے معاملات کا انتظام کرے۔ اس کو تو حیات ابدی کے سوا کسی اور چیز میں مشغول ہونے کا حق نہیں۔ اور حیاتِ دنیوی "مملکت" کے دائرۂ عمل میں داخل ہے۔ پادری، چاہے وہ کوئی ہو، اگر ناجائز طور سے یہ اختیار حاصل کرلے کہ حلفِ اطاعت سے کسی کو بَری کرے تو، ایسا پادری حضرت مسیح کے لائے ہوئے دین کی خلاف ورزی کرتا ہے اور الحاد کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ دنیاوی قانون ساز کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ کسی کو اُسقف مقرر کرے، کسی کو پوپ بنائے، اور اسقفوں کی اسی طرح جانچ کرے جس طرح علاقۂ یہودیہ کے گورنر پیلاطس نے یسوع مسیح کے متعلق کیا تھا۔ دنیوی قانون سازان کو معزول کرسکتا ہے، مجالسِ شورائے مذہبی کو طلب کرسکتا ہے، اور ان کی صدارت کرکے ان کی کارروائیوں کا انتظام کرسکتا ہے۔ اسقف سب برابر ہیں۔ شہنشاہ کو یہ حق حاصل ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسروں پر ترقی دے۔ اور یہ ترقی منسوخ بھی کیجاسکتی ہے۔

پوپ چھٹے کلیمان نے ۱۰ر اپریل ۱۳۴۳ء کو ایک تقریر کی تھی جس میں اس نے کہا تھا کہ "ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے مارسیلیے سے بڑھ کر کسی بڑے ملحد کی کوئی چیز نہیں پڑھی ہے۔" یہ اس بات کو تسلیم کرنا تھا کہ کتاب "حامئ امن" کے مولفوں کے وار کس قدر شدید تھے۔ کلیسا کے اقتدار سے شاذ ہی کبھی اس سے زیادہ صاف و صریح طور پر انکار کیا گیا ہو، اور شاذ ہی اس سے زیادہ ٹھوس استدلال نے پادریانہ دعووں کی لغویت کو واضح کیا ہو۔ اس کتاب نے رائے عامہ پر عظیم الشان اثر ڈالا۔ اس کی اشاعت ہی کے زمانے میں اس کا ایک فرانسیسی ترجمہ شایع ہوگیا۔ پھر ۱۳۷۶ء میں پاریس میں ایک تحقیقات یہ دریافت کرنے کے لیے شروع ہوئی کہ ایک خاص ترجمہ کا

مولف کون ہے؟ لیکن مجرم کا نام، جو یقیناً جامعہ کا ایک رکن ہی تھا" گمنام ہی رہ گیا ہے[1]۔ اس کے بہت دنوں بعد ۱۵۳۵ء میں لندن میں ولیم مارشل نے لاطینی سے اس کا انگریزی ترجمہ کر کے "حمایت امن" کے نام سے چھپوایا اور ۱۵۴۵ء میں جرمنی میں بازاری زبان میں اس کا ایک خلاصہ چھپا۔ اسی اثنا میں نظام پاپائیت نے پوری کوشش کر کے ایک ایسی کتاب کے مخطوطوں کو تباہ کرایا جس کے مولفوں کو ایک فرمان پوپ نے جات باہر کیا تھا اور جس کی مندرجہ باتوں کو الحاد قرار دیا تھا۔

اوکام نے اپنی باری پر کشوری اقتدار کی حمایت شروع کی۔ اس کی زندگی کے اس زمانے کی تالیفیں اکثر اور اہم ہیں۔ کچھ تو بائیسویں جان، بارھویں بے نوا، اور چھٹے کلیمان کے خلاف ہیں؛ اور کچھ اس غرض سے تالیف ہوئی ہیں کہ کلیسا اور مملکت کے تعلقات کا مسئلہ واضح کیا جائے۔ چنانچہ حسب ذیل لاطینی کتابیں اسی زمرے میں شامل ہیں: نوّے دن کی کتاب، بائیسویں جان (یوحنّا) کی غلطیوں کے متعلق"، "بائیسویں جان کی غلطیوں کا مجموعہ"، "مدافعتی خط"، "آٹھ مسائل کے فیصلے"، اور "مکالمہ جس کے تین ممتاز حصے ہیں: پہلا ملحدوں کے متعلق، دوسرا بائیسویں جان کی غلطیوں کے متعلق، تیسرا پوپ اور مجالس شورائے کلیسا اور شہنشاہ کے اقتدارات کے متعلق"۔

یہ آخری تالیف بہت بڑی ہے لیکن اس کے متعدد حصے خاص کر وہ جو پوپ کے اقتدار اور مجالس شوریٰ اور شہنشاہ سے متعلق تھے، ضایع ہوگئے ہیں۔ یہ غالباً ۱۳۴۲ء اور ۱۳۴۳ء میں شہنشاہ کی خواہش پر تالیف کی گئی تھی[2]۔

---

[1] کلیتور ابلبرک کی فرانسیسی کتاب "چودھویں صدی عیسوی کی ادبی تاریخ پر مقالہ" جلد (۱) صفحہ ۷۰۵۔

[2] پاول ثرانے کی کتاب مذکورۂ بالا جلد (۱) صفحہ ۱۹۰ تا ۲۱۳۔ ہرتسوگ، پلیتت، اور نائوک کی جرمن تالیف

مملکت کے حدود سے باہر اور اس کے قوانین سے بالا سمجھا جائے۔"
یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اوکام، پادوا کے مارسیلیے، ژاں دیوں کے ژاں اور ان مولفوں نے جنھوں نے ان کی پیروی کی، انھوں نے حقیقت میں زمانہ حال کے مجددین کی راہ تیار کی۔ چنانچہ انھوں نے قانون کو خاص دنیوی اور غیر مذہبی چیز بنانے اور قانونی اداروں سے تمام مذہبی تصور کو خارج کرنے کی تبلیغ اور تیاری کی؛ اور انھوں نے دعویٰ کیا کہ "قانون کی حکومت صرف اسی دنیا سے متعلق ہے۔" جب ان کے نظریے مان لیے گئے تو کشوری معاملات میں رواداری کا دور دورہ ہوگیا۔

ان لوگوں کے خیالات پھیلتے گئے اور فرانس میں چودھویں صدی عیسوی کے اختتام پر "ورژیے کا خواب" نامی ایک فرانسیسی کتاب شایع ہوئی۔ اس نے عرصے تک ایک بہت بڑا اثر ڈالا۔ فرانسیسی اسے قیمتی یادگار سمجھتے ہیں، جس میں ان کے دعووں کو درست قرار دینے والی شہادت اور ان کی "آزادیوں" کو تقدس دینے والا مواد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ متعدد اہم نکات اور خاص کر کلیسا اور مملکت کے تعلقات کے مسئلے کے متعلق وہ اوکام کی تالیفوں اور لاطینی کتاب "حامیٔ امن" ہی کے خیالات کی ترقی یافتہ صورت اور اکثر تقریباً لفظی ترجمے پر مشتمل تھی۔ اسلوب کی حد تک بھی وہ غیر مذہبی سماج کے پرجوش حامیوں کی تالیفوں سے نرم تر ہے۔

باویریا کے شہنشاہ لوئیس کے دور میں پوپ کی برتری کے مسئلے پر پرجوش بحث ہوتی رہی۔ شہنشاہ کا پوپ بائیسویں جان سے جھگڑا چھڑا ہوا تھا۔ اور فرانسسکن سلسلے کے پادری شہنشاہ کے حلیف بنے رہے۔

37 تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز پر عیسائیوں کے ہاں مذہبی فقیروں کے دو بڑے سلسلے قائم ہوئے تھے۔ ان میں سے سلسلۂ ڈومینیکن نے

مذہبی تبلیغ میں اپنے کو مشغول کرلیا اور ملحدوں سے مقابلہ کرتا رہا۔ دوسرا سلسلہ فرانسسکن پادریوں کا تھا جس نے وعظ اور تعلیم میں حصہ لینے کو ترجیح دی۔ خاصے ابتدائی زمانے ہی سے جامعات پاریس و آکسفرڈ میں ان دونوں سلسلوں کے پادری تعلیم دیتے نظر آتے ہیں اور قرون متوسطہ کی علمی تحقیقات کے اعلیٰ ترین ماہروں میں شمار ہوسکتے ہیں۔ البرٹ اعظم، بوئثے کا ئیں سان، سوسے کا ہنری، آکوینا س کا ٹامس، ڈومینکن سلسلے کے درخشاں ترین ستارے ہیں۔ روجر بیکن، ڈنس اسکاٹ اور اوکام عیسائی روحانی تعلیم (سیسرافیک) کے علمبردار ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز پر حضرت مسیح کی غربت کے متعلق غربت محض کی ضرورت پر یقین رکھنے کا مسئلہ تقریباً پورے فرانسسکن سلسلے کو ہمنوا بنا چکا تھا۔ پاپائیت نے اس نظریے کے خلاف فیصلہ صادر کیا اور اس نے بکثرت راہبوں کے خلاف الحاد کے شبہے پر کارروائی اختیار کی۔ اور اس طرح آسیس کے فرانسس کی پیروی کرنے والے رفتہ رفتہ مقام مقدس یعنے پاپائیت کے مخالفین کی صف میں شامل ہو گئے۔

۱۳۲۳ یا ۱۳۲۴ء میں بعض چھوٹے پادری باویریا کے لوئیس کے دربار میں حاضر ہوئے۔ ان میں غالباً علاقۂ لیوک کا فرانسس بھی شامل تھا اور شاید کاسال کا اوبر تینو بھی، جس نے کچھ ہی عرصے پہلے سلسلۂ سینٹ فرانسس کو چھوڑ کر سلسلۂ سینٹ بے نوا میں شرکت اختیار کرلی تھی۔ اس کے بعد بعض مشہور مولف بھی آئے جیسے ژاں دیلون کا ژاں اور پاڈووا کا مارسیلیے۔ ان کے بھی کچھ عرصے بعد سیزین کا میشل، ولیم اوکام اور برگامے کا بونا گراد زیا بھی۔

ژاں دیلون کے ژاں نے گرجا کے پادری کی خدمت حاصل کرلی۔ مگر اس کا تعلق سلسلۂ فرانسسکن سے ذرا بھی نہ تھا۔ وہ ڈنس، اسکاٹ کا شاگرد تھا اور جامعۂ پاریس میں مشہور پروفیسر بنا۔

اس کے اسلوب اور عادات تعلیم کے لحاظ سے وہ ابن رشد کا پیرو معلوم ہوتا ہے۔ مارسیلیے کا تعلق پادوا کے ریمندینی کے خاندان سے تھا اس نے فلسفے کی تعلیم اپنے پیدائشی شہر میں حاصل کی اور ایک پادری بن گیا۔ آیا اس نے بعد میں جامعہ اورلیاں میں قانون کی بھی تعلیم حاصل کی تھی؟ یہ چیز واضح نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن ۱۳۱۲ء میں وہ جامعہ پاریس کا مودب اعلیٰ (ریکٹر) نامزد ہوا۔ وہ دینیات، مذہبی قانون اور طب کی تعلیم دیتا رہا۔ عام طور سے یہ یقین نہیں کیا جاتا کہ وہ سلسلۂ سینٹ فرانسس میں شریک ہو گیا ہو۔ لیکن وہ اس سلسلے کے متعدد ممتاز ارکان کے اثرات سے ضرور متاثر ہوا تھا، اور خاص کر اوکام تو اس کی ذہنیت پر واقعی چھا گیا تھا۔

جب پوپ بائیسویں جان اور باویریا کے لوئیس میں جھگڑے چھڑ گئے تو ان ممتاز لوگوں کی، جن کا ہم ابھی ذکر کریں گے، نظروں کا اس اہم مسئلے پر مبذول ہو جانا ناگزیر تھا کہ کلیسا اور مملکت میں کیا تعلق ہو؟ اسے یاد رکھا جائے کہ اوکام، خوبصورت فلپ اور پوپ آٹھویں بونی فاس کے جھگڑے میں حصہ لے چکا تھا اور جامعہ میں ابھی تک وہ خیالات تازہ تھے کہ کس طرح ۱۳۰۳ء میں وہ مجبور ہوا تھا کہ بادشاہ کا ساتھ دے اور پوپ کے فیصلوں کا مرافعہ مجلس شورائے عمومی میں کرے۔

مارسیلیے نے ژاں ویوں کے ژاں کے ساتھ مل کر لاطینی میں کتاب "حامیٔ امن" تالیف کی تھی۔[1]

یہ دونوں مولف قدیم یونان پر اپنے کو مبنی کرتے ہیں۔ اور وہ محض برائے نام عیسائی ہیں۔ چنانچہ مارسیلیے کے متعلق نوراں نے اس چیز کا ذکر کر دیا ہے۔ اس بہادر مقابلہ کرنے والے میں یونانی

[1] یہ کتاب گولداسٹ کی مذکورۂ بالا تالیف جلد (۲) صفحہ (۱۵۴) و مابعد میں شامل ہے۔

خصوصیات کا پایا جانا اور اس کے ذہنی خیالات کا ارسطو پر مبنی ہونا ایک ایسا مسئلہ ہے جسے خود سولھویں صدی عیسوی کے ایک کیتھولک مولف نے محسوس کرلیا تھا۔ ہماری مراد ہالینڈ کے البرٹ پگے سے ہے جس نے لکھا تھا کہ یہ "عیسائی سے زیادہ ارسطا طالیسی شخص تھا"۔ ژاں دیلوں کے ژاں کو اس کے پیروؤں نے "بادشاہ فلسفہ" اور "حکمراں فلسفہ" کے شاندار خطاب عطا کیے تھے۔ اس نے "سوالات" اور "شروح" نامی کتابیں لاطینی میں تالیف کی تھیں۔ اس کی کتاب "شروح" ارسطو کی کتاب "اِستاجِریت" کی شرح ہے۔

کتاب "حامیٔ امن" کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ امن اور اتحاد انسانی سماج کا سب سے بڑا خزانہ ہیں اور خاص کر ہر جماعت کے لیے۔ اور یہ کہ اس امن اور اس اتحاد کے بہت سے دشمن ہیں جن میں سب سے بڑا دشمن پاپائیت ہے۔

اس تالیف کے تین حصے ہیں: پہلے میں دستور مملکت کی بنیاد، آغاز اور غرض و غایت سے بحث ہے۔ حصۂ دوم میں کلیسا اور مملکت کے تعلقات سے بحث ہے۔ اور حصۂ سوم میں پہلے دونوں حصوں کا خلاصہ (۴۲) بنیادی قاعدوں کی صورت میں کیا گیا ہے۔

مارسیلے اور ژاں دیلوں کے ژاں نے قوم کے اقتدار اعلیٰ کا اصول ثابت کردیا اور ان کی رائے میں حقیقی مقنن یا مقتدر اعلیٰ قوم ہی ہوتی ہے، یعنے یا تو جملہ شہری یا ان کا وہ حصہ جسے سب لوگ منتخب کریں۔ "مملکت" آزاد انسانوں کا ایک سماج ہے۔ اور اسی لیے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ کوئی ایک یا چند اشخاص اپنے خانگی [یا سرکاری، مترجم] اقتدار سے قانون بنائیں ورنہ وہ باقی تمام لوگوں کے آقا ہو جائیں گے۔ یہ کہ لوگوں نے اپنے آپ کو ایک کشوری سماج میں مجتمع کرلیا ہے تاکہ اس طور سے فائدہ اٹھا سکیں، اس چیز کو حاصل کرسکیں جو ان کی بقا کے لیے ضروری ہو، اور اس چیز سے بچ سکیں جو اس کے خلاف ہو۔

نظریات کی اس نے بعد میں بڑی قوت سے تردید کی۔ اغلب یہ ہے کہ وہ پارلیس میں پادری رہا ہو۔ اسی شہر میں اس نے اپنی لاطینی کتاب لکھی جس کا نام "اختلاف مابین اقتدار صدر کلیسا و سلاطین ارضی جیسے ایک پادری اور سپاہی کے مکالمے کے طور پر مرتب کیا گیا ہے" تھا۔ اس کتاب میں اس نے ایک حیرت انگیز جولانیٔ طبع سے اس خیال کی حمایت کی تھی کہ کشوری اقتدار کو کلیسائی اقتدار پر برتری حاصل ہے۔

جیسا کہ کتاب کا نام "اختلاف" بتاتا ہے کہ یہ اختلاف ایک پادری اور ایک فوجی افسر کے مابین پیدا ہوتا ہے۔ اس مشہور فرانسسکانی پادری نے فوجی افسر کے منہ میں جس قطعی انداز کے الفاظ ڈالے ہیں اس کا ایک نمونہ یہ ہے:۔ "کلیسا کو ذرا بھی اس کا حق نہیں کہ وہ دنیاوی معاملات کا فیصلہ کرے۔ اور اگر وہ اس گمراہی کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جسے بائبل نے ملعون قرار دیا ہے، تو ایک چیز یقینی ہے۔ وہ یہ کہ اس پر ایک بجا عذاب نازل ہوگا۔"

یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی اور شہر آنانی میں وہ المناک منظر پیش آیا جس میں شارا کولونا اور نوگارے نے پوپ آٹھویں بونی فاس کی توہین کی تھی، اور جس میں کہتے ہیں کہ بد مزاج سپاہی نوگارے نے اپنی زرہ کے فولادی کڑے سے جانشین حضرت مسیح کو مارا تھا۔

سلسلۂ فرانسسکان کے مورخ واڈنگ نے اوکام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ ایک زندہ ذہانت کا مالک شخص تھا، لیکن مزاج میں اعتدال نہ پایا جاتا تھا۔ وہ اس سے زیادہ معلوم کرنا چاہتا تھا جو مناسب ہو۔ اس کو اس کا تک ڈر نہ تھا کہ آسمان کو مبارزت (چیلنج) دے، اور پوپ کے مرتبے کا استحقاق کرے اور شہنشاہ کے مرتبے کو حد سے زیادہ چڑھا دے۔" حقیقت میں اوکام کے نظریوں کی جسارت بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اس نے حضرت مسیح کی آمد کی غرض و غایت انسان کے صرف روحانی مفادات تک محدود قرار دی ہے۔ اور اس نے

لکھا ہے کہ: "مسیح کو ہرگز اس غرض کے لیے مقرر نہیں کیا گیا تھا کہ وہ بادشاہوں کے جج اور محتسب (سینسر) بنیں۔ اور ضرورت ہے کہ کلیسا سے پوپ کے ہمہ گیر اقتدار کی تائید کرنے والوں کو نکال باہر کیا جائے"

جس زمانے میں اوکام نے اپنی کتاب "اختلاف" شائع کی، اسی زمانے میں ایک اور کتاب شائع ہوئی جس کا مولف ژان نامی ایک ڈاکٹر دینیات اور سلسلۂ سینٹ فرانسس ہی کا ایک رکن تھا۔ پاریس کا ژان، سوربون یعنے جامعۂ پاریس میں درس دیتا تھا۔ اوکام ہی کی طرح اس نے بھی بادشاہت کی خود مختاری کی حمایت کی۔ اس موقع پر شاید یہ امر ملاحظے میں لایا جاسکتا ہے کہ فرانسسکن پادریوں کا سلسلہ ہمیشہ ہی پاپائیت کا مخالف نظر آتا رہا اور اس کے برخلاف ڈومینیکن پادریوں کا سلسلہ ہر جگہ اور ہر موقع پر پاپائیت کی حمایت کرتا رہا۔

پاریس کا ژان صرف بادشاہت کی تائید ہی میں بحث نہیں کرتا بلکہ اسے قسطنطین کے عطیے سے بھی اختلاف ہے۔ اس دستاویز کا ہم ذکر (صفحہ 23 پر) کرچکے ہیں اور قرون متوسط کی پوری تاریخ میں ہم کو جس کا جو بظاہر احترام کیا جاتا نظر آتا ہے، اس کی یہ دستاویز قابل ذکر شہادت ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرضی دستاویزیں بنائی جاتی تھیں اور جلسازی کا ارتکاب کیا جاتا تھا تاکہ جو دعوے کیے جاتے تھے ان کی تائید کیجا سکے۔

پاریس کے ژاں سے پہلے بھی لوگوں نے قسطنطین کے عطیے پر اعتراض شروع کردیا تھا۔ چنانچہ ۹۹۹ء میں تیسرے اوتون نے اس دستاویز میں جو اضافے کیے گئے، ان کی تردید کی تھی۔ بارھویں صدی عیسوی میں ٹی تربہ کے گوڈفرائے نے جو شہنشاہ کا حاجب تھا، یہ بیان کیا تھا کہ دستاویز عطیہ پر تنقیدیں ہوتی رہی تھیں کیونکہ بائبل میں اس بات کی مخالفت ہے کہ کلیسا اقتدار اعلیٰ کا استعمال کرے، اور یہ کہ حضرت یسوع مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا تھا کہ "جو چیز قیصر کی ہے

وہ قیصر ہی کو دیدو۔" اگرچہ پاریس کے ژاں نے اس دستاویز کی اصلیت پر اعتراض نہیں کیا ہے لیکن اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ نافذ ہونے کے بالکل قابل نہیں۔ اس کی دو دلیلیں قابل ذکر ہیں: "جیسا کہ شرح میں بیان کیا گیا ہے شہنشاہ کو اس لیے آگسٹس کہا گیا ہے کہ اس کا فریضہ یہ ہے کہ مملکت کی عظمت میں اضافہ کرے، نہ کہ گھٹائے۔ اور آخر میں یہ کہ شہنشاہ اصل میں شہنشاہت کا محض ایک انتظام کرنے والا شخص ہے۔" اس کے اپنے الفاظ لاطینی میں یہ ہیں "جو شہنشاہ آگسٹس کہلاتا ہے اس کا ہمیشہ یہ فرض ہے کہ مملکت کو بڑھائے نہ کہ گھٹائے"۔[1]

وائیکلف نے بھی قسطنطین کے عطیے کو برا بھلا کہا ہے، اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ کلیسا کے حق میں ایک زہر ہے کیونکہ اگر پادریوں کو دولت ملے تو ان کے بگڑنے کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "امراء کو یہ حق ہے بلکہ ان کا یہ فریضہ ہے کہ پادریوں سے وہ دولت چھین لیں جس کا وہ بے جا استعمال کرتے ہیں"۔[2] پندرھویں صدی عیسوی سے گزرتے ہوئے ہمیں یہ نظر آئے گا کہ لورینزو ویلا ؔ ڈالا نے ۱۴۴۳ء میں اطالوی میں ایک کتاب تالیف کی۔ اس کا عنوان تھا "قسطنطین کے غلط اور جھوٹے عطیے کی تردید"۔ اس کتاب میں اس نے ثابت کیا تھا کہ قسطنطین کا عطیہ خرافات پر مبنی اور غیر متحقق ہے۔ بے شبہ ڈالا نے تنقیدی دلیلیں پیش نہیں کی ہیں بلکہ اس نے صرف غیر یقینی ہونے کو نمایاں کیا ہے۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی میں ناقابل تردید دلائل سے اس دستاویز کا جعلی ہونا ظاہر و باہر

[1] اس کی یہ تالیف گولداسٹ کی لاطینی تالیف "مقدس رومی شہنشاہت کی بادشاہی" میں بطور ضمیمہ ملتی ہے۔

[2] لوراں کی فرانسیسی کتاب "کلیسا اور مملکت" جلد (۱) صفحہ (۱۴۷)۔

کر دیا گیا۔

منطقی طور سے اصلاحی دور کے مولفین کو قسطنطین کے عطیے پر اعتراض کرنا چاہیے تھا۔ حقیقت میں اس دستاویز سے جو صورت حال ضمناً پیدا ہو جاتی تھی، وہ یہ تھی کہ کلیسا کو اصلی عیسائیت سے ہٹا دیا جائے اور وہ اصلی عیسائیت کو مکمل طور سے تہ و بالا کر دیتا ہے۔ نوران نے اس کو خوب اچھی طرح ظاہر کیا ہے۔ قرون متوسط کے الحاد پسند فرقے داخلی کلیسا کے خلاف ایک رد عمل تھے۔ "ملحدوں نے سینٹ پال کی طرح یہ یقین کیا ہے کہ ہر عیسائی ایک پادری ہے۔ اور عوام اور پادریوں کے فرق کو نظر انداز کر کے انھوں نے کلیسا کے اقتدار پر، اس کی مذہبی بنیاد ہی میں، ضرب لگائی ہے۔ اگر عوام کی اور پادریوں کی زندگی میں کوئی فرق نہ ہو تو دنیاوی اور روحانی نظاموں میں بھی کوئی فرق نہیں رہ سکتا۔ اور ایک ہی سماج، ایک ہی اقتدار، اور ایک ہی قانون کا دور دورہ ہو جائے گا۔ اس طرح کلیسا کی پوری عمارت، اس کی آزادی، اس کے خصوصی تحفظات، اس کے امتیازات اور اس کے اقتدار سب تباہ ہو جائیں گے۔"[ف] پاپائیت نے خطرے کو محسوس کر لیا۔ اس نے اپنے مخالفوں پر شدت سے وار کیا۔ اور اس نے ان کو کلیسا کی طرف سے جات باہر کر دیا۔ اوکام اور پاریس کے ژان تو ملحد سمجھے ہی گئے تھے، بعد میں پاڈوا کے مارسیلیو، ژاں دیوں کے ژان اور اس کے کچھ عرصے بعد وائیکلیف کو بھی ملحد قرار دیا گیا کیونکہ انھوں نے بھی عوام کے سماج کے اقتدار اعلیٰ کی حمایت کی تھی اور بیان کیا تھا کہ کلیسا کی آزادی ایک غصب ہے۔ اور پھر اس طرح کے نظریے لکھ ڈالے تھے کہ "یہ ناممکن ہے کہ کوئی مملکت وجود میں آسکے جب کہ اس کے اندر ایک ایسا طاقتور جسد موجود رہے جو

ف۔ نوراں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ قانون بین الممالک" جلد (۱) صفحہ (۲۰۶)۔

42

ہم دیکھ چکے ہیں کہ پادوا کا مارسیلیے، ولیم اوکام کے اثرات سے متاثر ہے۔ اس پر یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ اوکام کے خیالات کلیسا اور مملکت کے تعلقات کے متعلق ان خیالات سے کچھ کم دور دراز نہیں ہیں جو کتاب "حامئ امن" میں بیان ہوئے ہیں۔ اوکام شہنشاہی اقتدار کی برتری کے لیے جھگڑتا اور پاپائی دعووں پر حملہ کرتا رہا۔ اس کی رائے میں پوپ کی اطاعت صرف ان مسائل میں کیجانی چاہیے جو ایمان والوں کی جماعت کی نجات کے لیے ضروری ہوں اور معمولی عقل سلیم سے یہ معلوم کرلیا جاسکتا ہے کہ ایسی چیزیں کون کونسی ہیں۔ اور ہر اس شخص کو، جس نے خدائی قانون کی تعلیم پائی ہو، یہ حق حاصل ہے کہ اس کی جانچ خود ہی کرے، خواہ ایسا شخص مالدار ہو یا غریب، پادری ہو یا عامی۔ پوپ سے غلطی کا ارتکاب ہوسکتا ہے اور اگر وہ کسی غلطی کا ارتکاب کرے تو سمجھدار لوگوں کا فریضہ ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اس کا مقابلہ کریں علماء کا مقابلہ اور طرح کا ہوگا، مذہبی افسروں کا اور طرح کا، بادشاہوں کا اور طرح کا، سیدھے سادے لوگوں کا اور طرح کا۔ پوپ کے فیصلے سے کوئی پابندی نہیں پیدا ہوتی۔ اور پوپ کے فیصلوں کا مرافعہ کیا جاسکتا ہے۔ اور خود پوپ کی تک تحقیقات کرکے اس کے خلاف فیصلہ صادر کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ ملحد ہے تو اسقفوں کو چاہیے کہ اس پر الزام قائم کردیں۔ اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو دیگر راسخ العقیدہ لوگوں اور خاص کر شہنشاہ کا فریضہ ہے کہ ایسا کرے۔ اگر پوپ کسی جرم کا شہرت پذیر طور سے ارتکاب کرے تو چاہیے کہ اُسے رومیوں کی عدالت کے سامنے اس الزام کی جوابدہی کے لیے طلب کیا جائے۔ وہ رومیوں کا اسقف ہے۔ اور اگر رومی ایسا نہ کریں تو ہر راسخ العقیدہ کو یہ حق ہے کہ جب کبھی اسے اس بات کی کافی قوت حاصل ہو جائے کہ پوپ کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ "پراٹسٹنٹ دینیات اور کلیسا کی انسائکلوپیڈیا"، دیکھئے تحت عنوان "اوکام"۔

دنیوی قوت کے ذریعے سے گرفتار کر سکے تو اسے جوابدہی کے لیے اپنے سامنے طلب کرے۔ اگر پوپ ایمان والوں کے حقوق یا جائداد پر حملہ کرتا ہے یا ناجائز طور سے ان کو روک رکھتا ہے، تو اس صورت میں بھی پوپ کا پیچھا کیا جانا چاہیے۔ اوکام اس سے بھی بڑھ جاتا ہے: جملہ عیسائیوں کی عالمگیر مجلس شوریٰ سے بھی غلطی ہو سکتی ہے اور یہ بھی پیش آسکتا ہے کہ کلیسا کے پیروؤں کی اکثریت غلطی کرے اور صرف کمزور لوگوں اور ان پڑھ لوگوں میں صحیح ایمان باقی رہے۔ اوکام یہ بھی کہتا ہے، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، کہ رومی کلیسا ہرگز حضرت مسیح کے صوفیانہ جسم کے مترادف نہیں ہے اور یہ کہ ہر ایک انفرادی کلیسا عالمگیر کلیسا کا ایک رکن ہوتا ہے۔ روما کے کلیسا کو کوئی سرداری حاصل نہیں اور نہ ہی پاپائیت کوئی خدائی ادارہ ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اگر پوپ کو پورے اختیارات مل جائیں تو انجیل کا قانون ایک غلام بنانے والا قانون بن جائے گا جو قانون موسوی سے زیادہ سخت غلامی عاید کرے گا، اور ہر کوئی پوپ کا غلام ہو جائے گا حالانکہ انجیلی قانون ایک آزادی کا قانون ہے۔" (لاطینی میں) "حالانکہ انجیلی قانون آزادی کا قانون ہے۔"

اوکام اور مارسیلیے اور دیگر بڑے محرکین کے خیالات ان کے مرنے کے ساتھ غائب نہیں ہو گئے۔ خیال کی غیر مادی دنیا میں کوئی مرتا نہیں، بلکہ توالد کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ مذکورۂ بالا مولف جو چیز خود پوری طرح حاصل نہ کر سکے، وہ مستقبل کا نظام العمل بن گیا۔ جن اصلاحوں کا وہ خواب دیکھتے رہے ان کا اچھا اختتام ہوا اور عوام یعنی غیر پادری لوگوں کا سماج روز افزوں اپنے کو ان زنجیروں سے چھڑاتا چلا گیا جن سے کلیسا نے اس کو جکڑ دینا چاہا تھا۔ اور جدید مملکت کی تاسیس مذہبی عقاید کے باہر اور ان سے بالارادہ گریز میں آئی۔ اس سے بھی کچھ اور زیادہ ہوا۔ اوکام اور مارسیلیے کے ساتھ ایک نیا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ جو "درست" بھی تھا اور "توانگر" بھی یعنی

مملکت کے خود مختار ہونے کا خیال۔ جس چیز کا ان مولفوں نے دعویٰ کیا تھا اس سے خود بخود یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ ایک سے زیادہ خود مختار وحدتیں ایک ساتھ قائم رہ سکتی ہیں اور یہ مولف اس خیال سے دوچار ہوگئے کہ ایسی مملکتوں میں باہم حقوق و فرائض کا تبادلہ ہوگا اور ان حقوق و فرائض میں کسی مذہبی خیال کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ ان مولفوں نے اپنے آپ کو ایک قانون بین الممالک کے تصور کی بلندیوں تک پہنچا دیا اور یہ قانون بین الممالک یا وریانہ اقتدار سے بالکل اسی طرح الگ تھا جس طرح اندرونی قانون ملک۔

پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک نفیس اور ممتاز ذہنیت نے جلوہ دکھایا۔ یہ اینیاس سلقی یوس کی تھی۔ اس نے پایس دوم کے نام سے پاپائیت کا تکونی تاج زیب سر کیا تھا۔ اس پوپ نے ایک کتاب لاطینی میں تالیف کی جس کا نام "رومی شہنشاہیت کا آغاز اور اس کا اقتدار" تھا۔ یہ حکمرانی میں وحدت کا حامی تھا اور اس نے یہ تسلیم نہ کیا کہ شہنشاہ کی موجودگی میں کوئی اور انفرادی مقتدران اعلیٰ بھی ہو سکتے ہیں۔ پوپ پایس دوم کی رائے میں بادشاہوں کو چاہیے کہ بادشاہ اعلیٰ کی اسی طرح ماتحتی کریں جس طرح بطریرک اور آرک بشپ (اسقف اعظم) اور اسقف، پوپ کی کرتے ہیں۔ لیکن اپنی تالیفوں میں سے ایک اور میں سلقی یوس یعنے پوپ پایس دوم نے ہم کو یہ بتایا ہے کہ شہنشاہ اور پوپ حقیقت میں کیا بن چکے ہیں۔ چنانچہ اس نے جرمنی کے حکمرانوں سے کہا تھا کہ "شہنشاہ کا اقتدار منفی ہے" تم اس کی صرف اتنی اطاعت کرتے ہو جتنی تم مناسب سمجھتے ہو۔ اور تم اس اطاعت کو کم سے کم ہی کر دینا چاہتے ہو۔۔۔ عیسائیت ایک دھڑ ہے جس کے سر نہیں اور یہ ایک ایسی جمہوریت ہے جس میں نہ تو قانون پائے جاتے ہیں اور نہ مجسٹریٹ۔ پوپ اور شہنشاہ ہی کی تعظیم و توقیر بڑے افسر (بادشاہ) کرتے ہیں [کسی اور کی نہیں]۔ پوپ اور شہنشاہ چکاچوند تو کرتے ہیں مگر محض سراب ہیں۔

43

چنانچہ ان کو احکام دینے کا کوئی اقتدار باقی نہیں اور کوئی ایسا شخص نہیں پایا جاتا جو ان کی بات سنے"۔ ہمہ گیر طاقت رکھنے والی پاپائیت حقیقت میں شہنشاہیت میں ضم ہوگئی تھی اور یہ دونوں دیو خاک میں پڑے تھے۔ اس کے باوجود بہت دنوں تک شہنشاہ کے اقتدار کا تصور دماغوں کو ستاتا رہا۔ اس نقطۂ نظر سے اِراسمس کے دوست ژاک انتونی کی لاطینی تالیف[1] عجیب وغریب ہے۔ یہ شخص قانون مذہبی کا پروفیسر تھا اور علاقۂ "کابرے" کے اسقف کا صدر عاقب (ڈیکار) تھا۔ سنہ ۱۵۰۲ء میں اس شخص نے پرزور طور سے ان چند اطالوی مولفوں کے حملوں کا مقابلہ کیا جو شہنشاہ کی برتری کو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ اس نے یہ اعلان کیا کہ شہنشاہ تمام زمینوں حتیٰ کہ سمندر کے جزیروں کا بھی مالک ہے اور یہ کہ دنیاوی اختیار سماعت استعمال کرنے کا حق ہمیشہ کے لیے اسی کو حاصل ہے!

---

[1] (لاطینی میں): "یہ کتاب شہنشاہ کے حکم محکم سے پہلی مرتبہ طبع ہوئی ہے ... اس کا مولف قانون مذہبی کا استاد، علامۂ ماہر یعقوب ٹڈل پر گنزی ہے۔ انتورپ میں سنہ ۱۵۰۲ء میں کندہ کاری کے مطبع تھیوڈور مارٹنس میں چھاپی گئی۔"

باب سوم

مسیحیت اور جنگ

حضرت مسیحؑ کی تعلیم خاص کر امن کے لیے تھی۔ سچ پوچھیے تو انجیل نے جنگ کو بالکلیہ طور سے ناجائز نہیں قرار دیا۔ لیکن عیسائی تعلیم فطرۃً اس بات کے خلاف تھی کہ قوت کا استعمال کیا جائے۔ اور ابتدائی صدیوں میں کلیسا کے پادریوں نے جنگ کی شدید ترین مخالفت کی۔ اس کے سوا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ رضا و تسلیم کی جو تعلیم حضرت مسیحؑ نے دی تھی، اس میں غلو پایا جاتا تھا؛ مسیحیت پر ایمان رکھنے والے کو نہ صرف اس بات کی ممانعت تھی کہ قوت کے ذریعے سے اپنی حفاظت کریں، بلکہ انھیں اس کی تک اجازت نہ تھی کہ جائز ترین ہتھیار یعنی حکومت کے قانون سے مدد لے سکیں۔

اسکندریہ کے کلیمان، ترتولیان، اوریجن، لاکتانس اور ان کے علاوہ دیگر مشاہیر نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہتیار سے کسی بھی طرح

مدد لینی ناجائز ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک امن ایک خدائی واقعہ ہے اور جنگ ایک شیطانی واقعہ۔ پیغمبروں نے جس امن کی پیشین گوئی کی تھی، اس کی تک ایک صوفیانہ تعبیر کی جانے لگی تھی۔ کیا حضرت مسیح نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اُس طرح کا امن نہیں دے رہے ہیں جس طرح دنیا دیتی ہے، بلکہ خدائی امن؟

اوسی بوس نے کہا تھا کہ "کافروں میں شیاطین مسلسل جھگڑے برپا کرتے رہتے تھے۔ حضرت یسوعؑ نے ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس طرح دنیا میں امن قائم کر دیا۔" لاکتانس نے بڑے اچھے الفاظ میں فتوحات اور فاتحین کو بُرا بھلا کہا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اچھا تو تم اس طرح حیاتِ دوام حاصل کرنی چاہتے ہو! شہروں کو تباہ کرنا! بستیوں کو ویران کرنا، آزاد لوگوں کو نیست و نابود کرنا یا انہیں غلام بنا لینا! جتنا زیادہ یہ لوگ تباہی پھیلائیں، لوٹیں، اور لوگوں کو قتل کریں، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے کو شریف اور شہرت تاب سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے گناہوں کو نیکی کے نام سے موسوم کر کے فخر کرتے ہیں۔ جو شخص ایک آدمی کو قتل کرتا ہے، اسے مجرم سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کوئی ہزاروں آدمیوں کا قتلِ عام کرے، زمین میں خون کی طغیانی برپا کرے، ندیوں کو لاشوں سے پاٹ دے، تو اسے دیوتاؤں میں شمار کیا جانے لگتا ہے۔"

اوری ژین نے اپنے مذہب کی امن دوستی پر ان الفاظ میں مہرِ تصدیق ثبت کی ہے کہ "ہم کسی قوم کے خلاف ہتیار نہیں اٹھاتے، اور ہم جنگ لڑنا نہیں سیکھتے کیونکہ ہم حضرت مسیح کے واسطے سے مادرِ امن کی اولاد بنے ہیں۔"

غیر عیسائی شہنشاہوں کے زمانے میں پیروانِ مسیحیت فوجی خدمت انجام دینے سے انکار کرتے رہے۔ جب قسطنطین اعظم تخت پر آیا اور اس نے کلیسا اور حکومت کے تعلقات میں ایک بنیادی انقلاب

45

پیدا کر دیا تو جنگ کے خلاف انتہا پسندانہ جذبات میں ایک ردعمل پیدا ہو گیا۔ اس وقت تک مسیحیت پر ایمان لانے والے کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ جنگ کو ایک ملعون کام خیال کرتا ہے۔ اب نئے شہنشاہ نے اس کی کوشش کی کہ "پڑاؤ کی زندگی" کو تقدس حاصل ہو۔ لیکن سپاہی کو اب بھی پہلے کے مقابلے میں کچھ کم خون بہانا نہیں پڑتا تھا۔

کیا فوجی ملازمت ایک جائز پیشہ ہے؟ اس سوال کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ کلیسا نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ شہنشاہ قسطنطین اور لیسی نیوس نے عیسائیوں سے متعلق جو فرمان جاری کیا وہ ۳۱۳ء کا ہے۔ اس کے بعد کے سال سے ہر وہ شخص جو مذہبی بنیادوں پر فوجی خدمت سے کنارہ کشی اختیار کرتا، دارو گیر کا مستوجب ہونے لگتا۔[1] چند بلند تر ملفوظات نے اس حل کو جائز قرار دیا تھا۔ نوزائیدہ کلیسا نے ایک سماجی ضرورت کے طور پر غلامی کو قبول کیا تھا جسے وہ اصولاً ناپسند کرتا تھا۔ اس کے لیے یہ ممکن تھا کہ "سپاہیانہ" پیشے کو بھی برداشت کر لے اور "جنگ" سے بھی جنگ کرے۔ کلیسا کے ایک پادری سینٹ اتھاناس نے لکھا تھا کہ کسی جائز جنگ میں کسی کو قتل کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ باعث عزت بھی ہے۔[2]

سب سے بڑھ کر سینٹ آگسٹائن نے جنگ کے جائز ہونے کے خیال کو کامیاب بنایا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ مشہور مفکر جنگ کی ہولناک مصیبتوں کو تسلیم نہیں کرتا، یا ان کو ناپسند نہیں کرتا، یا وہ لڑائیوں میں اعتدال کی تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس پر اس خیال نے تسلط حاصل کر لیا تھا کہ ہتیار اٹھانا جائز بھی ہو سکتا ہے۔

---

[1] لَبلاں کی فرانسیسی کتاب "آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے کے عیسائی کتبات گال میں" جلد (۱) دیباچہ صفحہ (۸۱)۔

[2] ایضاً جلد (۱) صفحہ ۸۶۔

جب فلاقیوس مارسلیس نے اس سے دریافت کیا تھا کہ آیا عیسائی نظریات کے مطابق، قوانین جنگ اس کو اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ یورپ پر وحشیوں کے حملے کی صورت میں انتقامی کارروائیاں اختیار کرے؟ اس کا اس نے جواب دیا تھا کہ "اگر عیسائی قانون تمام جنگوں کو ناجائز قرار دیتا تو انجیل میں نجات کے خواہشمند سپاہیوں سے کہا جاتا کہ ہتیار پھینکدیں اور فوج کو چھوڑ دیں۔ لیکن ان سے صرف یہ کہا گیا ہے: ہر طرح کی تعدی اور فریب دہی سے بچو اور اپنی تنخواہ پر قناعت کرو۔ اگر اس طرح کے سپاہیوں کی ایک جمعیت تیار کی جائے جیسا کہ ہمارا مذہب حکم دیتا ہے، تو پھر وہ لوگ جو مسیحیت کو حکومت کے خلاف چیز سمجھتے ہیں، وہ یا تو یہ کہنے کی جراءت کریں کہ ایسی جمعیت بھی جمہوریت کی دشمن ہے، ورنہ وہ پھر اس کا اقرار کریں کہ اس مذہبی حکم کی اچھی طرح اطاعت کی جائے تو ہی نجات حاصل ہوگی"۔[1]

مانی نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ زرتشتیت، بدھ مت اور عیسائیت سب کو ایک ہی نظام مذہبی میں جمع کردے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہمہ اوست کے نظریے پر پہنچا یعنے انسان سب ذات الوہیت ہی سے نکلے ہیں اور وہ الوہیت ہی کا ایک جزء ہیں اور عالم کا وجود حیوانات، نباتات اور جمادات پر مشتمل خیال کیا گیا۔ اس طرح امن پسندی کی روح ناگزیر طور پر اس کی تعلیم میں سرایت کرگئی۔ چنانچہ مانویت نے اسے ایک گناہ قرار دیا کہ کسی درخت یا کسی جانور کو تباہ کیا جائے اور یہ تعلیم دی کہ کسی آدمی کو کسی صورت سے بھی حق حاصل نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے آدمی کی جان لے۔ سینٹ آگسٹائن نے خاص کر اس مانوی نظریے کی تردید کی کوشش کی کہ "شر" کا تعلق اصل میں انسان اور خدا دونوں سے الگ ایک علحدہ چیز

[1] لوراں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ النسانیت پر مباحث" جلد ۴ حصہ عیسائیت صفحہ ۲۲۴ و مابعد ـ لیکی کی انگریزی کتاب "تاریخ اخلاق یورپ" جلد ۲ صفحہ ۲۴۸ و مابعد ـ ہرت شوگ کی جرمن کتاب "پراٹسٹنٹ دینیات اور کلیا کی انسائیکلوپیڈیا" تحت کلمہ "جنگ"

سے ہے سینٹ آگسٹائن نے اسی طرح بے نظیر شدت کے ساتھ قانون جنگ کے متعلق
مانوی نظریے سے جنگ کی۔

قرون متوسط میں ایک ناگزیر ردعمل کے باعث اس جاگیرداری نظام کے بالمقابل جو جھگڑوں، تباہی اور لڑائیوں کا شایق تھا، کلیسا نے نئے سرے سے جنگ کی کلی مخالفت کی۔ لیکن واضح رہے کہ اس سے مراد صرف عیسائیوں کی باہمی لڑائیاں ہیں۔ کلیسا نے پادریوں کو اس بات کی ممانعت کی کہ خون بہائیں یا سزائے موت کے فیصلے صادر کریں۔ عوام الناس میں سے جو لوگ ہتیار اٹھاتے ہوتے، ان کو کلیسا نے کفارے اختیار کرنے کا حکم دیا گویا کہ وہ کوئی نجس ہستیاں ہوں۔ ایک مجلس شورائے مذہبی نے ولیم فاتح کے ہمراہیوں کو حکم دیا کہ ان میں سے جن لوگوں نے کسی کو قتل کیا ہو وہ ہر ہر مقتول کے عوض ایک ایک سال تک کفارہ اختیار کریں، اور ہر ہر مجروح کے عوض چالیس چالیس دن، اور ہر اس شخص کے متعلق جس کو مجروح کرنے کا انھوں نے ارادہ کیا ہو تین تین دن کا کفّارہ شروع کریں۔[1]

47 خود ناجائز جنگ کے متعلق یہ خیال کیا گیا کہ وہ خدا کی طرف سے دی ہوئی ایک سزا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر اور پندرھویں صدی کے آغاز میں آونورے بونے اور کرسٹین دپیزان نے یہ نظریہ قبول کر لیا کہ جنگ اصل میں ایک جائز چیز ہے۔ چنانچہ کرسٹین اپنا خیال ان الفاظ میں ظاہر کرتی ہے کہ "جو جنگ اور لڑائی کسی جائز جھگڑے کے لیے کی جائے، وہ سوائے اس کے کوئی چیز نہیں کہ اس شخص تک انصاف کو پہنچایا جائے جس کا وہ حق ہو۔" بونے جائز اور ناجائز جنگ میں امتیاز کرتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ ناجائز جنگوں کا اصل باعث انسانوں کے گناہ ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ جنگ کو گناہوں کا

[1] لوران کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد ہفتم جاگیرداری نظام اور کلیسا صفحہ (۲۳۴)

کفارہ سمجھتا ہے اور وہ یہ معلوم کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ وہ کون لوگ جنگ میں زیادہ قوی ہیں، کون زیادہ مبنی بر انصاف اور کون بر سر گناہ۔" اس کی نظروں میں جنگ کرنے والوں کا فریضہ پوری طرح معین ہے کہ "ہتھیار چلانے والے لوگ خدا کے کارندے ہوتے ہیں جو اسی کی اجازت سے گناہگاروں کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور ان کے خلاف اس دنیا میں وہی کام انجام دیتے ہیں جو دوسری دنیا کے متعلق دوزخ کے شیاطین [دوزخ کے نگران فرشتے مراد ہیں۔ مترجم]۔" یہی شخص ایک اور جگہ اس سوال سے بحث کرتا ہے کہ آیا جنگ "قانون الہٰی کے تحت کوئی مردود چیز ہے؟ چنانچہ وہ کہتا ہے: "یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ ایک اچھی اور نیکی کی چیز ہے کیوں کہ اپنے صحیح مفہوم میں جنگ سوائے اس کے کسی اور چیز کا خیال نہیں کرتی کہ حق کے خلاف جو فعل ناجائز ہوا ہو، اس کی اصلاح کی جائے اور جو جھگڑے پیدا ہوئے ہیں ان کی جگہ امن بحال کیا جائے، جیسا کہ کتاب مقدس میں درج ہے۔ اگر جنگ میں متعدد برائیاں بھی پیدا ہوتی ہیں، تو یہ جنگ کی فطرت کے باعث نہیں ہے بلکہ جنگ کے برے استعمال کے باعث ہیں۔" فرانسیسی کتاب "شجرہ حروب" کے مولف بونے نے یاد دلایا ہے کہ حاکم عدالت کو انصاف کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "اگر کوئی حاکم عدالت خود ظلم کرے تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادارۂ عدل گستری ایک بری چیز ہے؟ یقیناً نہیں۔ کیوں کہ ظلم کرنا ادارۂ عدل گستری کے باعث نہ ہوگا بلکہ اس ادارے کے برے استعمال اور برے حکام عدالت کے باعث۔ اصل میں ہر بھلائی اور نیکی کی خدا ہی کی طرف سے توفیق ہوتی ہے۔" یہی مولف یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ جنگ، انصاف پسند لوگوں کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے، مذہبی قانون کی طرف سے بھی، کشوری قانون کی طرف سے بھی اور قانون فطرت کی طرف سے بھی۔

جنگ کا اصل میں جائز ہونا ایک ایسا نظریہ تھا جس کے حامی باقی رہے، جیسا کہ ہمیں بیان کرنے کا موقع ملے گا۔ اس نظریے کی سنجیدہ مخالفت کسی نے نہیں کی سوائے ایک شخص وائیکلف کے جو قرون متوسطہ کی بیباک ترین ذہانتوں میں سے ایک تھا اور جس نے اس مبارک سلسلے کو جاری رکھا جس پر قرون متوسطہ کے انگریز مصلحین مشتمل ہیں۔ چنانچہ یہ گروس ٹسٹ اور براڈوارڈن کا جانشین ہوا تھا۔ جنگ کے جواز پر اس نے جو حملہ کیا تھا، وہ اتنا شدید تھا کہ اس کے بعد دو صدیوں سے زاید عرصہ گزرنے کے باوجود یہ ضروری خیال کیا گیا کہ اس عظیم شخصیت کے دلائل کی تردید کی جائے۔

پوپ گیارھویں گریگری کی وفات پر چھٹے اُربان اور ساتویں کلیماں دو اشخاص منصب پاپائی کے مدعی بن کر کھڑے ہوئے۔ وائیکلف نے دونوں ہی مدعیوں کو ناحق ٹھیرایا اور جب چھٹے اُربان نے انگلستان میں اس تحریک کی ابتدا کروائی کہ ساتویں کلیماں کے پیروؤں کے خلاف ایک مقدس صلیبی جنگ کی جائے تو وائیکلف نے اس ہنگامے میں اپنے کو الجھا لیا اور بکثرت تحریروں کے ذریعے سے اس قابل سرزنش کوشش کو برا ٹھیرایا۔ چنانچہ لاطینی کتاب "مظالم یا پادریوں کی جنگ" اور لاطینی کتاب "تین قسم کی باتیں" اسی کے متعلق لکھی گئی تھیں۔ اس کی رائے میں ہر جنگ فی نفسہ ناجائز ہے۔ اور اس کا دعویٰ کیا گیا کہ پوپ اگر جنگ کا حکم دے تو وہ نیکی کی روح کے خلاف کارروائی ہے۔ وائیکلف کا بیان ہے کہ عہد نامۂ قدیم یعنی توریت سے استدلال نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس وقت لوگ اس غرض کے لیے جنگ کر رہے تھے کہ خدا کے متعلق جو ناانصافیاں کی گئی تھیں ان کا انتقام لیں۔ مزید برآں اگر پروردگار نے نئے قانون یعنی انجیل کی حفاظت قوت کے ذریعے سے کرنے کی اجازت دی ہے تو بہرحال اس نے کسی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

48

49 اور سولھویں صدی کے آغاز پر انگلستان میں چند رحم پرور اور راسخ الخیال لوگ گذرے ہیں مثلاً جان کولٹ، ٹامس مور، اور ارَاسمَس جو امن کے ویسے ہی زبردست حامی تھے۔ ٹامس مور اور اراسمس کے امن پسندانہ نظریے حقیقت میں کولٹ ہی کے زیر اثر ہے اور کولٹ کے خیالات کا ماخذ جاننے کے لیے وائیکلف تک ہی جانا کافی ہے۔[1]

---

[1] مزید برآں دیکھئے آگے صفحہ (391)

فتوحات کا حق اصل میں ایک بڑے پیمانے پر چوری کے مترادف ہے
اگر قادر مطلق فتوحات کا حکم دے تو ہی فتح درست ہو سکتی ہے،
اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن نہیں۔" اسی مصلح نے یہ بھی
کہا تھا کہ "خداوندا! اس سوار کی کیا ہی عزت کی جاتی ہے
جو انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قتل کر چکا ہو۔ جلاد اس
سے زیادہ اشخاص کو قتل کرتا ہے اس کی اس سے زیادہ عزت
ہونی چاہیے۔ جانوروں کو مارنے والے قصاب کی عزت اپنے
بھائیوں کو قتل کرنے والے قصاب یعنے سپاہی سے زیادہ ہونی
چاہیے کیوں کہ یہ فطرت کے نسبتہً کم مخالف ہوگا۔"
لولارڈ کے مسلک نے وائیکلف ہی سے ترقی پائی تھی اور
وائیکلف کے ہاں قتل و خون کے خلاف جس وحشت کا اظہار ہے
لولارڈ کے پیروؤں میں بھی وہی چیز نظر آتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ
بھی ہتیار اٹھانے کی ہر صورت کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور خون
بہانے کی ممانعت کرتے ہیں۔ اور ان کی طرف جو نظریے منسوب ہیں
ان میں ایک وہ نظریہ بھی ہے جو غلط لاطینی میں لکھا گیا ہے اگرچہ
اپنے منشاء کو خوب اچھی طرح واضح کرتا ہے اور جو سزائے موت
کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اسے انجیل کے خلاف ٹھیراتا ہے۔
چنانچہ وہ لاطینی عبارت یہ ہے: "انسان کا قتل کرنا چاہے جنگ
کے ذریعے سے ہو، یا دنیاوی اغراض کے لیئے، انصاف رسانی
کی غرض سے قانون کے بہانے سے متعلق ہو، یہ عہد نامۂ جدید
یعنے انجیل کے صریح مخالف ہے کیوں کہ انجیل کا قانون رحم اور کرم
سے لبریز ہے۔"[1]
یہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام

[1] جان وائی کلف کے اختلافی رسائل کا [لاطینی] مجموعہ، شایع کردہ شرلے صفحہ (۳۶۶)

باب چہارم

بین الممالک جھگڑوں کی یکسوئی

ہمارے زمانے میں اِنسانیت جس درجے تک ترقی کر چکی ہے اس کے مطابق اقتدار اعلیٰ کا سب سے اعلیٰ مظاہرہ مملکت کی ذات میں مرتکز ہوتا ہے۔ مملکت کے باہر اور مملکت کے اوپر کوئی ایسی قوت نہیں پائی جاتی جو قانون بنا سکے، یا حقوق کا نفاذ کرا سکے۔ جہاں تک اصولی بحث کا تعلق ہے، ہتیار سے مدد لینی جائز ہے کیوں کہ کوئی ایسی قوت نہیں پائی جاتی جو معمولاً اپنی مرضی و مشیت دوسری مملکتوں پر چلا سکے کیوں کہ وہ خود بھی قانونی شخصیت سے اتنی ہی متصف ہوتی ہیں۔ کسی ایک معینہ صورت میں قوت کا استعمال اس وقت تک جائز نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ضروری اور ناگزیر نہ ہو گیا ہو۔ جنگ اصل میں جھگڑوں کو چکانے کا ایک طریقہ ہے۔ لیکن وہ ایک انتہائی طریقہ ہے جس کا استعمال صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ اختلافات کی یکسوئی کا قطعاً کوئی اور امکان باقی نہ رہا ہو۔ جیسا کہ سینٹ آگسٹائین نے (لاطینی میں) بیان

کیا تھا کہ "امن کو اپنی مرضی و مشیت سے حاصل کرنا چاہیے اور جنگ کو صرف ضرورت پر۔" یہ مقولہ گراتیان نے اپنی تالیف میں شامل کیا ہے اور قرون متوسط کے اکثر مولفوں نے اسے لفظ بہ لفظ دُہرایا بھی ہے۔ اور یہ اس مسئلے کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ مقتدر اعلیٰ کو چاہیے کہ اپنے رجحان اور اپنی مشیت سے امن کو برقرار رکھے اور وہ جنگ اس وقت تک نہ کرے جب تک کہ انتہائی ضرورت لاحق نہ ہو۔

جنگ کیے بغیر جھگڑے چکانے کے جو طریقے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ پہلے دوستانہ کوشش اور دوسرے عملی یا واقعاتی طریقے۔ اب ہم اس بات کی تحقیق کریں گے کہ قرون متوسط میں کونسے طریقے خاص طور پر مستعمل ہوتے تھے۔ 50

* * *

فصل اول

دوستانہ کوشش

گروتیوس نے بیان کیا ہے کہ جنگ نہ ہونے دینے کے لیے تین ایسے طریقے ہیں جن کو دوستانہ کوششوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ پہلے باہم اختلاف رکھنے والے فریقوں میں دوستانہ تبادلۂ خیال، دوسرے تحکیم (ثالثی) کے ذریعے سے مصالحت کرنا اور تیسرے قرعہ[1]

ہم یہاں صرف پہلے دو طریقوں سے بحث کریں گے۔ قرعے کے متعلق یہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس کا استعمال مختلف موقعوں پر ہوا ہے خاص کر ان جھگڑوں میں جو تقسیم کے موقع پر یا حق تقدم (سینیارٹی) کے سلسلے میں پیدا ہوئے۔ یہ چیز خاص کر ۱۶۰۸ء میں نظر آتی ہے جب شہنشاہ نے شہنشاہی مجلس سے سفارش کی تھی کہ جو حکمران حق تقدم کے متعلق جھگڑ رہے ہیں ان کے رتبے کا فیصلہ کرنے کے لیے قرعہ ڈالے۔ اسی طرح ۱۷۰۹ء میں برلین کا سفر کرتے وقت ڈنمارک اور پولینڈ کے بادشاہوں نے قرعہ ڈال کر یہ فیصلہ کرنا چاہا کہ پہلی مرتبہ حق تقدم

[1] گروتیوس کی لاطینی تالیف "قانون جنگ و صلح" کتاب سوم حصہ دوم باب (۲۳) ف ۷، ۸ و ۹۔

کس کو حاصل ہوگا۔ بجز اس کے کہ نوبت بہ نوبت متبادل طور سے وہ اس حق کا استعمال کریں۔

گروتیوس نے جن دوستانہ تبادلہ ہائے خیال کا ذکر کیا ہے وہ قرون متوسط میں معدوم نہیں ہیں۔ لیکن ان ملاقاتوں میں کچھ اتنی زیادہ احتیاطیں برتی جاتی تھیں اور ان کو کچھ اتنا زیادہ ناپسند کیا جاتا تھا کہ دوستانہ تبادلۂ خیال کو جھگڑے چکانے کا کوئی معمولی طریقہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان میں بے اطمینانی کا اتنا زیادہ عنصر شامل ہونے کی وجہ اس زمانے کا نظام حکومت ہے جو شاہی یا جاگیرداری اصول پر مبنی تھا اور حکمران کی مرضی ہی پر سب کچھ مبنی ہوا کرتا تھا۔ اسی لیے حکمران کی ذات پر قبضے کا سوال بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔[1] اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حکمران نہ صرف باضابطہ طور سے اس کا مطالبہ کرتے تھے کہ انھیں آزادانہ آنے جانے کا اطمینان دلایا جائے بلکہ وہ خود ہی انتہائی تفصیل کے ساتھ اپنی احتیاطیں خود برتتے تھے۔ ایک مولف نے اس کے متعلق اشارہ کیا ہے۔ مونترو کے پل پر جو المناک جان لیوا حملہ ہوا تھا اور جس میں برگنڈی کے ڈیوک ژاں بے باک کو قتل کر دیا گیا تھا، اس کی افسوسناک یاد برقرار تھی۔ اور پندرھویں صدی عیسوی کی پوری سیاست خارجہ کی تشکیل اسی نے کی تھی[2]۔ اس کے علاوہ حقیقت میں ملاقاتوں کے نتیجے عموماً صفر ہوتے تھے اور تذبذب پسند مورخ کومین نے جو اس کے اسباب سے واقف تھا، اس بارے میں طویل صفحات لکھ مارے ہیں جن میں وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ جب دو حکمران اس غرض سے باہم ملتے ہیں کہ جھگڑوں کا فیصلہ کریں تو یہ امر فائدے سے

51

---

[1] موڈ لا کلا ہیبنبیر کی فرانسیسی کتاب "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ ۲۵۸۔

[2] ایضاً صفحہ ۲۵۹۔

زیادہ نقصان رساں ہی ثابت ہوتا ہے۔[1]

مصالحت کی حالت بالکل جدا ہے۔ گروتیوس اس اصطلاح میں نہ صرف غیر جانبداروں کی دوستانہ دخل دہی اور ثالثی و وساطت کو شامل سمجھتا ہے[2] بلکہ اس چیز کو بھی جسے واقعی مصالحت کہا جاسکتا ہے۔[3] فریقین کے دوستوں کا یک بیک اپنے حسن خدمات کو پیش کرتے ہوئے دخل دینا ایک الگ چیز ہے، اور ثالثی ایک الگ چیز ہے، کیونکہ اس میں فریقین اس مصالحت کرانے والی دخل دہی کو قبول بھی کر لیتے ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں ان دونوں قسموں میں امتیاز کیا جانے لگا۔ چنانچہ دخل دہندہ یا صلح کار اُن ثالثوں کو کہا جانے لگا جن کی دخل دہی کو فریقین نے صراحت سے تسلیم نہ کیا ہو۔ اس کے برخلاف ثالث یا وساطت کار ان لوگوں کو کہا جانے لگا جنھیں فریقین کی طرف سے ایک واقعی "تفویض" حاصل ہو چکی ہو۔[4]

ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں جن میں مختلف حکمرانوں نے اپنے حسن خدمات کا پیشکش کیا ہو یا اپنی ثالثی قبول کروائی ہو تا کہ کسی کشیدگی کا ازالہ ہو جائے یا دوستانہ تعلقات بحال ہو جائیں۔

پوپ کی حیثیت صلح کار اعظم کی تھی۔ جب ہم صلح کے اعادے اور صلح کے معاہدوں سے بحث کریں گے، تو اس وقت اس مسئلے پر بھی ہم مکرر نظر ڈالیں گے۔ یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ پوپوں نے اکثر اپنے حسن خدمات پیش کیے اور ان کی کوششیں اکثر کامیاب بھی رہیں۔

---

[1] فلپ کومین کی فرانسیسی کتاب "یادداشتیں" حصۂ دوم باب (۸)

[2] گروتیوس کی لاطینی "قانون جنگ و صلح" کتاب سوم حصۂ سوم باب (۲۰) ف ۴۶ و ۴۷۔

[3] ہنری کوچے اِی کی لاطینی کتاب "قانون جنگ و صلح کی تین کتابوں کی شرح" مطبوعہ لوزان ۱۷۵۱ء جلد (۴) صفحہ ۳۷۲ — ساموئل کوچے اِی کی لاطینی کتاب "مشہور گروتیوس کا دیباچہ" جلد (۵) صفحہ ۶۴۸ مطبوعہ لوزان۔

[4] دے آل ڈکوربان کی فرانسیسی کتاب "علم حکمرانی" جلد (۸) صفحہ ۲۵۶۔

صلح کرانے کا کام پوپوں کا کچھ اجارہ نہ تھا۔ مختلف بادشاہ اور حکمران بھی یہی کام انجام دیتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی توجہ کو کامیابی حاصل ہونی ہمیشہ ضرور نہیں رہی۔ چنانچہ مورخ کومین نے گیارھویں لوئی اور "شارل جسارت مند" (برگنڈی کے آخری ڈیوک) کے جھگڑوں کے متعلق یہ مزیدار بات لکھی ہے کہ "پرتگال کا یہ بیچارہ بادشاہ، جو بہت اچھا اور انصاف پسند تھا، یہ خیال کرنے لگا کہ وہ برگنڈی کے جس ڈیوک کے پاس جارہا ہے وہ اس کا چچازاد بھائی ہے اور یہ کہ بادشاہ اور ڈیوک میں جو جھگڑا ہے وہ اس کا فیصلہ کرادے گا"[1]

62 جس چیز کو صحیح معنوں میں مصالحت کہا جا سکتا ہے، وہ بہ نسبت وساطت یا ثالثی کے زیادہ پیش آتی رہی ہے۔ قرون متوسطہ میں اس کا زیادہ رواج تھا۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی کے بعد اس کا اتنا رواج نہ رہا[2] قرون متوسطہ کی مشہور کتاب "کونسولا تو دیل مارے" (بحری قواعد) کی ایک نفیس عبارت میں اس کا پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں اس موضوع پر کیا خیالات پائے جاتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی جہاز گرفتار ہونے کے بعد دوبارہ رہا کرالیا جاتا تو اس کے متعلق اس کتاب میں جو قدیم رواجات بیان ہوئے ہیں ان میں لکھا ہے کہ اگر جہاز والے باہم متفق نہ ہوسکیں تو ان کو چاہیے کہ اس جھگڑے کا فیصلہ پنچایت پر چھوڑ دیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "یہ منصفانہ بات ہوگی کہ کوئی شخص اپنے حق کو دوسرے پر قوت و زور کے ساتھ نافذ نہ کرے۔ کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا اور نہ جان سکتا ہے اور نہ ہی اسے اس بات کا کبھی یقین ہوسکتا ہے کہ کسی آیندہ نوبت پر اسے بھی کہیں اس طرح نقصان اٹھانے پر

---

[1] فلپ کومین کی فرانسیسی کتاب "یادداشتیں" حصہ اول باب ۸۔

[2] کرسٹوف فون شلائی نیتس کی ۱۸۳۱ء میں ہالم اشتات میں شایع شدہ لاطینی کتاب "صلح کارانہ گفت و شنید مابین اقوام کی تشریح"۔

مجبور نہ ہونا پڑے۔ اسی لیے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنے جھگڑے کو پنچایت کے علم میں لائے تاکہ نہ تو خدا اور نہ ہی انسان اس کے خلاف الزام لگانے کا موقع پا سکیں"۔

چند واقعات کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ۱۱۷۶ء میں آراگون اور نوارہ کے بادشاہوں نے اپنا ایک جھگڑا انگلستان کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا تاکہ وہ اس کی جانچ کرے۔ ہر دو فریق مقدمہ نے بادشاہ انگلستان کی تحکیم کی تعمیل کا اطمینان دلانے کے لیے بطور ضمانت چار قلعے پیش کیے، اور انھوں نے اپنی طرف سے مختار کل نمایندوں کو مقرر کیا کہ وہ انگریزی بادشاہ کے پاس جاکر اس کے فیصلے کا علم حاصل کریں۔ فریقین کو تیس دن کی مہلت دی گئی تھی تاکہ وہ "عدالت" کے سامنے حاضر ہوں۔ اور اس مدت کے گزرنے کے بعد جو فریق بھی حاضر ہونے سے قاصر رہے گا، وہ اپنے ضمانت میں رکھے ہوئے قلعوں سے محروم ہو جائے گا۔ حَکَم کی موت کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا تھا کہ ایسی صورت میں بادشاہ انگلستان کی جگہ بادشاہ فرانس یہ کام انجام دے۔

مونٹ فورڈ کے سائمن نے انگریزی جاگیرداروں کو ساتھ لے کر جب تیسرے ہنری کے خلاف ایک سخت خانہ جنگی کی تو ہر دو فریقوں نے سینٹ لوئی کو اپنے باہمی دعووں کا پنچ مقرر کیا۔ چنانچہ فرانس کے اس بادشاہ نے فریقین کو بمقام آمیاں طلب کیا اور وہیں تیسرے ہنری اور جاگیرداروں کے نمایندوں نے اپنی اپنی بحث کی۔ ۲۳ جنوری ۱۲۶۴ء کو لوئی نے اپنا مشہور فیصلہ صادر کیا جس میں اس نے ہنری کے حق کو پوری طرح تسلیم کیا تھا۔ اگرچہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ فیصلہ بالکل مبنی بر انصاف نہ تھا اور کسی نے اس کو مانا بھی نہیں [لیکن یہاں صرف یہ عمل دکھانا ہے کہ ایسی چیزیں بھی تحکیم کے لیے پیش ہوتی رہی ہیں۔ اس معاملے کا انجام بیان کرنے کے لیے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ] اس کے بعد

جو واقعات جلد جلد پیش آئے ان کے سلسلے میں مونٹ فورڈ کے سایمن نے ۱۲۶۵ء کی مشہور پارلیمان طلب کی۔ پھر لڑائیاں چھڑ گئیں اور آخر انگریزی آزادیوں کا یہ مشہور حامی ایفشزہام میں میدان جنگ میں کھیت رہا۔

53

تیسرے الگزانڈر کی وفات پر پہلے ایڈورڈ کو اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے دعوت دی گئی تھی کہ اسکاٹلینڈ کے تخت کے (۱۲) امیدواروں میں سے کون صحیح حقدار ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک اہم تحکیم کا واقعہ پیش آیا۔ ایڈورڈ اول اور "خوبصورت فلپ" کے جھگڑوں میں پوپ آٹھویں بونی فاس نے دخل اندازی کی تھی۔ ۱۲۹۶ء میں تو اس نے ان دونوں بادشاہوں کو اپنی اعلیٰ عدالت کے سامنے حاضر ہونے کا حکم بھی بھیجا لیکن فرانس کی طرح انگلستان میں بھی اس کے دعووں کی غیر مغلوب مخالفت ہوئی بلکہ ان کے باعث اس زمانے میں ایک پرزور جھگڑا اس موضوع سے متعلق چھڑ گیا کہ کشوری (یعنے غیر مذہبی) اقتدار کے حدود کیا ہیں۔ ۱۲۹۸ء میں دونوں بادشاہ اور پوپ مصالحت کرتے نظر آتے ہیں اور ہر دو حکمرانوں نے یہ بات منظور کر لی کہ اپنا جھگڑا پوپ آٹھویں بونی فاس کی تحکیم کے لیے پیش کریں۔ احتیاطاً انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ انھوں نے اس تحکیم کو جو منظور کیا ہے وہ اس لیے نہیں ہے کہ پوپ کو اپنے عہدے کے باعث ایسا کوئی حق حاصل ہے بلکہ انھوں نے محض اپنی پسند سے یہ انتخاب کیا ہے اور اگر وہ چاہتے تو پوپ کے سوا کسی اور شخص کا بھی اس غرض کے لیے انتخاب کر سکتے۔ اس تحکیم کا فیصلہ ۲۷ رجون ۱۲۹۸ء کو صادر ہوا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہر دو بادشاہوں نے پوپ آٹھویں بونی فاس کو اس کی خانگی حیثیت میں انتخاب کیا تھا۔ گویا حقیقت میں پوپ آٹھویں بونی فاس نے نہیں بلکہ بے نو اگابیتانی نامی شخص نے [جو بونی فاس کا اصل نام تھا] یہ فیصلہ صادر کیا تھا۔ لیکن حَکَم نے اپنے حدود اختیار سے تجاوز کیا تھا۔ چنانچہ یہ فیصلہ پوپ نے

ممدر پادریوں کی باقاعدہ مجلس میں سنایا۔ چند ہی دنوں بعد پوپ نے اس فیصلے کے متعلق ایک بل یعنے مذہبی فرمان بھی صادر کیا اور بادشاہ انگلستان کے سفیر یعنے ڈرہام کے اسقف کو اس بات کا ذمہ دار گردانا کہ وہ اسے فرانس کے بادشاہ تک پہنچائے۔

۱۳۱۷ء میں انگلستان، قسطیلہ، آراگون اور پرتگال کے بادشاہوں نے فرانس اور فلانڈرس کے بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ پوپ بائیسویں جان کی تحکیم کو منظور کرے۔ اور ساتھ ہی یہ تحفظ کیا کہ فلانڈرس والے اور وہاں کا بادشاہ اس تحکیم کو صرف اس لیے منظور کریں گے کہ "وہ محض ان کی اپنی ذاتی خواہش کے مطابق ہے"۔

فرانس کے علاقہ ڤالوا کے حکمران فلپ نے ۱۳۳۴ء میں بطور حکم ایک مقدمے میں فیصلہ صادر کیا تھا جس میں ایک فریق تو بوہیمیا کا بادشاہ اور مختلف جرمن حکمران تھے اور دوسری طرف براباں کا ڈیوک فریق تھا۔ اس نے اپنے فیصلے میں بیان کیا تھا کہ "فیصلہ کرنے کے لیے نامزد ہونے اور انتخاب کیے جانے کے باعث، ان معزز لوگوں میں جو ہمارے عزیز دوست ہیں، صلح کرانے اور دوستانہ طور سے جھگڑا چکانے کے لیے..."

چودھویں صدی عیسوی میں ڈنمارک کے بادشاہ اور ہول اشٹائن کے جاگیرداروں نے شہنشاہ زیگس موند کو اس غرض کے لیے حکم مقرر کیا تھا کہ شلیس وِش (سا ئیلیشیا) کے متعلق پیدا شدہ ایک جھگڑے کا فیصلہ کرے۔

گیارھویں لوئی نے قسطیلہ اور آراگون کے جھگڑوں کا فیصلہ کیا اور اسی طرح آسٹریا کے زیگس موند اور سوئٹزرلینڈ والوں کے جھگڑے کا بھی۔

ہالینڈ کے علاقہ گیلدر کے ڈیوک اور یولیر کے ڈیوک نے بارھویں لوئی کو اپنا واحد حکم نامزد کیا تھا۔ بادشاہ لوئی نے اپنی پارلیمان سے مشورہ کیا کہ وہ اپنے فیصلے کے لیے جس مشیر کو چاہے طلب کرسکتا ہے

5

کیونکہ کسی حکمران کا یہ ایک صحیح طریقہ ہوتا ہے اور اس کا قدرتی فریضہ بھی کہ بغیر مشورے کے نہ تو کوئی کام کرے اور نہ حکم دے۔

ایک دلچسپ واقعہ سولھویں صدی عیسوی میں پیش آتا ہے۔ ۸ رجون ۱۵۴۶ء کو فرانس اور انگلستان میں پانچ لاکھ بارہ ہزار اشرفیوں کے بقیہ قرض کے متعلق ایک معاہدہ ہوا تھا۔ انگلستان کو قرض خواہ ہونے کا دعویٰ تھا۔ طے ہوا کہ یہ معاملہ دو اشخاص کے تفویض کیا جائے گا جن میں سے ایک ایک کا تقرر ایک ایک فریق معاہدہ کی جانب سے ہوگا۔ اور اگر یہ دونوں پنچ تین مہینوں کے اندر فیصلہ نہ کر سکیں تو دونوں حکمرانوں میں سے ہر ایک دو دو مشیران قانون کا انتخاب کرے گا جو کسی اجنبی حکمران کی رعایا ہوں اور ان کا فیصلہ فریقین معاہدہ اور ان کے جانشینوں کے لیے قابل پابندی ہوگا۔

لاطینی کتاب "نہایت پچے عیسائی بادشاہ ہنری کے زمانے کے اہم مقدمات پر مباحث" میں جو اغلباً ۱۵۵۶ء میں شایع ہوئی تھی (۳۰۰) سے زیادہ فیصلوں کا ذکر ہے، جو اس کتاب کے مولف راول ایبی فام نے بادشاہ ہنری دوم کی طرف منسوب کیے ہیں[1]۔ ان میں ایسے متعدد جدت بھرے تصور بھی ملتے ہیں جن کا تحقق مستقبل ہی میں ہو سکا۔ اسی طرح ان میں بعض عجیب رجحانات بھی نظر آتے ہیں جو بیمار ذہنیت کا نتیجہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ ایبی فام پارلیمان پاریس کا وکیل تھا۔ اس نے فیصلہ نمبر (۲۵۹) میں اس بڑی جماعت کی اصلاح سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ سابق میں وہ اتنی مقدس اور عمدگی کے ساتھ چلائی جا رہی تھی کہ بیرونی حکمران اس کے پاس انصاف طلبی کے لیے حاضر ہوتے اور اس کے معقول فیصلوں کو مانتے تھے۔

---

[1] نیس کا فرانسی مضمون "راول ایبی فام وکیل پارلیمان پاریس" فرانسی "رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی" بابتہ ۱۸۹۰ء میں۔

کیوں کہ انھیں کسی اور جگہ اتنا زیادہ انصاف اور سلامتی حاصل نہیں ہوتی تھی"۔ یہی ریمارک ایک صدی پہلے شاعر انتوان داستی نے بھی کیا تھا۔ یہ اورلیان نے حکمران شارل کا وفادار دوست تھا اور اس کے لیے وہ لاطینی میں کتابیں ترجمہ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک نظم موں فرا کے مارکوئیس کے نام معنون کی تھی جس میں اس نے شہر پاریس کی عظمت کے راگ گائے ہیں۔ اس میں اس نے وہاں کے عجائبات میں سے ایک وہاں کی پارلیمان بھی بیان کی ہے "جس کے انصاف کی شہرت اتنی بڑی ہے کہ اجنبی حتیٰ کہ غیر مذہب والے بھی بعض وقت اپنے مقدمے اس کے ہاں رجوع کرتے ہیں"۔

باپوں کی کتاب پر ایک تعلیق میں ایسی متعدد نظیروں کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں پاریس کی پارلیمان کو حکم بنایا گیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "نامور نسے کے کونٹ نے جب ثالوا کے شارل سے، ترنتے کے فلیپ نے برگنڈی کے ڈیوک سے، لورین کے ڈیوک نے شاتیوں کے گای سے، سافا ے کے ڈیوک نے ڈوفینے کے شہزادے سے، اور قسطیلہ کے بادشاہ نے پرتگال کے بادشاہ سے جب جھگڑا کیا تو انھوں نے پاریس کی پارلیمان کے سپرد اپنا اپنا معاملہ کیا۔ اس سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ اس عدالت کی عظمت و جلالت کتنی قدیم ہے۔ چنانچہ اجنبی بادشاہ اور حکمران تک اپنے جھگڑوں میں اس کا تحکیم کے لیے انتخاب کرتے رہے ہیں[1]۔

گرے نوبل کی پارلیمان کو وسیع سیاسی اختیارات حاصل تھے اور وہ ملک کے نظم و نسق میں بھی حصہ لیا کرتی تھی۔ پہلے فرانسوا کے زمانے میں اس کا انتخاب اس غرض کے لیے ہوا تھا کہ وہ حکمرانوں میں

---

[1] باپوں کی فرانسیسی کتاب "فرانس کی مقتدر عدالتوں کے عمدہ فیصلوں کا مجموعہ"، حصۂ چہارم، عنوان ششم، فیصلہ (۱۴)۔

میلانے کے کچھ علاقے کے متعلق جو جھگڑا ہو رہا تھا اس کا فیصلہ کرے۔
سنہ ۱۵۷۰ء میں دی تروں کی پارلیمان کے ایک رکن کا انتخاب اسپین کے بادشاہ اور سوئٹسان (سوئٹزرلینڈ) والوں نے اس غرض کے لیے کیا تھا کہ "آزاد کونٹی" کے متعلق ان کے دعووں کا فیصلہ کرے۔
سنہ ۱۶۱۳ء اور سنہ ۱۶۱۴ء میں گرے نوبل کی پارلیمان نے ایک تحکیم کے سلسلے میں دو فیصلے صادر کیے تھے۔ آسٹریا کے آرک ڈیوک اور ورٹیم برگ کے آرک ڈیوک میں موں بے بیار کی کونٹی کے متعلق جھگڑا تھا اور فریقین مقدمہ ہی نے اس پارلیمان سے رجوع کیا تھا۔
یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پوفنڈورف نے اس بات پر زور دینا ضروری خیال کیا ہے کہ تحکیم کے لیے منتخب ہونے والے شخص کے فرائض کیا ہیں۔ چنانچہ اس کو چاہیے کہ سب سے زیادہ اس بات کا لحاظ کرے کہ کسی ستایش یا شکایت کی پروا کیے بغیر فیصلہ کرے اور صرف حق و انصاف کے مطابق تسویہ کرے۔ پوفنڈورف کی کتاب کے مترجم باربیراک نے اس سلسلے میں فرانچسکو گچیاردینی کا حوالہ دیا ہے جس نے اپنی "تاریخ اٹلی بابتہ سنہ ۱۴۹۲ء تا سنہ ۱۵۳۲ء" میں ایک خاصا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ سنہ ۱۵۱۲ء میں شہنشاہ مکس میلیان نے قسابنس پر فتح حاصل کرنے کے بعد اس بات پر نسبتہً زیادہ آمادگی ظاہر کرنی شروع کی تھی کہ وہ وینس والوں سے صلح کرے۔ یہ ہمیشہ روما میں گفت و شنید کرتا رہا۔ آخر وینس کے سفیروں نے گورک کے اسقف کی (جو اٹلی میں شہنشاہ کا صدر نائب تھا) تائید سے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ ان کی جمہوریت کو شہنشاہ مکس میلیان کے ساتھ جتنے بھی جھگڑے ہیں وہ تحکیم کے لیے پوپ دسویں لیو کے پاس پیش کیے جائیں۔ یہ آمادگی پُر خلوص نہ تھی۔ اسقف اور سفیر سب ہی کو اتنے اہم معاملے کے ایک مشتبہ حکم کے ہاتھ سپرد کیے جانے پر دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اور انھوں نے اس مصالحت کی تجویز پر دستخط کرنے اس وقت تک پسند نہ کیے جب تک کہ

پوپ نے ان میں سے ہر ایک سے مخفی اور علٰحدہ علٰحدہ طور سے یہ وعدہ نہ کرلیا کہ وہ ان کی رضامندی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔

مصالحت کے سلسلے ہی میں اکثر کسی حکمران کی دخل دہی کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال چودھویں صدی میں ملتی ہے۔ ہالینڈ اور دریائے رائن کے علاقوں کے جاگیرداروں کو (جن کی جاگیریں فرانس میں تھیں اور جو نہیں چاہتے تھے کہ شہنشاہ کے حکم کے بغیر ؔوالوا کے فلپ کے خلاف ہونے کا فیصلہ کریں) ہموار کرنے کے لیے تیسرے ایڈورڈ نے باویریا کے لوئی کو مخاطب کیا۔ شہنشاہ نے شہر کوب لنتس میں ۳ ستمبر ۱۳۳۸ء کو ایک مجلس شوریٰ منعقد کی۔ تیسرے ایڈورڈ نے اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کیا اور شہنشاہ سے' نیز مقدس رومی سلطنت کے دیگر حکمرانوں سے' التجا کی کہ ؔوالوا کے فلپ سے انصاف حاصل کرنے میں اس کی مدد کریں کیوں کہ فلپ غیر منصفانہ طور سے پلانٹاگینٹ کے پرانے مقبوضوں اور فرانس کے تاج پر متصرف ہے۔ لوئی نے ایڈورڈ کی درخواست کو اپنی مقتدرانہ حیثیت میں قبول کیا اور خود ہی اس نے فلپ پر چوری کا الزام عائد کیا کیوں کہ اس نے ان جاگیروں کا، جو شہنشاہت کی طرف سے اسے ملی تھیں' خراج ادا کرنے سے انکار کیا تھا۔ اپنے بڑے بڑے ماتحت حکمرانوں کی رضامندی سے شہنشاہ نے فلپ کے متعلق اعلان کیا کہ اب اسے "مقدس رومی سلطنت کی حفاظت کا قطعاً کوئی حق نہیں رہا" اور اس نے تیسرے ایڈورڈ کو دریائے رائن کے بائیں کنارے کے جملہ صوبوں میں سات سال کے لیے اپنا نائب مقرر کیا اور ساتھ ہی اس کو فوجی انتظام اور اقتدار اعلیٰ کے جملہ حقوق بھی عطا کیے۔ مجلس شوریٰ کا ایک اور اجلاس علاقہ لمبورگ میں بمقام ہرک منعقد ہوا اور تیسرے ایڈورڈ نے ایک تخت پر بیٹھ کر اور اپنے سر پر تاج رکھ کر شہنشاہی باجگزاروں کی "وفاداری اور اطاعت شعاری" کا اظہار قبول کیا۔

56

قرون متوسطہ میں مختلف حکمران اپنے دعووں کو اچھی بنیادوں پر قائم کرنے کی جو محتاط کوشش کرتے تھے اس کا منشا سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اس بات کا مظاہرہ کریں کہ انصاف انھیں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ یہ چیز ہمیں رائے عامہ سے ان کی اپیلوں میں بھی ہویدا نظر آتی ہے۔

پوپ سے جھگڑے کے دوران میں دوسرے فریڈرک نے یکے بعد دیگرے کارڈینلوں (صدر پادریوں) اور رومی باشندوں اور عیسائی حکمرانوں سے ایسی ہی اپیل کی تھی۔ اس نے عیسائی حکمرانوں کے نام ایک خط میں یہ کہہ کر پوپ کے دعووں کی تردید کی ہے کہ یہ مذہبی اقتدار، اپنی عظمت کے لیے، اصل میں دنیاوی اقتدار ہی کی عنایت کا رہین منت ہے۔ اور اس کے باوجود وہ اس کے احسانات کو بھلا رہا ہے اور مقدس رومی سلطنت کو اپنے قدموں میں روندنا چاہتا ہے۔ حالانکہ سابق میں وہ خود انگلستان کے بادشاہ اور دیگر حکمرانوں کے ایک ماتحت کے رتبے پر پہنچ چکا تھا۔

ایک اور اہم واقعہ، جس میں اس طرح کی اپیل راست نہیں کی گئی تھی بلکہ بالواسطہ اور ایک حد تک پوشیدہ تھی، اس وقت پیش آیا جب پہلا ایڈورڈ حکمرانی کر رہا تھا۔ پوپ آٹھویں بونی فاس نے اسکاٹ لینڈ سے متعلق ایڈورڈ کی اختیار کردہ سیاست کے متعلق مشوروں اور تنبیہوں میں ناکام ہونے کے بعد، اس بات کا دعویٰ کیا کہ یہ مملکت قدیم زمانے سے کلیسا کے ماتحت ہے اور اس نے انگریز حکمران کے نام حکمنامہ بھیجا کہ اسکاٹ لینڈ کے ان تمام صدر پادریوں کو رہا کر دیا جائے جو قید کر لیے گئے ہیں۔ اور اس کو اس بات کی دعوت دی کہ اگر اسے کوئی دعوے ہیں تو ان کی تائید میں دستاویزیں پوپ کے ملاحظے میں پیش کرے۔

پوپ کا فرمان بادشاہ کو پہنچایا گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ اسے ملک کے اعیان و اکابر کے پاس پیش کرنا چاہتا ہے۔ اور بادشاہ نے

ایک اہم دستاویز تیار کرائی جس کی تالیف کے لیے تمام خانقاہوں کی تاریخوں اور ملک کے عالم ترین پادریوں سے استفادہ کیا گیا تھا۔
یہ دستاویز بظاہر پوپ کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے لیکن اس کا اصل منشا رائے عامہ کو متاثر کرنا تھا۔ یہ ایک عجیب سی چیز ہے۔ اور اس میں خوشی کے ساتھ اس چیز کو واضح کر دیا گیا ہے کہ انگلستان کے آغاز سے متعلق کیا کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بہر حال اس کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد ہو گیا۔ چنانچہ پارلیمان نے پوپ کو ایک زبردست جواب دیا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اسکاٹ لینڈ ہمیشہ ہی سے انگلستان کی ایک جاگیر رہا ہے اور یہ کہ اس علاقے کے متعلق بادشاہ اپنی حقیت کی شہادت پوپ کے پاس نہیں پیش کر سکتا اور اگر وہ چاہے بھی تو پارلیمان اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔
"خوبصورت فلپ" اور پوپ آٹھویں بونی فاس میں جو جھگڑے ہوئے ان کے سلسلے میں ایک سے زیادہ مرتبہ رائے عامہ سے اپیل کی گئی۔ لندن کے محافظ خانۂ دستاویزات میں اس عہد کا ایک تذکرہ پایا جاتا ہے۔ واقعات پارس میں پیش آئے ہیں۔ "سینٹ جان بپتسمہ دہندہ" کی عید کے موقعے پر اورلیاں کے اسقف نے "بادشاہ، اس کے بچوں، آرک بشپوں" اسقفوں، پادریوں، حکمرانوں، فرانس کے مذہبی افسروں، مذہبی سلسلوں کے بڑے لوگوں اور عوام الناس کی ایک بڑی تعداد کے سامنے" ایک وعظ کیا تھا جس میں اس نے واضح کیا تھا کہ پوپ نے بادشاہ پر حملہ کیا ہے اور یہ کہ بادشاہ اور اس کے مشیروں نے چند چیزیں مرتب کی ہیں جن سے دین کی ترقی مقصود ہے ایک پادری اس کا لاطینی متن پڑھتا ہے اور دوسرا اسے فرانسیسی میں سناتا ہے۔ اس آخر الذکر نے یہ بھی اضافہ کیا کہ فرانس کے بادشاہ ہمیشہ ہی راسخ العقیدہ رہے ہیں اور یہ کہ انھوں نے کلیسا اور اسقف روما کے ملکن کی، اور دیگر عیسائی بادشاہوں کے بالمقابل، زیادہ بہتر

حفاظت کی ہے۔ چنانچہ اس نے یہ بھی کہا کہ: "پوپ غلطی میں غلطاں ہے: وہ یہ کہتا ہے کہ ابدی زندگی کا کوئی وجود نہیں اور اس لیے اس نے روما کی ایک بڑی شخصیت کی توبہ قبول کرنے سے انکار کیا ہے حالانکہ وہ مر رہا تھا۔ اس کو اصرار ہے کہ روما میں مذہبی چیزوں کی خرید و فروخت ممنوع رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خرید و فروخت کا اجارہ خود اس کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ اسے جادوگروں اور جادوگرنیوں پر اعتقاد ہے۔ اس نے کلیسا کی حیثیت گھٹا دی ہے۔ اور اس کی حیثیت کو روز بروز ان جنگوں کی وجہ سے کم ہی کرتا رہا ہے جو اس کے اپنے افعال سے ناگزیر ہو جاتی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ عیسائی قانون کو تباہ کر دے۔ اس نے یہاں تک کہا ہے کہ کلیسائیت کی تباہی اسے زیادہ منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ فرانس کے بادشاہ اور بادشاہت کو تباہ کرنے کے متعلق اس کی تجویز کا نفاذ نہ ہو سکے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ روما کا کلیسا ہی واحد اور اکیلا کلیسا ہے۔ اور اس نے بیان کیا ہے کہ وہ ایک فرانسی کی جگہ ایک کتا ہونا پسند کرتا ہے۔" اس پادری نے، جس کا نام ژریل ژرمونیو تھا، مزید برآں یہ کہا کہ "پوپ کو اس کی غلطیوں میں باقی رہنے نہیں دیا جاسکتا"۔ ان کے علاوہ اور بھی شکاینوں کا دروازہ کھولا گیا تھا۔ اس کے بعد دو راہبوں نے وعظ کیا۔ پھر پاریس کے ایک معزز شخص نے اٹھ کر حاضرین سے یہ کہا کہ وہ بتائیں کہ آیا وہ اس سے متفق ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ وہ بادشاہ اور اس کی بادشاہت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ چند افسران تصدیق کنندہ ان کے جواب کی یادداشت لیں گے۔ حاضرین کی اکثریت نے چلا کر کہا کہ: ہاں ہاں۔ اور دوسرے ہی دن بادشاہ نے "بھیکو راہبوں" کے پاس [جو صرف بھیک پر پلنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے] اپنے تصدیق کنندہ افسر بھیجے اور ہر ایک کے خیالات دریافت کروائے۔

58

ایسے بہت سے لوگ پائے گئے جنھوں نے انکار میں جواب دیا اور ایسے سبھوں کو حکم ملا کہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔
ثالوا کے فلپ اور تیسرے ایڈورڈ کے جھگڑے کے سلسلے میں متعدد بیانات شایع ہوئے۔
"خوبصورت شارل" کی وفات ۱۳۲۸ء میں ہوئی اور اس کی بیوی ژان دیفٹ روجون کہ حاملہ تھی اس لیے ثالوا کے کونٹ فلپ کو نائب السلطنت بنایا گیا۔ مگر ملکہ کو ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس پر ثالوا کے فلپ اور انگلستان کے تیسرے ایڈورڈ' دونوں نے "تاج فرانس پر اپنے حقوق جتانے شروع کیے۔ ان میں سے فلپ اگر "خوبصورت شارل" کا چچازاد بھائی تھا تو ایڈورڈ اس کا بھانجا۔ اس پر ملک کے تینوں بڑے طبقے یعنے پادری' امراء' اور مابقی عمائد مدعو ہوئے جن میں تمام معززین' پادری' علماء اور ملک کے وہ تمام دیگر لوگ شامل تھے جو اس طرح کے معاملات کے ماہر تھے۔ بحث دو نکات پر ہوئی۔ ایک تو قدیم سالیکی قانون [قدیم وحشی فرانس کا] اور دوسرے رواج عام۔ سالیکی قانون میں لاطینی میں بیان ہوا تھا کہ "سالیکی سرزمین کا کوئی حصہ عورت کو وراثت میں نہیں مل سکتا؛ وہ پوری کی پوری مرد وارث کو ملے گی"۔ چنانچہ اب تاج فرانس کے متعلق اس کا اطلاق کیا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ "خدا، عقل اور انصاف کے مطابق فلپ کا حق سب سے زیادہ ظاہر ہے"۔
۱۳۲۹ء میں ایڈورڈ نے بادشاہ فرانس کی سرداری کو گوی آین کی ڈیوکی اور پوں تیو کی کونٹی اور دیگر علاقوں کے متعلق' جو فرانس میں اس کے قبضے میں تھے' تسلیم کیا' لیکن اس نے صرف یہ اعتراف کیا کہ اس "تسلیم" سے منشا صرف ایک توسّل کو ماننا ہے۔ البتہ اس نے صرف ایک عمومی "تسلیم" پیش کی جس میں یہ وعدہ تھا کہ جونہی وہ انگلستان پہنچے گا وہ اپنے محافظ خانے میں دستاویزوں کی

تلاش کرائے گا کہ آیا یہ تسلیم اس قسم کی ہونی چاہیے جیسی کہ فالوا کے فلپ کی خواہش تھی اور اگر اس کا جواب اثبات میں نکلے تو وہ حسبہ اعلان کرے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے منشور کے ذریعے سے جس پر اس کی بڑی مہر کا نشان ثبت تھا، ۳۰ مارچ سنہ ۱۳۳۱ء کو اس وعدے کی تکمیل کی۔ لیکن سنہ ۱۳۳۵ء میں ان دونوں بادشاہوں میں غلط فہمی شروع ہوگئی۔ سنہ ۱۳۳۶ء میں فلپ نے ایڈورڈ سے یہ دریافت کروایا کہ آیا یہ واقعہ صحیح ہے کہ وہ فلپ کے جانی دشمن روبیر دار تو ا سے ساز باز کر رہا ہے جسے فرانس سے جلا وطن کیا گیا تھا؟ ایڈورڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فلپ نے حکم دیا کہ کوئی شخص جو اس کا وفادار ہو "روبیر" کو کسی قسم کا مشورہ، آرام یا مدد نہ دے۔" پھر اس نے تیسرے ایڈورڈ کے خلاف اس بنا پر کارروائی شروع کروائی کہ ہر مقتدر اعلیٰ کو اپنے ماتحتوں پر حق ہوتا ہے اور پے ری گور کے افسر انصاف کو اس پر مامور کیا کہ گوی آین کا علاقہ ضبط کرلے۔

اس کے جواب میں تیسرے ایڈورڈ نے ایک اعلان شایع کیا جس میں وہ شکایتیں درج تھیں جو اسے فرانس کے فلپ کے خلاف پیدا ہوئی تھیں، اور فرانس کے لیے نائبان عمومی نامزد کیے۔ اس نے "بادشاہ انگلستان و فرانس" کا لقب اختیار کیا۔ اور اپنے ہتھیاروں کے نشان میں چیتے کے ساتھ لیلی کے پھول بھی بنائے۔ فلپ اس پر ناراض ہوا اور اس کے جوابوں میں ایک عجیب چیز ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اس کے خیال میں ایڈورڈ کے خلاف کارروائی مہمل تھی "کیوں کہ وہ اس طرح یہ ظاہر کرتا نظر آتا تھا کہ وہ اپنے جزیرے کو ترجیح دے رہا ہے جو فرانس کی طاقتور بادشاہت کے سامنے ایک حقیر مالیت رکھتا ہے۔" سنہ ۱۳۴۰ء میں ایڈورڈ نے اپنے خطاب میں ترمیم کی اور اپنے آپ کو "بادشاہ فرانس و انگلستان اور سردار آیرستان" سے موسوم کیا۔

اثنائے جنگ میں بادشاہ انگلستان نے اپنی قوم سے ایک راست اپیل کی۔ ایک نوٹ آرک بشپوں، اسقفوں اور سربرآوردہ جاگیرداروں کو

مخاطب کر کے شایع کیا گیا۔ اس میں یہ یاد دلایا گیا تھا کہ ایڈورڈ نے جنگ نہ ہونے دینے کے لیے ڤالوا کے فلپ کو اچھی سے اچھی تجویزیں پیش کیں۔ اور آخر میں اس کا جو جواب ملا تھا اسے بھی بیان کیا گیا تھا۔

تیسرے ایڈورڈ نے بتایا کہ فرانسیسیوں نے جہازوں کو پکڑ لیا تھا ملاحوں کو مار ڈالا تھا اور انگریزی ساحلوں پر گھس کر "چوری، قتل، ڈاکے اور دیگر ہولناک جرائم کا ارتکاب کیا تھا"۔ اس نے فرانس کے بادشاہ پر یہ بھی الزام لگایا کہ اس نے اس کے خلاف "پوپ اور عیسائیت کے دیگر اکابر کو" بھڑکایا تھا۔ آرک بشپوں، اسقفوں اور جاگیرداروں کو حکم دیا گیا کہ اس نوٹ کی اطلاع پادریوں اور عوام الناس کو دیں اور ان سب کو بادشاہ کی مدد کے لیے آمادہ کریں۔[۱]

یہی چیز اس خط میں بھی نظر آتی ہے جو بادشاہ نے ۱۳۴۶ء میں ڈومی نیکن فرقے کے ایک صدر پادری کو لاطینی میں لکھا تھا کہ وفاداروں اور پادریوں پر یہ امر "عمومی اور خانگی اجتماعوں میں وعظوں کے ذریعے سے" واضح کرے کہ ڤالوا کے فلپ کے خلاف جنگ کے کیا اسباب ہیں۔[۲] فرانس کے بادشاہ نے انگلستان کے بادشاہ کی اس بارے میں پیروی کی اور اس نے بھی رائے عامہ کو مخاطب کیا۔ ان دونوں بادشاہتوں میں گرجوں کے خطبہ گاہ اُن اپیلوں سے گونجنے لگے جن میں جنگ کو درست ٹھیرایا جا رہا تھا۔[۳] فرواسار نے ہمیں بتایا ہے کہ ٹولوز کا آرک بشپ "ایک بڑا پادری اور بہادر شخص" تھا جو "اس طرح اور اس عمدگی سے فرانس کے بادشاہ کے جھگڑے کا" پرچار کرتا تھا کہ پورا جنوبی علاقہ فرانس کی طرف مائل ہو گیا۔ بالکل اسی کے مماثل طریقے پر انگلستان کے بادشاہ نے

60

۱۔ ریمر کی لاطینی کتاب "علیفیاں" جلد (۲) حصہ سوم صفحہ ۱۸۳۔

۲۔ ایضاً جلد (۲) حصہ چہارم صفحہ ۱۹۳۔

۳۔ نوراں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد (۱۰) متعلق بہ "قومیتیں" صفحہ ۳۰۰۔

اپنی مملکت میں پرچار کیا اور لندن میں ایک خصوصی اسقف کا اس غرض کے لیے تقرر کیا کہ متعدد شاندار اور خوش آہنگ پیشین گوئیاں کرے اور اپنے وعظوں اور پیشین گویوں میں لوگوں کو یہ کہے اور ان کو یہ دکھائے کہ فرانس کا بادشاہ اور وہاں کے لوگ نہایت سخت غلطی اور ناانصافی میں مبتلا ہیں اور انھیں نے جنگ کا دوبارہ آغاز کیا ہے۔ اور ان کا یہ فعل ان مختلف وجوہ اور اسباب کے باعث، جو اس نے واضح کیے تھے، حق اور معقولیت کے خلاف تھا۔" آخر میں فرواسار نے لکھا ہے کہ "ہر دو بادشاہوں کے لیے جنگ کے باعث یہ ناگزیر بھی تھا کہ اپنے جھگڑے کے وجوہ مرتب کر کے اپنی رعایا کو بتائیں اور اس سے ہر ایک بادشاہ کو یہ توقع تھی کہ اس کے حق میں زیادہ زبردست تائید کا جذبہ پیدا ہو سکے گا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ہر دو سلطنتوں میں ہر کوئی انہیں جذبات سے معمور ہو گیا۔"[1]

تیسرے ایڈورڈ نے ایک اور موقعے پر پوری عیسائی دنیا کو مخاطب کیا۔ ۱۳۵۶ء میں فرانس کے بادشاہ نے دعویٰ کیا تھا کہ نوار کے شارل نے فرانس کے بٹوارے کے لیے بادشاہ انگلستان سے ساجھا کر لیا ہے۔ تیسرے ایڈورڈ نے ایک سہ گانہ احتجاج بادشاہ ژاں کے طرز عمل کے خلاف کیا۔ ایک احتجاج تو پوپ کو مخاطب کر کے کیا گیا تھا، دوسرا شہنشاہ کو اور تیسرا ایک کھلی چٹھی کے طور پر حضرت مسیح پر ایمان لانے والے تمام بادشاہوں حکمرانوں، ڈیوکوں، مارکوئیسوں، معزز لوگوں اور عوام کو۔

قرون متوسط میں سیاسی ضرورتوں سے اپنے دعووں کی تائید کے دلائل واضح کرنے کی جو ضرورت پیش آتی تھی اس کا ایک نیا مظاہرہ اس طور سے ہوا تھا کہ قانونی مشوروں کے ذریعے سے اپنے دعووں کی تائید حاصل کی جائے۔ چنانچہ مونت روئی کے ژاں نے جو شہر لیسل کا اعلیٰ حاکم عدالت تھا اور پانچویں شارل اور چھٹے شارل کے زمانے میں

---

[1] فرواسار کی فرانسیسی کتاب "تواریخ" جلد (۱) حصہ دوم باب (۲۶۷)

زندہ تھا، اپنی ایک فرانسیسی تالیف میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کا نام "سابق بادشاہ انگلستان تیسرے ایڈورڈ نے تاج شاہی پر جو حقوق جتائے تھے اس کے اسباب پر مشتمل رسالہ" ہے۔ مولف نے اس میں یہ ثابت کرنے کا دعوی کیا ہے کہ "یہ ایک رواج اور حکم ہے جو اس وقت سے برابر چلا آرہا ہے جب سے کہ فرانس میں عیسائی بادشاہ ہوئے اور جس کی شارلیمان نے بھی صراحت کے ساتھ توثیق کی ہے کہ کوئی عورت، یا ایسا مرد جو کسی عورت کی اولاد میں ہو اور فرانس کے شاہی خاندان کے کسی مرد کی اولاد میں نہ ہو، تو وہ ہرگز جانشین نہیں بن سکتا اور فرانس کے تاج کا وارث ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ قاعدہ فرانس میں اس وقت سے بنا چلا آرہا ہے جب سے کہ وہاں عیسائی بادشاہ ہونے لگے ہیں اور شارلیمان نے بھی اس کی توثیق کی ہے اور یہی سالیکی قانون ہے۔"

61

اپیل کی ایک اور مشہور مثال "عمومی جھگڑا" نامی رسالہ ہے جو سنہ ۱۳۰۰ء میں بادشاہوں، حکمرانوں، جاگیرداروں، شہروں اور روئے زمین پر بسنے والے تمام ایمان والوں کے نام شایع کیا گیا۔ اس میں پولینڈ کے لاڈسلاس اور لتھوانیا کے وی تولد نے راہبوں کے ٹیوٹانی سلسلے کے شہامت باز سورماؤں کی زیادتیوں کو برا بھلا کہا ہے۔

ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ ہم یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ ۱۷ اپریل سنہ ۱۵۳۶ء کو شارل کین (یعنے پانچویں شارل) نے پوپ، اعلیٰ پادریوں کی مقدس جماعت، اور شہر روما میں رہنے والے سفیروں کی موجودگی میں ایک تقریر کی تھی جس میں اس نے اپنی سیاست خارجہ کے اہم خط و خال بیان کیے تھے۔ ماکون کے اسقف نے جو فرانسوا اول کا سفیر تھا، فوراً "اس سے یہ واضح کرنے کی خواہش کی کہ وہ صاف صاف الفاظ میں فرانسوا اول کے متعلق اپنی سیاست کی تفصیل بیان کرے۔ شارل کین نے جواب دیا کہ اس نے یہ تقریر پوپ کی ذات تقدس مآب کو اور پوری دنیا کو اپنے افعال کا جائزہ دلانے کے لیے کی تھی اور منشا یہ ہے کہ رہتی دنیا تک

لوگ خود یہ فیصلہ کر سکیں کہ اس میں اور فرانس کے بادشاہ میں کیا معاملہ پیش آیا تھا۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ جو جھگڑے پیدا ہو چکے ہیں وہ صرف تین ہی طریقوں سے ختم ہو سکتے ہیں یعنے یا تو نہایت خونریز جنگ کے ذریعے سے جو عیسائی جمہوریت کے لیے انتہائی نامناسب چیز ہوگی۔ یا اس طرح سے کہ وہ اور فرانسوا اول شخصی طور سے دو دو ہاتھ کر لیں۔" جس میں ہر ایک اپنا لبادہ اوڑھا ہوا ہو اور تلوار اور خنجر ہاتھ میں ہوں کیونکہ دو میں سے کسی ایک کا مر جانا زیادہ چھوٹی برائی ہوگی بہ نسبت اس کے کہ بہت سا عیسائی خون بہایا جائے۔" یا بالآخر اس طرح سے کہ دونوں میں ایک مناسب صلح ہو جائے۔ شہنشاہ نے مزید برآں یہ بھی کہا کہ وہ اپنی تقریر کی نقل پوپ کو بھیجے گا اور اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ اسے چھپایا جائے تاکہ پوری دنیا اس سے واقفیت حاصل کر سکے۔[1]

---

[1] گاشار کی فرانسیسی فہرست "سرکاری کتب خانہ پاریس کے مخطوطات متعلق بہ تاریخ بلجیم کے انتخابات" جلد (۱)، صفحہ ۴، ۴۷)۔

فصل دوم

عملی طریقے

جدید نظریے کے مطابق اصطلاح "انتقام" یا مواخذے میں وہ تمام واقعاتی کارروائیاں شامل ہوتی ہیں، جو کوئی حکومت اس غرض کے لیے کسی دوسری مملکت یا اس کی رعایا کے جان و مال کے خلاف عمل میں لاتی ہے کہ زیر بحث اختلافی مسائل کے متعلق یا تو حق حاصل کرے یا اُن کے متعلق کوئی منصفانہ تلافی چاہے یا ضرورت پڑے تو انصاف اپنے ہاتھوں میں لے[1]۔ اس کے متعلق جو فرانسیسی اصطلاح (رپ ری زائی) ہے وہ اطالوی سے ماخوذ ہے اور اس کے لفظی معنے مواخذہ یعنی باز گرفت یا دوبارہ پکڑ لینے کے ہیں۔

اس وسیع مفہوم میں اگر انتقام کی اصطلاح کا استعمال کریں تو قرون متوسطہ میں عام طور پر اس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ حیوانی قوت کا استعمال کیا جائے اور لڑائی جھگڑوں کا آغاز کر دیا جائے، بجائے اس کے کہ مسالمانہ تعلقات برقرار رکھنے کے لیے ہاتھ بٹایا جائے۔

لیکن انتقام میں ایک اور خصوصی مفہوم بھی داخل ہوتا ہے۔ یعنی

---

[1]۔ بہترسی فرانسیسی کتاب "یورپ کا قانون بین الممالک" ث ۱۰۱۔

اس میں ایک قسم کا قبضہ یا ضبطی بھی شامل ہوتی ہے[1]۔ پرانے مولف انتقام کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں: عمومی اور خصوصی۔ انتقام عمومی سے مراد یہ ہوتی ہے کہ متضرر مملکت اپنے جملہ آدمیوں کو اس کی اجازت دے کہ ضرر رساں مملکت اور اس کی رعایا کی ذات وجائداد پر قبضہ کریں۔ انتقام خصوصی سے مراد یہ ہوتی ہے کہ متضرر مملکت اسی قسم کا اختیار چند معین افراد کو عطا کرے۔ یہ دونوں اس قاعدے کے تحت آجاتے ہیں جو بنکر شوئیک نے مرتب کیا ہے کہ نہ تو انتقام عمومی سے حالت صلح ختم ہوتی ہے اور نہ انتقام خصوصی سے۔ اس کے لاطینی الفاظ یہ ہیں کہ "انتقامی کارروائی بجز حالت صلح کے کسی اور صورت میں وقوع میں نہیں آسکتی"[2]۔

لیکن ایک چیز بیان کرنے کے قابل ہے وہ یہ کہ اس کے بہت دنوں بعد تک بھی جنگ کی ہولناکیاں باقی رہیں۔ اور اگر اس میں کوئی اشک شوئی کی چیز تھی تو یہ تھی کہ رفتہ رفتہ وہ بدترین ادارے ختم ہوتے چلے گئے جو جنگ شروع کرانے میں مدد دیتے یا اس کو بھڑکاتے تھے۔ غلام بنانا، انتقامی کارروائی کرنا، خانگی افراد کا جنگ شروع کرسکنا — یہ سب کمزور ہوتے گئے۔ اور بالآخر ختم ہوگئے۔ دشمن کی خانگی جائداد اسی زمانے میں خشکی کی لڑائیوں میں محفوظ سمجھی جانے لگی تھی اور وہ لمحہ دور نہ تھا جب حق و انصاف کو ایک اور مستقل فتح حاصل ہو اور بحری لڑائی میں بھی دشمن کی خانگی جائداد گرفتاری سے محفوظ سمجھی جانے لگے۔

انتقام کا متعلقہ مواد ہماری توجہ مبذول کرالیتا ہے۔ چنانچہ قانون بین الممالک کی ایک سے زیادہ چیزوں کی اس سے توضیح ہوجاتی ہے اور یہ ایک ایسا باب ہے جو بین الممالک تعلقات کے ارتقاء کی تاریخ کے متعلق دلچسپی سے خالی نہیں۔

63

[1] دوکانژ کی لاطینی لغت "قرون متوسطہ کے مولفوں کی استعمال کی ہوئی لاطینی اصطلاحیں" بر موقع۔

[2] بنکر شوئیک کی لاطینی کتاب "قانون عمومی کے مسائل" جلد (۱)، باب (۲۴)۔

نظریۂ انتقام اس تصور پر مبنی ہے کہ جو چیز کسی ایک جسد (یعنی جماعت) کے فرائض میں داخل ہو وہ اس جسد کے ہر عضو پر بھی فرض ہوگی۔ چنانچہ اس نظریے کے تحت پوری جماعت کسی جرم یا فعل ناجائز کی ذمہ دار قرار پاتی ہے، چاہے اس کا ارتکاب اس جماعت کے صرف ایک فرد ہی نے کیوں نہ کیا ہو۔ بشرطیکہ اس جماعت نے اپنے اس فرد کو اس جرم کے ارتکاب سے روکنے میں کامیابی حاصل نہ کی ہو[۵] اس اصول پر صدیوں عمل کیا جاتا رہا۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرون متوسطہ میں اس کو ہمیشہ تسلیم کیا جاتا رہا۔ کسی مملکت کی جملہ رعایا کسی زیادتی کی ذمہ دار قرار دی جاتی تھی، چاہے اس کا ارتکاب ان میں سے صرف ایک فرد ہی نے کیوں نہ کیا ہو۔ اسی طرح زیادتی کا ارتکاب مملکت کے کسی ایک فرد کے خلاف کیا جاتا تو سمجھا جاتا کہ اس کا ارتکاب پوری مملکت کے خلاف عمل میں آیا ہے۔ خود کلیسا نے بھی یہ قاعدہ اختیار کر لیا تھا۔ اور بارہا کسی ایک شخص کے قرض یا ایسے فعل ناجائز کی جس کی سزا نہ دے دی گئی ہو ذمہ داری پورے ملک پر عائد کی جاتی۔ اور اس ملک کے تمام پادریوں کو اپنے فرائض کی انجام دہی سے منع کر دیا جاتا۔

اس اجتماعی ذمہ داری کا تصور قرون متوسطہ کے سماج میں کچھ اس شدت سے سرایت کر گیا تھا کہ عرصۂ دراز تک انتقام کے لیے جو ضبطیاں عمل میں آجاتیں، ان کو درست قرار دیا جاتا رہا اور اس کے لیے کسی اجازت کی تک ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک حکمران کی رعایا کو دوسرے حکمران کی رعایا سے کوئی نقصان پہنچتا تو متضررین کو حق ہوتا کہ ضرر رسانوں ہی کے نہیں بلکہ ان کے ملک کی جملہ رعایا کے خلاف ہر قسم کی عملی کارروائیاں اختیار کریں، اگر ان کو ان کے نقصان کی تلافی نہ کر دی جائے۔ بعض سفارتی دستاویزوں میں بھی اس نکتے کو پوری طرح

---

[۵] موولا کلا فیبیئر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ ۲۲۶۔

تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ خاص کر ۱۲۲۸ء، ۱۲۳۵ء اور ۱۲۳۸ء کے معاہدوں میں جو انگلستان و فرانس میں طے ہوئے تھے، یہ چیز نظر آتی ہے۔ ۳ر فبروری ۱۲۳۵ء کو جو معاہدہ طے ہوا تھا، اس میں ایک فقرہ صراحت کے ساتھ اسی کے متعلق ہے۔ اور یہی فقرہ بعض بعد کے معاہدوں میں بھی دہرایا جاتا نظر آتا ہے۔[1]

ایسی نظیریں ملتی ہیں کہ انتقامی کارروائی کے سلسلے میں صرف خانگی طور سے جنگ کر دی گئی ہو۔ چنانچہ تقریباً ۱۲۹۲ء میں دو ملاح تھے۔ ان میں سے ایک نارمنڈی والا تھا اور دوسرا انگریز۔ بائیون کی بندرگاہ میں انھوں نے آپس میں ایک جھگڑا مول لیا اور مارپیٹ تک نوبت پہنچی اور انگریز نے اپنے حریف کو زخمی کر دیا۔ چونکہ بائیون کے حکام عدالت نے کوئی کارروائی اختیار نہیں کی، اس لیے نارمنڈی والے ملاحوں نے بادشاہ فرانس سے اپیل کی۔

64

"خوبصورت فلپ" نے اس موقع پر ڈھیل دہی سے جو انکار کیا وہ ایک ناقابل معافی غفلت تھی۔ اس پر نارمنڈی والوں نے یہ طے کیا کہ انصاف خود ہی حاصل کرلیں اور وہ سب سے پہلا انگریزی جہاز جو ان کے ہاتھ آئے چھین لیں۔ اور جہاز پر جتنے بھی لوگ ہوں، چاہے چھوٹے یا بڑے سب کو پھانسی دے دیں۔ انگریز ملاحوں نے خوب شور و شر کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں حکومتوں کی کارروائی کے بغیر فریقین نے جلبفیاں بھی

---

[1] چنانچہ لاطینی میں وہ دفعہ یہ ہے "جب کبھی صلح کی حالت میں کسی پر مداخلت (یعنے زیادتی) کی جائے تو اس مداخلت کی تلافی یوں کی جائے گی کہ اس مداخلت [بیجا] کی اطلاع صلح کنندہ حکمرانوں کو دی جائے گی جو خاص اسی غرض کے لیے جمع ہوں گے .... اور اگر اس کے دو مہینے بعد تک بھی معاملۂ نزاعی کی کوئی تلافی نہ کی جائے تو پھر تب معاملۂ نزاعی کا شخص متعلقہ [یعنی مستغیث و متضرر] یہ اختیار رکھتا ہے کہ اپنی نزاع کی پیش رفت خود ہی کرے تاآں کہ مکمل تلافی عمل میں نہ آجائے۔ اور اگر ہم اپنے [ایسے] آدمی کو زیادتی کرنے اور ساتھ ہی تلافی سے انکار بھی کرنے والے کے خلاف کوئی مدد دیں تو یہ مدد ظلم نہ قرار دی جا سکے گی۔"

قائم کریں: ایک نے آئرلینڈ اور ہالینڈ والوں سے اور دوسرے نے فلانڈرس اور جے نوا والوں سے۔ اور نارمنڈی والوں کے دو سو جہاز انگریزی سمندروں میں دندناتے ہوئے پہنچے اور ان تمام انگریز ملاحوں کو مار ڈالا جو ان کے ہاتھ میں پڑتے رہے۔ انگریزوں نے بھی ایک بیڑا تیار کیا اور کہتے ہیں کہ انھوں نے ہزاروں نارمنڈی والوں کو قتل کر ڈالا۔ اس قدر خون خرابے کے بعد آخر دونوں ملکوں کے بادشاہوں نے اپنی رعایا کے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "خوبصورت فلپ" نے ایڈورڈ اول کو غداری کے الزام میں اپنے بڑے بڑے باتمت حکمرانوں پر مشتمل عدالت میں جوابدہی کے لیے طلب کیا اور جب انگلستان کے بادشاہ نے اس کی تعمیل نہیں کی تو فلپ نے گوی این کی ڈیو کی (جو ایڈورڈ کی مملوکہ تھی) ضبط کر لی۔[1]

انتقام جس طور سے لیا جایا کرتا تھا، اس سے ایک ہولناک خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے شہنشاہی دستوروں میں اور پادریوں کی مجالس شوریٰ کے احکام میں اس کو مردود قرار دیا گیا ہے۔ شہنشاہ دوسرے فریڈرک نے تو یہاں تک دعویٰ کیا کہ اس نے انتقامی کارروائیوں کو اور خانگی جنگوں کو منسوخ قرار دے دیا ہے۔ اور ۱۲۷۴ء میں لیوں میں جو عمومی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی تھی اس نے بھی ان دونوں چیزوں کو نصفت کے خلاف قرار دیا تھا۔

ان شاہی و مذہبی احکام کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کا کوئی مکمل حل تو حاصل نہ ہو سکا، لیکن بعض ناکمل وسائل سے کسی قدر اصلاح عمل میں آسکی۔ چنانچہ اس کو تو تسلیم کیا گیا کہ قوت کا استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اس پر بعض پابندیاں اور بعض شرطیں بھی عائد کر دی گئیں۔ یہ اصلاح ابتداءً اٹلی میں ہوئی۔ چونکہ وہاں خود مختار شہروں کی

---

[1] وارڈ کی انگریزی کتاب "یورپ کے قانون بین الممالک کی بنیاد اور تاریخ کی تحقیق" جلد (۱) صفحہ ۲۹۵۔

بہت بڑی تعداد پائی جاتی تھی اور ان کے تجارتی تعلقات بہت ترقی یافتہ تھے، اس لیے وہاں قانون انتقام کو ایک منظم صورت دی جا سکی۔ مختلف شہروں کے دستور اور مختلف جمہوریتوں میں طے شدہ معاہدے یہ قرار دینے لگے کہ اگر کوئی اجنبی اپنی ذمہ داری کی تعمیل سے انکار کرے تو قرض خواہ کو چاہیے کہ اس اجنبی پر اختیار سماعت رکھنے والے حاکم عدالت کے ہاں حاضر ہو۔ اور اگر اس کے ساتھ انصاف نہ ہوتا تو اسے اختیار تھا کہ اس بارے میں حکام عدالت کو درخواست دے کر اجازت نامۂ انتقام حاصل کرے۔ ایسے اجازت نامے "منشور انتقام" کہلاتے تھے اور ان میں اس بات کی اجازت ہوتی کہ اس حکومت کی، جس نے انتقام کی اجازت دی ہو، سرزمین میں فریق ثانی یعنی ملزم کے جتنے بھی ہم وطن پائے جائیں، ان سب کی ذات اور جائداد کے خلاف گرفتاری کی کارروائی عمل میں لائی جاسکے۔ گرفتار شدہ اشخاص شہر کے صدر حاکم عدالت کے پاس حاضر کیے جاتے۔ گرفتار شدہ جائداد کے متعلق بھی یہی عمل ہوتا۔ گرفتار کنندہ اپنے طرز عمل کے درست ہونے کو ثابت کرتا۔ گرفتار شدہ اشخاص حبس عمومی میں قید کیے جاتے اور گرفتار شدہ جائداد گرفتار کنندہ کی حفاظت میں رہنے دی جاتی تا آنکہ اس کے ضرر کی تلافی نہ کر دی جائے۔ اگر ایسی کوئی تلافی عمل میں نہ آتی تو گرفتار کنندہ کو اختیار ہوتا کہ گرفتار شدہ لوگوں کے فدیے اور دیگر جائداد سے اپنے نقصان کی تلافی کرے۔ البتہ یہ ضروری ہوتا کہ جو رقم زائد ہوتی وہ واپس کر دینی پڑتی۔

65

انتقام کے ادارے کا یہ سرسری خاکہ ہے۔ کرسٹین ڈیپزان [یعنی شہر پیزا والی کرسٹین جو ایک مشہور مولفہ گزری ہے] اس کی تعریف یوں کرتی ہے کہ :-

"انتقام کا حق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی ملک کی رعیت، خواہ وہ فرانسیسی ہو یا کوئی اور، کسی طاقتور اجنبی کے ہاتھ سے ضرر اٹھائے اور انصاف حاصل نہ کر سکے، تو

ایسی صورت میں بادشاہ اس متضرر کو ایک اجازت نامہ عطا کرے گا جس کی بنیاد پر وہ ضرر رساں کے وطن سے آنے والے تاجروں اور دیگر لوگوں کو پکڑ گرفتار اور قید کر سکے گا، ان کا مال قبضے میں لے سکے گا اور یہ لوگ اس وقت تک ماخوذ رہیں گے جب تک کہ وہ مدعی کو اس کا حق نہ دلا دیں اور نقصان کی تلافی نہ کر دیں[1]"

باوجود ان قیود سے مقید ہونے کے، انتقام کا طریقہ بے انتہا ضرر رساں ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ مختلف حکومتوں نے اس کو بھانپ لیا اور اس زمانے میں جب کہ ہمارے بیان کردہ مفہوم کا ادارۂ انتقام تشکیل پا رہا تھا تو مختلف معاہدے اس غرض کے لیے کیے گئے کہ اس کو منسوخ قرار دیں۔ ایک معاہدہ جو ۱۱۹۵ء ہی میں برلیس اور فیرار میں طے ہوا تھا، اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ان معاہدہ کنندہ شہروں میں سے کسی ایک کا کوئی باشندہ دوسرے شہر کے کسی باشندے سے کوئی معاہدہ کرے تو اسے صرف اپنے مدیون کے خلاف چارۂ کار حاصل ہوگا نہ کہ اس مدیون کے ضامنین کے خلاف۔ وہ اصل میں گویا ضامن ہی سے معاہدہ کرتا ہے۔ موراتوری نے اس قسم کے معاہدوں کی متعدد مثالیں دی ہیں[2]۔

ہامبورگ کے رسم و رواج میں بھی یہی اصول تسلیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہاں بیان کیا گیا تھا کہ "ہر شخص کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس سے

---

[1]۔ کرسٹین ڈی پیزان کی فرانسیسی تالیف "ہتیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" حصۂ چہارم باب (۲) مخطوطۂ کتب خانۂ شاہی واقع بروسل مخطوطہ نشان (۹۰۱۰)۔

[2]۔ موراتوری کی لاطینی کتاب "قرون متوسط کے اطالوی آثار" جلد ۴ صفحہ ۳۰۴، و مابعد۔ انچاسویں بحث جو آپس میں شریک وفاق اور باہم مسالمانہ تعلقات رکھنے والے شہروں کے متعلق ہے — اسی کتاب کی جلد ۴ صفحہ ۷۴۱، و مابعد میں پچپنویں بحث "انتقام"۔

معاہدہ کر رہا ہے۔ دائن کو چاہیے کہ اپنے مدیون کے خلاف ایسی عدالت میں نالش دائر کرے جو اس پر قدرتی طور سے اختیار سماعت رکھتی ہو۔ اور اگر اسے وہاں انصاف حاصل نہ ہو تو [شہر ہامبورگ کی] مجلس اس کی مدد کرے گی۔"

ایک معاہدۂ صلح ۱۱۶۷ء میں شہر بروگیس میں فلانڈرس کے نواب اور ہینو کے فلوراں میں طے ہوا تھا۔ اس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ "اگر فلانڈرس والوں میں سے کوئی ہالینڈ کی سرزمین میں لٹ جائے یا اس کا مال چوری جائے تو جس جگہ واقعہ پیش آئے وہاں کے باشندوں کا فرض ہوگا کہ وہ مال واپس دلائیں اور لٹیرے کو رہا کر دیں۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرنا چاہیں تو ہالینڈ کا جاگیردار چھے پنچوں کی مدد سے خود ہی یہ کام انجام دے گا۔۔۔۔۔ یہ کہ اگر فلانڈرس کا کوئی تاجر ہالینڈ سے گزرتے ہوئے کسی قرض کے باعث گرفتار ہو جائے تو وہ تاجر ایک اقرار پر اس سے چھٹکارہ پائے گا اور اس کے سفر میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوگی۔ لیکن اگر گرفتار کنندہ کا اس سے اطمینان نہ ہو تو اسے چاہیے کہ اس تاجر کو کسی عام حاکم عدالت کے سامنے پیش کرے۔ اور اگر اس کے پیش کردہ اقرار کے باوجود اس تاجر کو روک رکھا جائے یا اس پر کوئی موانع عائد کیے جائیں تو ہالینڈ کا جاگیردار اسے اس کے جملہ اخراجات اور ہرجہ مع سود ادا کرے گا۔"

انگلستان میں تیسرے ہنری نے لیوبک کے معززین کو ایک منشور عطا کیا تھا، جس کی بنا پر وہ اپنے کسی دوسرے ہم وطن کے قرضوں کے باعث گرفتار نہیں کیے جا سکتے تھے بجز اس کے کہ لیوبک کے حکام عدالت مدیون کو ادائی پر مجبور کرنے سے تساہل کریں۔

تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز پر بریمن، اشٹاڈ، ہامبورگ اور اور ہانوفر کے شہروں کو یہ شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ علاقۂ گنٹ کے رہنے والے ان کو ان نقصانوں کا بھی ذمہ دار قرار دیتے ہیں جو سکنی میں فلانڈرس کے تاجروں کے ہاتھوں ان کو پہنچیں؛ اور ان شہروں کے لوگ جب اس علاقے میں جاتے ہیں تو ان سے ایسے نقصانوں کا انتقام

66

لیا جاتا ہے۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ بے قصوروں کو ایک ایسے قصور کی سزا دی جائے جس کے روکنے پر یہ قادر نہ تھے۔ اصل قصوروار تو وہ امراء ہیں جو تاجروں کو لوٹ کر چھپکے سے اپنے مستحکم قلعوں میں چلے جاتے ہیں[1]۔" ان شہروں نے باہم معاہدہ کیا کہ شہر گنٹ کے تاجروں کے ساتھ آیندہ پورا انصاف کیا جائے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں الموحدین کی سلطنت کے حصے بخرے ہونے پر جو عربی یا بربری حکومتیں وجود میں آئیں، ان سے اطالوی شہروں نے معاہدے کیے، اور وہاں بھی اسی کی مماثل تجویزیں نظر آتی ہیں۔ ہم آیندہ یہ چیز واضح کریں گے کہ مغرب یعنی بحر متوسط کے ساحل پر طرابلس سے مراکش تک اسلامی طاقت کو کس طرح عروج حاصل ہوا۔ یہاں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ جب یہاں کے حکمرانوں نے اپنے سیاسی مفادات مشرق کے عربوں سے منقطع کر لیے تو ان کے تجارتی تعلقات عیسائیوں کے ساتھ روز افزوں ہوتے گئے۔ چنانچہ متعدد معاہدے طے کیے گئے اور ان معاہدوں میں بتایا گیا ہے کہ نہ صرف شخصی آزادی، کاروباری آزادی، سکونت گاہ اور کلیساؤں کی بے روک ٹوک اجازت اور (ان کے اپنے) قونصلوں کا ان پر اختیار سماعت ہوگا بلکہ یہ اہم اصول بھی تھا کہ ذمہ داری خالص انفرادی رہوگی۔ اور طے ہوا تھا کہ کسی عیسائی کو نہ تو تکلیف دی جائے اور نہ اس سے بازپرس کی جائے جب کہ قرض یا جرم یا فعل ناجائز یا کوئی اور قابل مواخذہ کام کسی اور عیسائی کا کیا ہوا ہو بجز اس کے کہ یہ اس مجرم کا ضامن ہو[2]۔ ایک معاہدے میں جو ۱۲۳۱ء میں

---

[1] فارن کوئنیش کی تالیف "فلانڈرس کی تاریخ اور اس کے کشوری و سیاسی ادارے" لغایۃ ۱۳۰۵ء کا فرانسیسی ترجمہ جو گیلڈ حلف نے کیا جلد ۲۔ صفحہ ۱۹۳۔

[2] ماس لاتری کی فرانسیسی تالیف "قرون متوسطہ میں شمالی افریقہ کے عربوں کے ساتھ عیسائیوں کے

آراگوں کے بادشاہ اور تولُس کے بادشاہ میں طے ہوا تھا یہ بیان کیا گیا تھا کہ "وہ تاجر شاہی بیان کے بھروسے پر سکونت اختیار کریں گے اور سفر کرینگے اور کسی کو کسی اور شخص کے فعل کے باعث کبھی تکلیف نہیں دی جائے گی"۔

انگلستان کے بادشاہ کے پاس ۱۳۶۹ء میں ایک شکایت پہنچی جو جو قسطیلہ کے بادشاہ نے نہیں بلکہ قسطیلہ اور بسکے کے ملک التجار اور ملاحوں نے کی تھی۔ اور انھوں نے تین سفیر روانہ کیے تھے۔ ان کا دعویٰ اس امر کے متعلق تھا کہ چھے اسپینی جہاز انگریزوں نے پکڑ لیے ہیں، اگرچہ انگلستان اور قسطیلہ میں دوستی کا معاہدہ پایا جاتا ہے۔ بادشاہ انگلستان نے جواب دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنے واجبات کو صرف اسی وقت پورا کرے گا جب قسطیلہ والوں کے ہاتھوں نقصان اٹھائے ہوئے انگریزوں کے متعلق انصاف کیا جائے۔

۶ اکتوبر ۱۳۳۲ء کو جو دستاویز لکھی گئی تھی اس میں یہ نظریہ بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اولاً تلافی کا مطالبہ کیا جانا ضروری ہے۔ اور یہ کہ انتقام کا اجازت نامہ صرف اسی وقت دیا جاسکے گا جب کہ انصاف کرنے سے انکار کیا جائے۔ چنانچہ اس دستاویز کے ذریعے سے تیسرے ایڈورڈ نے اس اجازت نامۂ انتقام کے خلاف احتجاج کیا تھا جو آراگوں کے بادشاہ نے اپنی رعایا میں سے ایک کے وارث کو عطا کیا تھا۔ انگلستان کے بادشاہ نے یہ بتانے کی پرزور کوشش کی کہ آراگوں کے باشندے کو جس معاملے کی شکایت ہے وہ ایڈورڈ دوم کے زمانے میں پیش آیا تھا؛ یہ کہ اس نے خود ہی انصاف کرنے کا پیشکش کیا تھا، یہ کہ متضرر شخص نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ اپنے دعووں کی صحت کو ثابت کرے؛ یہ کہ وہ خود اس پر آمادہ ہے کہ ان جانشینوں کے لیے تلافی کا سامان کرے لیکن خود انھوں نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ تعلقات کے متعلق معاہدات صلح و تجارت اور دیگر دستاویزیں"۔ صفحہ ۸۴۔

جواب دیا ہے کہ وہ مقدمہ چلانا نہیں چاہتے اور انھوں نے ملزموں کا نام بتانے سے بھی انکار کیا ہے۔ تیسرے ایڈورڈ نے اس کے آخر میں یہ لکھا تھا کہ ان حالات میں اجازت نامۂ انتقام کی عطا کا کوئی موقع نہیں ہے اور یہ کہ تجربہ کار اور رائے ظاہر کرنے کے اہل لوگوں کی یہ رائے ہے کہ (اصل لاطینی میں): "عقلمند اور تجربہ کار لوگوں کی نظر میں قانوناً اس کا کوئی حق نہیں ہوتا کہ ہماری اپنی یا ہماری رعایا کی جائداد کے سلسلے میں "اجازت نامۂ سرحد" یا اجازت نامۂ مواخذہ عطا کیا جائے۔"[1]

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں شخصی استثنا عمل میں لائے گئے ہوں۔ چنانچہ فرانس کے آٹھویں شارل کے زمانے میں بادشاہ کی مجلس شوریٰ نے آرتیں یوں کے دو تاجروں کو ایک امن نامہ اور اجازت تجارت عطا کی جس کے تحت ایک سال تک وہ آرتیں یوں کے خلاف عمل میں لائی جانے والی انتقامی کارروائیوں میں شریک نہ سمجھے جائیں گے۔ چنانچہ ان کو اجازت تھی کہ اپنا تمام اسباب اور پورا سامان تجارت لاسکیں بشرطیکہ وہ انھیں کا ہو۔ اور غلط بیانی کی صورت میں اسے ضبط کرلیا جائے گا، نیز ان کا امن نامہ منسوخ سمجھا جائے گا اور مزید برآں بادشاہ حسب صوابدید انھیں سزا دے سکے گا۔[2]

اس کے بعد اس کی مکرر کوششیں کی گئیں کہ اس برائی میں کمی کی جائے۔ چنانچہ ان کوششوں میں سے ایک کے ذریعے سے ایک ادارہ قایم کیا گیا کہ "محافظین امن" مقرر کیے جائیں اور فریقین معاہدہ اپنی شکایتیں انھیں کے پاس پیش کریں۔ اس طرح سے اجازت نامۂ انتقام کے عطا کیے جانے سے بچنے کی کوشش کی جاتی تھی۔[3]

---

[1]- ریمر کی لاطینی کتاب "حلیفیاں"، جلد اول حصہ سوم صفحہ ۱۰۰۔

[2]- مود لا کلا نیئیر کی فرانسیسی کتاب "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ ۲۳۳۔

[3]- بیوتنر کی جرمن کتاب "قانون بین الممالک کی تاریخ اور علم پر چند اضافے" صفحہ ۱۵۶۔

[شمال مشرقی جرمنی کے چند شہروں نے بشمول لیوبک ۱۲۴۱ء میں ایک محالفہ قایم کیا تھا جس کا منشا بحری ڈاکوؤں وغیرہ سے حفاظت تھا] اِس محالفہ "ہان زیاتی" نے یہ قاعدہ بنانے کی کوشش کی کہ کسی تاجر کو کسی اور شخص کے کسی فعل کے باعث خواہ وہ اسی کا نوکر ہی کیوں نہ ہو، نہ تو گرفتار کیا جائے اور نہ اس کا مال ضبط کیا جائے۔ اور یہ کہ کسی شہر کے باشندوں میں سے ایک یا چند کے افعال کی ذمہ واری اس وقت تک پورے شہر پر عاید نہ کی جائے جب تک کہ وہ شہر مدعی پر انصاف کا دروازہ پوری طرح بند نہ کردے۔ اس کے معاوضے میں "ہان زیاتی" شہروں میں جو معاہدے طے ہوئے، ان میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ ان شہروں میں سے کسی ایک میں بھی جو عدالتی فیصلہ صادر ہوگا وہ سب کے ہاں قابل نفاذ سمجھا جائے گا۔

شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ انتقامی کارروائیاں، قانون بین الممالک کے اداروں میں سے ایک ادارہ تسلیم کرلی گئی تھیں اور اس پر چودھویں صدی کے بڑے بڑے اطالوی شارحین نے بہت زیادہ توجہ کی۔ ان میں سے اکثر نے اس ادارے سے اپنی عام کتابوں میں بحث کی ہے۔ بارتولے نے اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا۔ دوسرے مولفوں نے اس بحث میں ایک حد تک ضمیر کا سوال بھی پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر بارتولے نے خاص طور پر اس سوال سے بحث کی ہے کہ آیا انتقامی کارروائیاں ضمیر کی عدالت اور قانونِ ملک کی عدالت میں جائز قرار دی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ اور ساتھ ہی وہ اس کے دلائل سے بھی بحث کرتا ہے۔

بارتولے نے اپنی لاطینی کتاب "رسالۂ انتقامات" ایسے زمانے میں تالیف کی تھی جب بے شمار جھگڑے پائے جاتے تھے؛ یا جیسا کہ خود مولف نے لکھا ہے کہ، کسی اقتدار برتر سے مدد لینی ممکن نہ تھی۔ ایسے زمانے میں یہ کتاب اس عہد کے تصورات کی اچھی اور صحیح

ترجمانی کرتی ہے۔[1]

اس کتاب کی ابتدائی سطریں قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ بارتولے نے لکھا ہے کہ رومی شہنشاہت کے زمانے میں انتقامی کارروائیاں شاذ تھیں۔ یہ اُس وقت سے ایک روزمرہ کی چیز بن گئی ہے، جب سے کہ انسانوں کے گناہوں کے باعث یہ شہنشاہت بے جان ہوگئی ہے۔ اور نہ صرف بادشاہ و حکمران بلکہ بڑے اطالوی شہر تک کم از کم واقعے کی حد تک اپنے سے برتر کسی اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ یہ طرز عمل جو اس طرح عام ہوگیا ہے، کیا اسے ضمیر کی عدالت میں جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ [خط کشیدہ حصہ اصل لاطینی میں ہے مترجم] ہمارا مشہور شارح اس موقعے پر بائبل کی اس عبارت سے استدلال کرتا ہے کہ "جو روح گناہ کی مرتکب ہوگی، وہی مرے گی۔ بیٹا ہرگز اپنے باپ کے ظلم کا ذمہ دار نہ ہوگا۔" اس سے یہ نتیجہ نکالنا مد نظر معلوم ہوتا ہے کہ انتقامی کارروائیاں ناجائز قرار دی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قرون متوسط کے مولفوں میں سے اکثر کے ہاں ایک خصوصیت ہے کہ وہ معقولیت اور منطق سے عاری ہوتے ہیں اور اپنی

---

[1] بارتولے دے ساسوفراتو کی لاطینی تالیف "مشورے، مسایل اور رسایل" مطبوعہ لیون سنہ ۱۵۵۲ء رسالۂ انتقامات" ورق ۲۵ و مابعد۔

یہاں بعض اور لاطینی رسالوں کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے: کانی (کانی بس) کا "رسالۂ انتقامات کہ آیا ضرر سے ہرجہ و خسارہ پیدا ہوتا ہے۔" لودی کے مارتن کا "رسالۂ انتقامات"۔ یہ دونوں ذی لتی کے لاطینی "رسالہ ہائے قانون عمومی" میں شامل ہیں۔ مزید براں گیورگ نوریش کی "گرفتاریاں اور انتقامات" آندرے دالی ییر کا "خلاصہ متعلق بہ انتقامات" بابت سنہ ۱۶۰۸ء۔ اشٹائل کا "حقوق انتقام پر مقالہ" سنہ ۱۶۱۶ء ہن ریش اول رک ہونیوس کا "انتقاموں پر مقالہ" سنہ ۱۶۱۸ء۔ ڈومی نیک خان آروم کا "انتقاموں پر مقالہ" سنہ ۱۶۲۰ء۔ کوباخ سکا "انتقامات کے حقوق کی مدافعت پر رسالہ"۔ اسی مولف کا "رسالہ کہ انتقاموں کی اجازت کون دے سکتا ہے؟" اسی مولف کا "رسالہ کہ انتقاموں کے جائز وجوہ کیا ہیں؟" تسائت ہوف کا "انتقامات" سنہ ۱۶۲۳ء۔ آندرے ویتر کا "انتقاموں پر مقالہ"۔

تالیفوں میں انھوں نے اکثر اس کی پروا نہیں کی ہے کہ اگر کسی چیز سے استدلال کریں تو اس کے پورے نتائج کا لحاظ کریں۔ بارتولے پر بھی اس بارے میں اس کے ہمعصر اثرات پڑے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ انتقامی کارروائیوں کو ایک جگہ ناجائز قرار دیتا ہے تو گھڑی بھر بعد ان کو جائز بھی قرار دیتا ہے۔ اسی طرح وہ ان کو بائبل کے حوالے سے مطعون قرار دیتا ہے تو سنٹ آگسٹائن کے حوالے سے، جس نے جنگ کو جائز قرار دیا تھا، وہ ان انتقامی کارروائیوں کو روا اور درست ثابت کرتا ہے۔ اگر حکمران کی اجازت، معاملے کی منصفانہ حیثیت اور نیک نیتی کی سہ گانہ شرط پوری ہو جائے تو پھر انتقامی کارروائیاں "ضمیر کی عدالت" میں بھی جائز بن جاتی ہیں۔ یہ "قانون ملک کی عدالت" میں اس لیے جائز نہیں ہوتی ہیں کہ کوئی شخص انصاف اپنے ہاتھ میں لینے کا مجاز ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ حکمران کی اجازت اور معاملے کا حق بجانب ہونا انتقامی کارروائی کی اندرونی برائی کو محو کر دیتے ہیں اور اس بارے میں اس تک ضرورت نہیں ہوتی کہ (لاطینی الفاظ ہیں) "انتقامی کارروائی میں راستی اور نیک نیت پائی جائے"، کیوں کہ ضمیر کی عدالت کے برخلاف قانون ملک کی عدالت نیت سے بحث نہیں کرتی۔

انتقامی کارروائیوں کی اجازت دینے کا حق کیسے حاصل ہوتا ہے؟ بارتولے کے مطابق اس کا ماخذ نہ تو قانون ملک ہے اور نہ ہی قانون مذہبی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ قانون الٰہی اور قانون بین الممالک کے تحت حاصل ہوتا ہے۔ قانون بین الممالک کے مطابق ہر وہ چیز منصفانہ سمجھی جاتی ہے جسے کوئی انسان اپنی ذاتی حفاظت کے لیے انجام دے۔ کوئی شہر اعلان جنگ کر سکتا ہے، خواہ صرف ایک آدمی کی حفاظت ہی کا مسئلہ در پیش کیوں نہ ہو۔ اور کوئی فرد اعلان جنگ کر سکتا ہے جب کہ اسے اپنی جان اور مال کی حفاظت مقصود ہو۔ اگر کوئی شہر یا کوئی سردار انصاف کرنے میں تساہل یا انکار کریں تو وہ

اس شخص کے مدیون بن جاتے ہیں جو انصاف کا طلبگار ہے۔ چنانچہ جس وقت دیگر تمام چارہ ہائے کار بے اثر ثابت ہو جائیں تو دائن کو حق ہوتا ہے کہ اپنے مدیون کو پکڑ لے۔ اسی قاعدے میں توسیع کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی شہر یا سردار کی رعایا کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ انصاف سے انکار کرنا ایک فعل ناجائز کے مماثل بن جاتا ہے اور اس فعل ناجائز کی سزا دینے کے لیے ہر انسان کو جنگ کرنے کا حق ہے۔ چنانچہ (لاطینی مقولے ہیں) "فعل ناجائز یا مضرت کی صورت میں اگر شخص متعلق حق رسانی میں غفلت کرے تو ایسے تمام ملکوں نیز ان کے ماتحت لوگوں کے خلاف جنگ کی جا سکتی ہے۔" بے شبہہ یہ فخر سے بھرے ہوئے الفاظ ہیں اور ان سے اس کا اظہار ہوتا ہے کہ قانون کی اہمیت پر نہایت پختہ اعتقاد رکھا جاتا تھا!

انتقام کی اجازت دینا ایک طور سے بے حد خلاف منطق امر کہا جا سکتا ہے۔ ایک حکمران کسی دوسرے حکمران کی جگہ کیسے اختیار چلا سکتا ہے اور اس کی رعایا کے متعلق اختیار سماعت کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ بارتولے نے اس نکتے پر بحث نہیں کی ہے۔ اس کے نزدیک انتقامی کارروائی ایک جنگی واقعہ ہے۔ چنانچہ وہ اس کی نظروں میں ایک خاص قسم کی جنگ ہے۔ اس زمانے کے ایک ماہر قانون نے اس کی جو توضیح کی تھی اس کا ذکر بالدے نے کیا ہے۔ چنانچہ بالدے نے جس مولف کا ذکر کیا ہے وہ اکثر شارحین کے برخلاف یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ صرف حاکم عدالت کو اس کا حق ہے کہ ایسے لوگوں کے خلاف انتقامی کارروائی اختیار کرنے کی اجازت عطا کرے جو اس کے اختیار سماعت میں نہ ہوں، اور نہ اس کے علاقے میں انھوں نے معاہدہ کیا ہو، اور نہ ہی وہاں کسی فعل ناجائز کا ارتکاب کیا ہو۔ اور یہ اختیار تنہا مقتدر اعلیٰ یا اس کے نمایندے کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس نے اس کی توضیح یہ کہہ کر کی ہے کہ

جس حاکم عدالت کو اس مقدمے کی سماعت کرنی چاہیے وہ اس سے انکار یا تغافل کرتا ہے تو عدالتی اختیار سماعت مدعی [کے علاقے] کے حاکم عدالت پر منتقل ہو جاتا ہے۔ ورنہ یہ اختیار اسے اور طور پر حاصل نہیں ہوتا۔

اس امر کا معلوم کرنا اہمیت رکھتا ہے کہ انتقام کی اجازت دینے کا حق کس کو حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے، تقریباً تمام مولف یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ اختیار صرف مقتدر اعلیٰ کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ بارتولے نے (لاطینی میں) بیان کیا ہے کہ "انتقامی کارروائی کی اجازت دینا جنگ کا اعلان کرنا ہے۔ لیکن کسی منصفانہ جنگ کا اعلان سوائے ایسے فرد کے کوئی اور نہیں کر سکتا جس کے اوپر کوئی اور افسر نہ ہو۔" اس سلسلے میں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ بارتولے نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اگر وہ قانون بین الممالک میں داخل ہو جائے تو یہ کوئی اچھی دلیل نہیں سمجھی جا سکتی کیونکہ انتقامی کارروائی کی اجازت کسی طرح اعلان جنگ کے مماثل نہیں قرار دی جا سکتی۔ بالدے نے بھی پرزور طور سے یہ ثابت کیا ہے کہ انتقامی کارروائی کی اجازت دینے کا حق صرف حکمران کو ہوتا ہے۔"

کرستین ڈپیزان "ہتیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" میں اپنے استاد سے مخاطب ہو کر ان الفاظ میں اظہار خیالات کرتی ہے کہ "استاد! میں تجھ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا تمام سردار انتقامی کارروائی کی اجازت دے سکتے ہیں؟ میں تجھ سے کہتی ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ جیسا کہ خود تو نے کہا ہے اور دیگر طور پر بھی جواب دیا گیا ہے کہ کوئی سردار اس وقت تک مقدمے کی سماعت نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اختیار سماعت کے متعلق مقتدر اعلیٰ نہ ہو۔ اور چوں کہ انتقام کی اجازت دینے کا یہ واقعہ اپنی نوعیت اور حالت کے لحاظ سے جنگ کے مماثل ہوتا ہے، اس لیے یہ

71

کام کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جو سردار بلا توسط و علی الاطلاق نہ ہو، جیسا کہ فرانس کا بادشاہ اپنی سلطنت میں ہے۔"[1]

انتقام کی اجازت دینے کی درخواست کوئی قانونی کارروائی نہیں ہے بلکہ وہ مقتدر اعلیٰ کی طاقت سے استفادہ کرنا ہے۔ پھر بھی جن لوگوں کے خلاف یہ کارروائی اختیار کی جاتی ہے ان کو یہ حق ہوتا ہے کہ ان کی جوابدہی کی بھی سماعت کی جائے اور ان کی طرف سے کوئی اور نائب یا مختار بھی پیش ہو سکتا ہے حتیٰ کہ کوئی ہم وطن بھی۔

اجنبیوں کو انتقامی کارروائی کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ کیا جلاوطنوں اور باغیوں کو یہ اجازت عطا کی جا سکتی ہے؟ متعدد شارحین اس بات کی تائید میں نظر آتے ہیں کہ جلاوطنوں کو تو اجازت دی جا سکتی ہے لیکن اس سے انکار کیا ہے کہ اس میں جات باہر لوگ شامل سمجھے جانے کی نفرت انگیز صورت پیدا کی جائے۔ اس سلسلے میں ان مولفین نے تسلیم کیا کہ انتقاموں کی بجوں کہ (لاطینی الفاظ میں) "عدالتی کارروائی کے ذریعے سے حفاظت کی جانی زیادہ بہتر ہے بہ نسبت جنگی کارروائیوں کے"، اس لیے جلاوطن اس کی اجازت وکیل یا مختار کے ذریعے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن بعض دیگر مولفوں نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی ہے اور بیان کیا ہے کہ اگر جلاوطنوں پر کوئی زیادتی کی جائے تو اس سے ان کے شہروں کے خلاف کسی فعل ناجائز کا ارتکاب نہیں سمجھا جائے گا۔ (لاطینی میں) "ایسوں کے خلاف فعل ناجائز کا ارتکاب ہو تو شہر کے خلاف فعل ناجائز نہیں ہوتا۔"

انتقام کی اجازت نہ تو عورتوں کے خلاف دی جاتی تھی، نہ پادریوں کے خلاف، نہ طلبہ کے خلاف، نہ سفیروں کے خلاف، نہ مقامات مقدسہ کے زائرین کے خلاف، نہ گواہوں کے خلاف، نہ ان

---

[1] کرسٹین ڈی پیزان کی کتاب مذکور مخطوطہ بروسیل حصہ چہارم باب (۱۰۰۱)

تاجروں کے خلاف. جو کسی میلے میں شریک ہوں (تو خاص اس میلے کے مقام پر)، اور نہ ہی ان ملاحوں کے خلاف جو طوفان کے باعث کسی بندرگاہ میں پناہ گزین ہوئے ہوں یا جہاز کی تباہی کے بعد کسی ساحل پر پہنچے ہوں۔ قانون مذہبی کے مجموعے میں ایک صریح قاعدہ پادریوں یا مذہبی افسروں کے اس بارے میں مستثنیٰ ہونے کے متعلق پایا جاتا ہے۔ اس قاعدے کا حکم ۱۲۷۴ء میں لیوں میں منعقد ہونے والی مذہبی مجلس شورائے عام نے دیا تھا۔

انتقام کی اجازت لینے کے بعد اس کا استعمال صرف اس علاقے میں ہو سکتا تھا جس کی حکومت نے وہ اجازت عطا کی ہو۔ یہ اس کی خاص خصوصیت ہے۔

ضبطیوں کی اجازت حدود ارضی کے باہر بھی دی جا سکتی ہے لیکن اصطلاحی طور سے ان کو انتقام نہیں کہتے ہیں بلکہ "مارک" یعنے سرحد کا اجازت نامہ کہا جاتا ہے۔ لفظ مارک وہی ہے جو [مرج، مرغزار، مرزبان، گلمرگ (واقع کشمیر) وغیرہ میں پایا جاتا ہے اور وہ] پرانی فرانسیسی میں "مرشہ" ہے جس کے معنے سرحد کے ہیں۔

72 ایک دلچسپ دستاویز ریمر نے نقل کی ہے۔ ۱۲۹۵ء میں بائیون کے ایک تاجر نے، جس پر لزبن کے ملاحوں نے لوٹ مار کی تھی، بادشاہ انگلستان کے نائب متعینۂ صوبۂ گاسکنی سے اجازت نامۂ انتقام اور اجازت نامۂ سرحد کے عطا کیے جانے کی التجا کی تھی اور اپنے نقصانوں کے اعداد و شمار پیش کرکے بیان کیا تھا کہ پرتگال کے بادشاہ نے اس مال غنیمت کا دسواں حصہ بطور حصۂ حکومت کے وصول کر لیا ہے۔ نائب مذکور نے ایسا اجازت نامہ عطا کر دیا جس کی بادشاہ نے بعد میں توثیق بھی کر دی۔[1] اجازت نامۂ سرحد اور اجازت نامۂ انتقام کی

[1] اس اجازت نامے میں (لاطینی میں) لکھا تھا کہ: ہم نے برناڈ کو جو اجازت دی تھی وہ

اصطلاحیں بعد میں بلا امتیاز مترادف طور پر استعمال ہونے لگیں۔
اس طرح کے اجازت نامۂ انتقام کے سلسلے میں جو جوابی انتقام کا اجازت نامہ دیا جاتا تھا اسے "جوابی اجازت نامۂ سرحد" یا "جوابی مواخذہ نامہ" کہا جاتا تھا۔
اب بندشی کارروائیاں بھی اختیار کی جانے لگیں۔ اور یہ قاعدہ بھی بنایا گیا کہ جہازوں کے تمام کپتانوں کو بندرگاہوں سے روانہ ہوتے وقت حلف دیا جایا کرے کہ وہ انتقامی کارروائیاں عمل میں نہیں لایا کریں گے۔ اسی کے مماثل احکام ۱۴۴۰ء اور ۱۴۶۸ء میں انگلستان و فرانس کے مابین طے شدہ معاہدوں میں نیز ۱۴۸۹ء میں انگلستان اور اسپین کے مابین طے شدہ معاہدے میں ملتے ہیں۔
کیا اشخاص کو بھی پکڑ لیا جاسکتا ہے؟ انتقام کے متعلق جو نظریہ ہے اس کے مطابق محض اصول کی حد تک تو اس کا جواب اثبات میں ہے اور گرفتاری کی اجازت دی جاتی ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ قیدیوں کو حاکم عدالت کے سامنے پیش کیا جائے اور انھیں جوابدہی کا موقع دیا جائے۔ بل ڈی زیو کے ڈاک نے یہ قاعدہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اس کے اور اس کے وارثوں اور جانشینوں کے حق میں جاری رکھی جاتی ہے اور اختیار دیا جاتا ہے کہ پرتگال کی بادشاہت، خاص کر مذکورہ شہر لزبن کے باشندوں کی ذات و جائداد پر اپنے یا اپنے آدمیوں کے حق میں، قبضہ کرے جب کہ وہ اُن کو ہمارے آقاؤ قائد بادشاہ کی سرزمین میں پائے۔ اسے ایسے اسباب کو اس وقت تک اپنے پاس رکھنے کا حق ہوگا تاآں کہ مذکورہ چھینی ہوئی جائداد کی مالیت مع مصارف برنارڈ یا اس کے وارثوں اور جانشینوں کو واپس نہ مل جائیں۔ یہ اجازت پانچ سال تک نافذ رہے گی یا اسی وقت تک جب تک کہ بادشاہ سلامت کی یا ہماری مرضی ہو۔" (رَیمر کی کتاب "حلیفیاں" جلد (۱) حصۂ سوم صفحہ ۱۵۰)۔

نقل کیا ہے کہ بے قصور اشخاص گرفتار نہیں کیے جا سکتے۔ اور اس نے بیان کیا ہے کہ گرفتاری صرف ان لوگوں کی حد تک محدود ہونی چاہیے جنھوں نے ناانصافی کا یا تو خود ارتکاب کیا ہے یا اسے گوارا کیا ہے۔ ناانصافی کو گوارا کرنے والوں کے سلسلے میں اس نے حکام عدالت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کی مخالف رائے بالآخر کامیاب ہوگئی اور یہ کہا جانے لگا کہ قصور ان سب کا ہو جاتا ہے جن کو مجموعی شہر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

جوں ہی وہ مقصد حاصل ہو جائے جس کے لیے انتقامی کارروائی کی اجازت دی گئی تھی تو وہ حق ختم ہو جاتا ہے یعنی جب ذمہ دار شخص وہ چیز ادا کر دے جو اس پر واجب تھی۔ چنانچہ (لاطینی میں): "اگر کوئی اور چیز ان لوگوں کے قبضے میں آئے جن کو مواخذے کا حق حاصل تھا تو انھیں چاہیے کہ اسے سرکاری افسروں کے سامنے پیش کریں اور پھر وہ واپس کر دی جائے۔" انتقامی کارروائیوں کے سلسلے میں اگر واجب الادا سے زیادہ مالیت کی چیز حاصل ہو جائے تو بچت، افسران حکومت کے سپرد کر دینی چاہیے، جو بالآخر واپس کر دی جاتی تھی۔

73

اجازت نامۂ انتقام سے جو شخص بے جا فائدہ اٹھائے تو وہ اس کا ذمہ دار قرار پاتا۔ اور اُسے چوگنا ہرجانہ دینا پڑتا۔

کیا وہ شخص جس کے خلاف انتقامی کارروائی عمل میں لائی گئی ہو، اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اپنے شہر میں اس شخص کے خلاف چارہ جوئی کرے جو اس کو نقصان پہنچانے کا باعث بنا تھا؟ اس سوال پر زور و شور سے بحث کی گئی ہے۔ آرنا کے ژاک نے تو اس کا اثبات ہی میں جواب دے دیا ہے۔ اور وہ بیان کرتا ہے کہ قصوروار حکام عدالت کے خلاف چارہ جوئی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ لیکن بہرحال انتقامی کارروائی کی بھینٹ چڑھے ہوئے شخص کو اس کا حق نہ تھا کہ اپنی نوبت پر ان لوگوں کو گرفتار یا ان کی جائدادوں کو

چھین لے جو اس کو نقصان پہنچانے والے شخص کے ہم شہر باشندے ہوں، کیوں کہ اس طرح خانگی انتقام کی اجازت سمجھی جائے گی اور زیادتیوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس آخری نکتے پر اتفاق رائے تو نہیں ہے لیکن بارتولے اس بارے میں صریح رائے رکھتا ہے اور وہ اس کے نفی میں حکم دیتا ہے۔ صرف وہ شخص جسے انتقامی کارروائی سے نقصان پہنچا ہو اور ساتھ ہی یہ نقصان غیر منصفانہ ہو، تو اسے حق ہوتا ہے کہ اپنے ملک میں جائز رسم و رواج کے مطابق اجازت نامۂ انتقام کی درخواست کرے۔ اس صورت میں یہ اجازت نامہ "جوابی اجازت نامۂ سرحد" یا "جوابی مواخذہ نامے" کی حیثیت رکھتا۔

انتقامی کارروائیوں کے عمل میں لانے سے صلح بالکل نہیں ٹوٹتی اس میں شک نہیں کہ بارتولے اس رائے کو تسلیم کرتا نظر نہیں آتا لیکن وہ اس کے خلاف رائے کی بھی قطعی تائید کرتا نظر نہیں آتا۔ بہرصورت یہ نظریہ ہی مسلّم رہا کہ مسالمانہ تعلقات برقرار رہتے ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ادارۂ انتقامات کو اکثر ممالک نے تسلیم کرلیا اور تقریباً ہر ملک میں یہ خیال کیا جانے لگا کہ اس اجازت کے دینے کا حق وہاں کے حکمران کے اقتدار اعلیٰ کی ایک علامت ہے۔ اور معاہدات کے ذریعے سے ان کے متعلق یہ قاعدہ بنایا جانے لگا کہ ان کو عمل میں لانے میں مہلت مقرر کی جایا کرے اور اس مہلت کے اختتام کے بعد ہی ان کا نفاذ عمل میں آیا کرے۔[1]

انگلستان میں تیسرے ایڈورڈ کے زمانے میں ایک قانون وضع ہوا کہ بادشاہ کو انتقام اور مواخذے کی اجازت کا حق ہے۔

---

[1] پارڈیسو کی فرانسیسی کتاب "اٹھارویں صدی سے پہلے کے بحری قوانین کا مجموعہ" جلد (۲)، مقدمہ، صفحہ ۱۲۱۔

پانچویں ہنری کے زمانۂ حکومت میں ۱۴۱۶ء میں جو قانون وضع ہوا اس میں بتایا گیا تھا کہ بادشاہ اجازت نامۂ انتقام عطا کر سکے گا بجز اس کے کہ کسی معاہدے کے ذریعے سے اس کا رواج منسوخ کیا گیا ہو۔ اس قانون کے مطابق فریقین کو چاہیے تھا کہ مہر شاہی کے نگران افسر یعنی لارڈ پرائوی سیل کے ہاں رجوع ہوں، جو نقصان کی تلافی حاصل کرنے کی اجازت کی درخواستوں پر کارروائی کرتا۔ اگر کسی مناسب مدت کے اندر فریق مطلوب، تلافی کا سامان نہ کر دیتا تو لارڈ چانسلر شخص متضرر کو اجازت نامۂ انتقام عطا کر دیتا جس پر بڑی شاہی مہر ثبت ہوتی، اور 74 جس کی بنا پر اسے اجازت ہوتی کہ ضرر رساں مملکت کے باشندوں پر حملہ کرے اور ان کی جاید اد چھین لے۔ اور اس اجازت نامے کے بعد اسے لٹیرا اور بحری ڈاکو قرار دیے جانے کا خطرہ نہ رہتا۔

فرانس میں عرصۂ دراز تک پارلیمان کے اختیارات میں یہ عمل بھی شامل رہا کہ وہ اجازت نامہ ہائے انتقام عطا کر سکتی ہے۔ ئبرے نے لکھا ہے کہ "یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب ہمارے بادشاہ کثیر تعداد میں پارلیمان میں آتے تھے اور پارلیمان سے اہم امور مملکت میں مشورہ لیا کرتے تھے۔" اس کے سوا ئبرے نے باصرار بیان کیا ہے کہ اجازت نامۂ انتقام کا حق صرف بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "اس کا حق بادشاہوں کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں کہ کسی شخص کو اس کا اختیار عطا کرے کہ اپنے دشمن سے خود ہی انتقام لے یا اس غرض کے لیے ہتیار اٹھائے یا کسی ایک انسان کو کسی دوسرے کے بجائے گرفتار کرے یا یہ کہ کسی ایک کے قرض کے عوض کسی دوسرے کا اسباب چھینے اور بیچ ڈالے۔" مزید برآں اس نے بیان کیا ہے کہ "واقعہ یہ ہے کہ ۱۲۷۲ء میں لالوسیں میں جو قانون منظور ہوا اس میں لکھا ہے کہ فلانڈرس کی کونٹیس (جاگیردارنی) نے جو اجازت نامۂ انتقام عطا کیا تھا کہ ایک انگریز تاجر کا اسباب

چھین لیا جائے، اسے منسوخ کر دیا گیا؛ اور اسے حکم دیا گیا کہ آئندہ اس کے مماثل چیز اختیار نہ کرے۔[1]" سنہ ۱۴۸۴ء میں پادریوں، جاگیرداروں اور مابقی ملک کے نمایندوں کی سہ گانہ مجلس عمومی میں، جس کا انعقاد طور میں ہوا تھا، اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ان کی رائے میں ذات شاہانہ اس بات کی سختی سے نگرانی رکھے گی کہ اجازت نامہ انتقام یا جوابی انتقام نامہ بے قاعدہ طور سے نہ عطا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد کے سال بادشاہ نے اس بات پر اصرار کیا کہ اجازت نامۂ انتقام کا عطا کرنا اقتدار اعلیٰ کے خصوصیات میں قدرتی طور سے شامل ہوتا ہے۔

یہاں ایک اہم چیز بیان کرنی ضروری ہے۔ سنہ ۱۴۸۵ء کے حکمنامے میں وقت واحد میں نہ صرف ہمارے بیان کردہ حالت امن کے انتقام ناموں کا ذکر ہے بلکہ حالت جنگ کے انتقام ناموں کا بھی۔ اور حالت امن کے انتقام ناموں کے ساتھ ساتھ حالت جنگ کے انتقام نامے بھی مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ اول الذکر کا مقصد سب جانتے تھے کہ وہ خشکی اور سمندر دونوں جگہ عمل میں لایا جا سکتا تھا۔ حالت جنگ کے انتقام ناموں سے مقصد یہ تھا کہ بحری جنگوں میں گمنام لٹیرے جو کارروائیاں کیا کرتے تھے، ان میں تخفیف عمل میں آئے۔[2]

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ انتقام کے طریقے کو پوری طرح منسوخ ہی کر دینے کی تجویزیں پیدا ہو گئیں۔

فنیس تمام دنیا کی تجارت کا ایک مرکز تھا۔ اور ظاہر ہے کہ نظام انتقام سے اسے صرف نقصان ہی نقصان تھا۔ اس لیے وہاں کی

---

[1] ۔ لبرے کی فرانسیسی کتاب "بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ پر رسالہ" جلد (۲) فصل (۱۷)۔ یہ تالیف اس کے مجموعۂ تصانیف میں شامل ہے۔

[2] ۔ مارتینس کی فرانسیسی کتاب "جنگی بیڑے، مال غنیمت لینے اور خاص کر ضبطیاں عمل میں لانے کے متعلق ایک مضمون" صفحہ ۳۱۔ پیس کی فرانسیسی تالیف "بحری جنگ" صفحہ ۲۳۔ ۱:۸۔

مجلس حکومت نے ۱۴۲۳ء ہی میں طے کر دیا تھا کہ انتقاموں کی اجازت دینی بند کر دی جائے۔ لیکن ۱۴۵۶ء میں بڑی مجلس شوریٰ پرانے فیصلے پر عود کر آئی۔[1] ۱۴۹۰ء میں انگلستان کے بادشاہ نے میلان کے ڈیوک کو ایک عمومی اجازت نامۂ سفر عطا کیا جس کی بناء پر میلان کے باشندوں کو انگلستان میں تجارت کے لیے آنے کی اجازت تھی اور وہ انتقامی کارروائیوں کے اطلاق سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے۔ ۱۴۱۵ء میں انگلستان اور فرانس نے معاہدہ کیا کہ یہ دونوں ملک آپس میں انتقامی کارروائیوں کو منسوخ کر دیں اور آیندہ سے اجازت نامۂ انتقام معینہ طور پر صرف ان لوگوں کے خلاف عطا کیے جائیں جو بذات خود قصور کے مرتکب ہوئے ہوں [نہ کہ ان کے ہموطنوں کے خلاف جو خود بے قصور ہوں] اور یہ بھی صرف اس وقت جب کہ وہ اپنی ذمہ داری کے پورا کرنے سے علانیہ طور پر انکار کریں۔[2]

۲۴ فروری ۱۴۹۶ء کو ساتویں ہنری اور "جین فلپ" (فلپ لبعد یا فلپ اول) کے مابین ایک معاہدہ طے ہوا تھا۔ اس معاہدے کو فلانڈرس والے "عظیم الشان رابطہ" کہنے لگے، کیونکہ اس کے مطابق ہر دو معاہدہ کرنے والے حکمرانوں کی رعایا کو تجارت کی آزادی مل گئی اور اس کے تحت یہ بھی طے ہوا کہ اگر کوئی نقصان پہنچے تو نہ تو کوئی اجازت نامۂ انتقام دیا جائے، نہ "اجازت نامۂ سرحد"، نہ جوابی انتقام نامہ، نہ شخصی گرفتاری، نہ اسباب کی ضبطی اور نہ ہی جنگ۔ بلکہ یہ کہ ان دونوں حکمرانوں میں سے کوئی ایک اس نقصان کی تلافی کر دے گا اور حالات کو حالت ابتدائی پر واپس لائے گا۔ اسی معاہدے کے شرائط کے تحت وہ اجازت نامۂ انتقام اور "اجازت نامۂ سرحد"

---

[1] ماس لاٹری کی فرانسیسی تالیف "قانون انتقام قرون متوسطہ میں" صفحہ ۴۶۔

[2] موڈ لاکلاثیئیر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ ۲۳۲۔

جو سابق میں عطا ہو چکے ہوں وہ پوری طرح ساقط ہو جائیں گے بجز اس کے کہ کسی مقدمے کے حالات کی تحقیق کے بعد معاہدہ ہذا کے فریقین اس کے خلاف کوئی فیصلہ کریں۔[1]

۸ر جون ۱۵۴۶ء کو انگلستان اور فرانس میں جو معاہدہ ہوا اس میں خاص کر یہ چیز بتائی گئی ہے کہ ہر دو حکمران اپنے اس حق سے دستبردار ہوتے ہیں کہ "اجازت نامۂ انتقام"، "اجازت نامۂ سرحد" اور "جوابی انتقام نامہ" عطا کر سکیں بجز اس کے کہ خود اصل قصور والوں کے خلاف ہوں؛ اور یہ بھی صرف اس صورت میں جب کہ انصاف سے علانیہ انکار کیا جائے۔ اور اس انکار کا، ہرجے کی "تلافی کی ہدایت اور عدالت میں حاضری کا طلب نامہ بھیجنے کے بعد" قانون کے مطابق ثابت کیا جانا ضروری ہوگا۔

۱۵۶۰ء میں اورلیاں میں جو عمومی مجلس سہ گانہ (پادریوں، جاگیرداروں، اور باقی ملک کی) منعقد ہوئی تھی، اس میں جاگیرداروں نے مطالبہ کیا تھا کہ اجازت نامۂ سرحد اور جوابی انتقام نامے منسوخ کر دیے جائیں اور سفیروں کو ہدایت دی جائے کہ وہ اس بات کی کوشش کریں کہ [فرانس کے] بادشاہ کی رعایا پر بیرونی حکمران نہ تو خشکی میں اور نہ ہی سمندر میں کوئی زیادتی کریں۔

لیکن اس اثناء میں حالت امن کی انتقامی کارروائیاں قرون متوسط کے مقابلے میں شدید تر ہو گئیں۔ چنانچہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے مولف اس مسئلے پر اس طور سے بحث کرتے ہیں کہ گویا وہ کوئی اسی زمانے کا واقعہ ہو۔ اور وہ انہیں دلایل کو دہراتے ہیں جو سابقہ صدیوں میں ماہرین قانون پیش کرتے رہے تھے۔

[اسپین کا ماہر قانون] کوثارّ دیقیاس ایک لمحے کے لیے بھی ان کے

---

[1] ریمر کی لاطینی کتاب "ملیفیان"، جلد (۸) قسم چہارم صفحہ ۸۳۔

جواز پر شبہہ نہیں کرتا۔ اس کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ اس کی اجازت کوئی ایسا حکمران دے جو اعلان جنگ کر سکتا ہو۔

آیالا پہلے واقعات سے بحث کرتا ہے اور پھر بیان کرتا ہے کہ "ہمارے زمانے میں انتقامی کارروائیاں اس صورت میں جائز سمجھی جاتی ہیں جب کہ کسی معینہ قوم کے لیڈر یا بحری ڈاکو یا دیگر اشخاص کسی قتل کا ارتکاب کریں، یا کسی نقصان یا ہرجے کا باعث بنیں یا یہ کہ جن لوگوں کو نقصان پہنچایا گیا ہے وہ سوائے اس کے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر سکتے کہ ملزم جن لوگوں کے سپرد اپنے آپ کو کر دیں، نیز وہ لوگ جو ان ملزمین کو پناہ دیں ان کی جانب سے ان ملزمین کی تحویل عمل میں آجائے"[1] معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مولف کو یہ چیز بھی کھٹکی کہ کسی قصوروار کے عوض کوئی بے قصور سزا نہ پا جائے۔ چنانچہ وہ بائبل کے احکام کا اس بارے میں انبار لگا دیتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ کارروائی جائز ہے بشرطیکہ بے قصوروں کو ان کی ذات کی حد تک کوئی سزا نہ ملے، البتہ ان کے مال پر سزا کا اثر پڑ سکتا ہے۔

آں ری زوش نے انتقامی کارروائیوں کی تائید میں مروجہ عملدرآمد پیش کرنے کے علاوہ یہ امر بھی ملحوظ رکھنے پر زور دیا ہے کہ بسا اوقات وہ کسی نقصان یا ہرجے کی تلافی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہوتی ہیں۔ نہ تو زوش، اور نہ ہی آیالا اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ انتقامی کارروائی کے لیے اشخاص کو گرفتار کیا جائے۔ بلکہ صرف ان کے مال پر انتقامی کارروائی کو محدود کرنا ضروری قرار دیتے ہیں۔[2]

گروتیوس نے یہ تو پوری طرح تسلیم کر لیا ہے کہ آل پی این کا

---

[1] آیالا کی لاطینی کتاب "جنگ کے قواعد و قوانین اور فوجی ضبط" جلد (۱) باب (۴) ف ۳۔

[2] آں ری زوش کی لاطینی کتاب "گریگری نہم کے احکام کی شرح" جلد (۵) باب (۲۶)۔

لاطینی میں بیان کردہ قاعدہ صحیح ہے کہ "اجتماعی ذمہ داریاں افراد کو پابند نہیں کرتیں اور اسی طرح افراد کی ذمہ داریاں جماعت کو پابند نہیں کرتیں۔" لیکن اس کے باوجود گروتیوس یہ بیان کرتا ہے کہ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے اور خود ساختہ قانون بین الممالک کے ذریعے سے یہ مسلّم ہوچکا ہے کہ کسی مملکت کی رعایا کا جملہ مادی اور غیر مادی مال اس کی مملکت یا اس کے حکمران کی ذمہ داریوں کے لیے یا براہ راست خود اس کی اپنی ذمہ داریوں کے لیے گویا زیر کفالت و ضمانت سمجھا جائے گا حتٰی کہ حق کی ادائی نہ ہونے کی صورت میں وہ دوسروں کے قرض کا بھی ذمہ دار ہوجاتا ہے۔[1]

اس سے کوئی بیس سال پہلے ایک مشہور مشورہ دہی عمل میں آئی تھی۔ اور وہ اسپین کے وکیل سرکار جنتی لیس کی کتاب میں متعدد فصلوں کی بنیاد کا کام دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ انگلستان کی عدالت میں ایک کارروائی جاری تھی۔ اس موقع پر جنتی لیس نے نہایت زور و شور سے انتقامی کارروائیوں کے عمل میں لائے جانے پر حملہ کیا ہے۔ اپنی کرخت اور درشت لاطینی میں اس نے اس بربریت پسندانہ رواج پر حملہ کیا ہے: "میں کہتا ہوں کہ اجازت نامۂ سرحد کا یہ حق نہایت ملعون چیز ہے" اور اس قابل ہے کہ ہمارا نہایت ربانی بادشاہ اسے مردود قرار دے۔ کیونکہ یہ جنگ نہیں ہے بلکہ نہتے لوگوں، تاجروں اور دیگر میدان جنگ سے دور لوگوں کے خلاف ڈاکہ زنی عمل میں لانا ہے۔[2]

سترھویں صدی کے اواخر سے انتقام ناموں کا رواج باقی نہ رہا۔ اس کے بعد سے شاذ و نادر ہی اس کی مثالیں ملتی ہیں اور یہ یقینی ہے کہ آج کل اس کا استعمال ناجائز ہوگا۔ یہ رواج خلاف اخلاق تھا، اور زمانۂ حال کے لوگوں کے ضمیر نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ اور یہ ادارہ نابود ہوچکا ہے۔

---

[1] گروتیوس کی لاطینی کتاب "قانون جنگ و صلح" کا باربیراک کا کیا ہوا ترجمہ کتاب سوم باب دوم ف۲۔

[2] برٹش میوزیم کے مخطوطات لانڈزون، جلد (۱۳۹)۔

78

باب پنجم

خانگی جنگ

جنگ کرنے کا حق سوائے مقتدر اعلیٰ کے کسی کو نہیں حاصل ہوتا۔ کسی منظّم سماج میں یہ مملکت کے امتیازات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اطلاق جس طرح زمانۂ قدیم پر ہوتا ہے اسی طرح زمانۂ حال پر بھی۔ اس کے برخلاف قرونِ متوسطہ میں یہ نظر آتا ہے کہ خانگی جنگ کا وجود اس لیے تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ گئے تھے۔ اس زمانے میں جس کسی کو کافی قوت حاصل ہوتی وہ اپنا انصاف آپ ہی کرلیتا۔ اور جماعت کی جگہ فرد نے لے لی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر ہر شخص میں پوری قوم کا اقتدار مرتکز ہوگیا ہے۔ اگر کسی شخص کو قوت و طاقت حاصل ہوتی تو اس کی جنگ کا وہی اثر ہوتا جو مملکت کے حکم سے اور مملکت کی نگرانی میں کی ہوئی جنگ کا۔ قوت و طاقت کا منشاء بھی حق کے نفاذ میں مدد دینا تھا۔

"خانگی جنگ" قرونِ متوسطہ میں ایک بڑی مصیبت تھی۔ جرمنی،

فرانس، اٹلی، اسپین، انگلستان غرض قریب قریب تمام جاگیرداری یورپ میں ایک ایسی حالت نظر آتی تھی جو اصول کی حد تک تو یکساں تھی، صرف تفصیلات میں اختلاف پایا جاتا تھا۔

جرمنی کے قدیم قانون کے تحت ہر وہ فعل جس سے کسی کو نقصان پہنچے، خانگی جنگ کا باعث بنتا، اور ایک خاندان کو دوسرے خاندان سے بدلہ لینے کا حق عطا کرتا تھا۔ اس قسم کی صورت حال، ظاہر ہے کہ ذرا بھی ترقی یافتہ تمدن میں باقی نہیں رہ سکتی۔ جبر و قوت کے اس غیر محدود استعمال کے بعد ایک نئی صورت حال جگہ پکڑنے لگی جس میں جبر و قوت کو تو تسلیم کیا گیا، لیکن اسے بعض تحدیدات کے ساتھ محدود کر دیا گیا تھا۔ خانگی جنگ کا حق یعنی "دو شار" اور قانون انتقام جسے قانون جبر یا لاٹھی راج بھی کہا جاتا ہے، اب قانونی اداروں میں اپنے لیے جگہ بنا لیتا ہے۔ 79

جبر و قوت کے استعمال پر تحدیدات عائد کیے گئے۔ خصوصی جنگوں کا طریقہ معین کیا گیا اور جو قواعد اس سلسلے میں بنے وہ قانون موضوعہ کے نظام کا ایک جزء ہو گئے۔

اس ادارے کے دو رخ ہیں۔ ایک تو اس کو قانون تعزیرات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ قانون اس وقت تک حقوق خانگی سے جدا نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح اس کو قانون سیاسی کے نقطۂ نظر سے بھی لحاظ میں لایا جا سکتا ہے۔ اسی آخر الذکر نقطۂ نظر سے ہم یہاں بحث کریں گے۔

قانون سیاسی کے نقطۂ نظر سے خانگی جنگ بہت کچھ اس امر پر مبنی تھی کہ مرکزی حکومت کو کتنی زیادہ یا کم قوت حاصل ہے۔ اگر مرکزی حکومت اپنے کو قوی پاتی تو خانگی جنگوں کو دبا دیتی اور ان کے جواز سے اختلاف کرتی۔ لیکن اگر مرکزی قوت کمزور اور شکست خوردہ ہوتی تو اسے خانگی جنگوں کو تسلیم کر لینا پڑتا۔

اس کا ایک قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ خانگی جنگ ابتداءً ان ملکوں سے غائب ہوگئی جہاں حکومتی تصور نے زیادہ تیز ترقی کی تھی۔ اس میں انگلستان اور جرمنی کا فرق بہت نمایاں ہے۔ انگلستان میں خانگی جنگ کی یاد ہی بھلا دی گئی ہے اور جرمنی میں ابھی تک اس کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح جرمنی اور فرانس کا فرق بھی اتنا ہی بڑا ہے۔ فرانس میں خانگی جنگ کی اجازت صرف جاگیرداروں کو حاصل ہوتی ہے، اور جرمنی میں اس کا حق ہر کسی کو حاصل ہوتا ہے۔

خانگی جنگ پر جو اولین ممانعتیں عائد کی گئیں وہ سیاسی اقتدار کے باعث تھیں۔ اس کے جراثیم اس "امن" میں بھی نظر آتے ہیں جس سے جرمن نسل کی تمام قوموں میں ہم دوچار ہوتے ہیں[1]۔

جب "شاہی امن" نے پوری طرح ترقی پالی تو اس کے لیے خانگی جھگڑوں کے دبانے پر توجہ کرنی ناگزیر ہوئی اور بعض لوگوں نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ شارلیمان نے بلا امتیاز تمام خانگی جنگوں کو ممنوع کر دینے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش خود شہنشاہ کے جیتے جی بھی ناکام ثابت ہوئی۔ اور جب وہ مرگیا تو تاراج اور فتنہ و فساد اپنی حد کو پہنچ گئے۔ پھر قرون متوسط کا سب سے ہولناک زمانہ شروع ہوا اور دو صدیوں تک زمین پر ظلمت چھائی رہی۔

اس پورے زمانے میں اگرچہ قانون اور امن کو حکمرانوں کے کمزور ہاتھ بچا نہ سکے، لیکن کلیسا، ان کی حفاظت کرتا رہا۔

امن کلیسا کا مطمح نظر تھا، اور اس نے اس کے تشکل پذیر ہونے کی کوشش کی۔ سنہ ۹۹۰ء ہی سے یہ نظر آتا ہے کہ جنوبی فرانس کے صوبہ دار اسقف اس قسم کے قواعد شایع کرتے رہے جن کا مقصد جبرو زیادتی کا اختتام تھا۔ ابتدائی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

[1] دِوبوا کی فرانسیسی کتاب "اقوام جدید کے قانون تعزیرات کی تاریخ جلد (۱) صفحہ ۴۸ و مابعد۔

ایک صدی بعد پھر نئے سر سے کوشش شروع ہوئی۔ اب جنگ کو مکمل اور بے لگام جواز حاصل ہونے کی کوئی تائید نہیں کرنا تھا۔ کلیسا نے اس پر اکتفا کی کہ "خدائی صلح" قایم کرے اور معینہ دنوں میں ہر قسم کی لڑائیوں کو روک دے۔[1]

یہ تحریک ابتداءً علاقہ آکی تین سے شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ تمام ملکوں میں پھیل گئی۔ اس قسم کی صلح کا قاعدہ اس مجلس شورائے مذہبی میں باضابطہ طور سے منظور ہوا جو ۱۰۹۵ء میں کلیرموں میں منعقد ہوئی تھی اس کی بار بار تجدید بھی ہوتی رہی اور بالآخر اس کی آخری مرتبہ توثیق ۱۱۷۹ء میں لاتراں میں منعقد ہونے والی تیسری مجلس شورائے مذہبی میں عمل میں لائی گئی؛ اور قرار دیا گیا کہ وہ عیسائیت کا عام قانون سمجھی جائے۔[2]

ان "حرام دنوں" میں خانگی جنگ عمل میں نہیں لائی جا سکتی تھی دنوں کے انتخاب میں حضرت مسیح کے آخری کھانے (عشائے ربانی) ان کے ابتلاء سے گزرنے، ان کے دفن کیے جانے، اور دوبارہ زندہ ہونے کو دخل تھا۔ چنانچہ سال کے ہر ہفتے میں چہارشنبے کی شام سے دوشنبے کی صبح تک یہ حرمت قایم رہتی، اس کے بعد سال کے چند معین اوقات مثلاً عید میلاد مسیح کی تیاری کے زمانے (یعنے کرسمس سے چار ہفتے قبل) سے (آغاز جنوری پر) ہفتۂ ظہور مسیح تک؛ اور اسی طرح ایسٹر کے پہلے اتوار سے تین ہفتے قبل سے لے کر ایسٹر کے ہفتے تک؛ نیز حضرت مسیح کے آسمان پر اٹھائے جانے کی تاریخ سے اس ہفتے تک جس میں حضرت موسیٰ کو الواح توریت ملنے کی تقریب منائی جاتی ہے (جو ایسٹر کے پچاس دن بعد ہوتی ہے)؛ اور اس طرح کے مختلف ایام عید۔ جن دنوں میں لڑائی

[1] [عربوں کے "اشہر حرم" پیش نظر رہیں۔ مترجم]۔

[2] کلک ہوں کی جرمن تالیف "خدائی صلح کی تاریخ"۔

کی اجازت تھی ان میں بھی پادری، راہب، خانقاہوں کے ملازم، زائرین، تاجر، کسان اور زرعی کام پر چلنے والے جانور ہر قسم کے جبر و زیادتی سے محفوظ قرار دیے گئے۔ چنانچہ قانون مذہبی میں (لاطینی میں) یہ قرار دیا گیا کہ "ہم یہ نئے سر سے حکم دیتے ہیں کہ پادری، راہب، خانقاہ کے ملازم، زائر، تاجر، گاؤں والے خواہ آرہے ہوں یا جارہے ہوں یا زراعت کا کام انجام دیتے ہوں اور اسی طرح وہ جانور جو پانی دینے یا زراعت کے سلسلے میں کام ؂ دیتے ہیں پوری طرح محفوظ رہیں[1]۔

جو کوئی ان "حرام دنوں" کی پروا نہ کرتا اسے ذات باہر کر دیا جاتا اور ایسے شخص کو کوئی قتل بھی کر دیتا تو سزا نہیں دی جاتی۔ مزید برآں ایک خصوصی عدالت قائم کی گئی جس میں قاضیان امن نشست کر کے مقدمات کی سماعت کرتے۔ مجالس شورائے مذہبی نے ان کو (لاطینی میں) "امن آرا" یا "حکام امن آرا" کا نام دیا تھا۔ ان حکام عدالت نے اسقفوں کی رضامندی سے ان مقدموں کی سماعت شروع کی جو سابق میں کلیسائی عدالتوں میں پیش ہوا کرتے۔ اس سے لڑائیوں اور جبر و زیادتیوں کا خاتمہ تو نہیں ہو گیا؛ البتہ کلیسا نے اس مرض کی تخفیف کا جو علاج تجویز کیا تھا وہ کچھ دنوں تک اور چند مقاموں میں کامیاب ہوا۔ لیکن پھر وحشت و بربریت ہی نے تسلط جما لیا۔ اس پر کلیسا نے پادریوں کو ایسے لوگوں کی عبادت کروانے سے روکنا شروع کیا۔ مگر اس سے کچھ نہ ہوا۔ بھائی چارے قائم ہونے لگے۔ "برادران امن"، جن کی حفاظت کلیسا کرتا تھا، اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینے لگے کہ جو امیر اور کرایے کے ٹٹو کلیسائی ممانعتوں کو اپنے قدموں تلے روندتے تھے ان سے مقابلہ کریں۔ برائی کا پھر بھی ازالہ نہ ہو سکا۔ لیکن اب وہ لمحہ آچکا تھا جب مقتدر اعلیٰ نئے سر سے قوت اپنے ہاتھ میں

[1] لاطینی کتاب "گریگری نہم کے احکام" جلد (۱) فصل ۳۴ عنوان صلح و امن ۲۔

لے کر تاراج کے خلاف اعلان جنگ کرنے لگے۔

انگلستان میں سکسنی کے قدیم قوانین کے مطابق امن کا ادارہ کافی اچھی ترقی کرچکا تھا۔ ہر آزاد شخص کو اس کا حق تھا کہ اس کے گھر میں امن رہے؛ اور اس پر اس وقت تک حملہ نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک کہ ہرجے کی تلافی کرنے کے لیے اس سے پہلے مطالبہ نہ کرلیا جائے۔ اور اس کے بعد بھی اسے سات دن کی مہلت ملتی تھی۔ بادشاہ کے گھر کا امن اس کی سکونت گاہ اور اس کے آس پاس کے رقبے کو محفوظ بنا دیتا تھا۔ بادشاہ کو اختیار تھا کہ خاص خاص اشخاص یا مقامات کو امن عطا کردے۔ فتح کے بعد، انگلستان میں جو چار بڑی شاہراہیں گذرتی تھیں، ان کو اور دریاؤں کو مامون بنا دیا گیا۔ پھر تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام پر "امن شاہی" کوئی امتیازی چیز نہ رہی بلکہ وہ ایک عمومی حق بن گیا۔[1]

یہ قابل لحاظ ہے کہ انگلستان میں خانگی جنگیں اتنی زیادہ نہ ہوئیں جتنی دیگر ممالک میں۔ رابرٹ سن نے یہ واقعہ بیان کیا ہے اور وہ اس سے یہ معقول نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ فاتح نے کتنا غیر معمولی اقتدار نہ حاصل کرلیا تھا۔ اور یہ کہ یہی چیز اس کے جانشینوں کو وراثت میں منتقل ہوئی تھی۔[2]

جہاں تک انگریزی نظام کا تعلق ہے، وہ حقیقت میں بہت خاص ہے۔ گو وہ تصور اصل میں جرمن ہے۔ چنانچہ جب رومیوں کی فوج کے آخری دستے برطانوی سرزمین سے چلے گئے تو جرمن قبیلے اور جوٹ اور سالسن باشندے اور انگریز سب ایک ایسے ملک میں بسنے لگے جو منقس

---

[1] ۔ سر فریڈرک پالک کا مضمون انگریزی رسالہ "لا کوارٹرلی ریویو بابت ۱۸۸۵ء" میں۔

[2] ۔ رابرٹ سن کی کتاب "شارل کین کی تاریخ" کا فرانسیسی ترجمہ موسوم بہ سوآر جلد اول ثبوت اور تشریحیں تعلیق (۲۱)۔

اور کمزور کر دیا گیا تھا اور اس میں یہ قوت نہ تھی کہ پکٹ اور اسکاٹلینڈ کے باشندوں سے مقابلہ کر سکے یا وائی کنگ یعنی اسکینڈینیویا کے لٹیروں کی تاخت و تاراج کو روک سکے۔ اسی ابتدائی بنیاد پر جدید جرمن عناصر جگہ پکڑنے لگے۔ اور جب آٹھویں صدی عیسوی کے اختتام اور نویں صدی کے آغاز پر ڈنمارک کی پہنچے اور گیارھویں صدی میں نارمنڈی والے وہاں آئے تو یہ نئے لوگ بھی جرمن نسل ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

"انگریزی-ساکسنی" تمدن اس پر مبنی تھا کہ کسانوں کی ایک آزاد جماعت ہو اور ان کے سر پر ایک موروثی بادشاہ پایا جائے۔ اعلیٰ ترین اختیار قومی مجلس میں مرتکز ہوتا تھا۔ مجلس اعیان میں، جسے وٹن آگے موٹ کہتے تھے، شہزادے، جاگیردار، اور ماہر مشیر شریک ہوتے تھے۔ یہی مجلس قوانین بناتی اور اعلیٰ ترین عدالت کا کام دیتی نیز امن اور صلح کے مسایل میں اپنی رائے ظاہر کرتی۔[1]

اڈگار اور کانٹ کے زمانے میں شاہی اختیارات مستحکم ہو گئے۔ اور اسی آخر الذکر بادشاہ کے زمانے میں جاگیرداری نظام نے بھی ترقی پائی۔ ولیم فاتح نے ماضی کو ذرا بھی نہ چھیڑا اور اس ابھرتی ہوئی جاگیرداری ہی کو برقرار رہنے دیا۔ لیکن اس نے اس کو وہ خصوصی نوعیت عطا کردی جو نارمنڈی کے نظام میں پائی جاتی تھی۔ اور آیندہ نزاع پیدا ہونے کا سد باب کر دیا۔

اگر منطق کا اطلاق کر کے دیکھیں تو، جیسا کہ مختلف مولفوں نے بیان کیا ہے، جاگیرداری نظام میں سرپرست اور آسامی کی سہی نوعیت پائی جاتی ہے۔ اس کا اصول یہ تھا کہ آسامی اپنے سرپرست یا آقا سے براہ راست تعلق رکھتی اور بادشاہ سے انہیں کوئی واسطہ نہ

---

[1] اسٹبنس کی انگریزی کتاب "منتخب منشور" صفحہ ۱۲۔ نیز گلاسوں کی فرانسیسی کتاب "انگلستان کے قانون اور سیاسی کشوری اور عدالتی اداروں کی تاریخ اور ان کا موازنہ فرانس کے قانون اور اداروں کے ساتھ" جلد (۱) صفحہ ۳۹۔

ہوتا۔ اکثر ممالک میں یہی صورت حال تھی۔ انگلستان میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ جاگیرداری قانون کے دیگر تمام اصول تسلیم کیے جاتے تھے۔ اور اس نظام میں وہی پوری طرح سرایت کر گئے تھے۔ صرف اس اصول کو رد کر دیا گیا تھا کہ مرکزی اقتدار نہ مانا جائے، جس سے بالآخر یہ نتیجہ نکلتا کہ خود جاگیرداری نظام کے خلاف ایک کشمکش حیات شروع ہو جاتی۔ اس کے بر خلاف [انگلستان میں] یہ قاعدہ قرار دیا گیا کہ ہر جاگیر بادشاہ کی عطا سمجھی جائے۔

انگلستان کی تاریخ میں بہرحال ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب خانگی جنگیں زور و شور سے جاری تھیں۔ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں جب انگلستان کو براعظم یورپ میں عظیم الشان شکستیں اور نقصان ہوئے تو شاہی اقتدار ٹوٹ پھوٹ گیا۔ یارک کے رچرڈ نے کمزور چھٹے ہنری سے مقابلہ شروع کیا، اور وہ جنگ شروع ہوئی جسے "دو گلاب کے پھولوں کی جنگ" کہا جاتا ہے [کیوں کہ حریفوں میں سے ایک کا نشان سفید گلاب تھا تو دوسرے کا سرخ گلاب]۔ اور اس زمانے میں متعدد خانگی جنگیں بھی چھڑ گئیں، اور جب تک ساتویں ہنری کا مدبرانہ نظم و نسق اور اس کے وزیروں یعنی ایمپشن اور ڈڈلے کی فراست نیز "دو ستاروں والی جمعیت" کی غیر معمولی عدالت کام نہ کرنے لگے اس وقت تک بڑے بڑے جاگیرداروں کی شورش پسندی ختم ہو کر ان کی عقل ٹھکانے نہ لگی۔[1]

ناخیرا کی قومی مجلس میں قسطیلہ کے ساتویں الفونسو نے ۱۱۲۸ء میں "ہیڈالگو" یعنی اسپینی امراء اور جاگیرداروں میں امن، محبت اور باہمی دوستی کے نفاذ کا اعلان کیا اور اس نے ان کو اس بات کی ممانعت کی کہ ان میں سے کوئی بھی دوستوں کے خلاف قتل یا زیادتی کا

---

[1] ڈینٹن کی انگریزی کتاب "انگلستان پندرھویں صدی میں" صفحہ ۳۰۶۔

ارتکاب کرے اور دوسروں کی زمین میں جنگ آزمائی کرے جب تک کہ خود اس کو اشتعال نہ دلایا گیا ہو یا صلح کے ٹوٹ جانے کی اطلاع نہ دی گئی ہو۔ اور اس کا باضابطہ طور سے امتناع عمل میں آیا تھا کہ اشتعال دلانے کے بعد نو دن تک ایک دوسرے پر دست درازی کر سکیں۔ جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا تو اس اعلان شاہی کے مطابق وہ غدار سمجھا جاتا اور اسی الزام میں اسے بادشاہ کے پاس پیش کیا جاتا۔ قرون متوسط میں قانون کے جو ہسپینی مجموعے تیار ہوئے ان میں سے اکثر میں یہ قاعدہ مندرج ہے۔

قطبلیہ کے قدیم "فویرو" یعنی منشور میں بیان ہوا ہے کہ خانگی جنگ کی صورت میں جاگیرداروں کو بعض خاص مراعات حاصل ہوں گے۔ اور اجازت تھی کہ جاگیردار کو اس کے دوست مدد دیں، جب وہ اسے اپنے دشمنوں سے مقابلہ کرتا ہوا پائیں۔ اور اس وقت ان کو یہ معلوم کرنے تک کی ضرورت نہ تھی کہ آیا کوئی اشتعال دلایا گیا تھا۔ اس بارے میں ذمہ داری صرف اصل مقابلہ کرنے والے ہی پر عائد ہوتی تھی۔ اسی منشور میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ صلح کے ٹوٹ جانے کی اطلاع دینے کے نو دن بعد جاگیردار کو حق تھا کہ اپنے حریف کو اشتعال دلائے اور اس کی بے عزتی کرے اور اس کے تین دن بعد وہ اس کو قتل بھی کر سکتا۔

اراگون میں بھی یہی قاعدہ تھا۔ ہویس کاس کی مجلس قومی میں ۱۲۴۷ء میں پہلے ژاک نے خانگی جنگ کی ممانعت کی بجز اس کے کہ اشتعال دلایا گیا ہو۔ اشتعال کی صورت میں بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ دس دن کی مدت گزرنے سے پہلے حملہ نہ کیا جائے۔ اسی حکمران نے یہ بھی چاہا تھا کہ جو لوگ دو جاگیرداروں کی جنگ میں شخصی اور عملی حصہ نہ لیں تو ان کو بھی اس جنگ کے اثرات سے محفوظ رکھنا چاہیے جیسا کہ دِہ بوانے بیان کیا ہے — یہ ناطرفدار بنا دیے جانے کی

کارروائی تھی۔ کسان، پادری، یہودی، اطاعت شعار عرب، بیوائیں، یتیم اور تمام نہتّے لوگ ان حفاظتی احکام کے موضوع قرار پائے۔[1]

فرانس میں خصوصی جنگ کی تنظیم نہایت واضح اصول کے مطابق عمل میں آئی تھی۔ فلپ ڈبومانوار نے اس چیز سے اس طور پر بحث کی ہے کہ گویا وہ کوئی قانونی مسئلہ ہے۔[2]

اس ذریعے سے ہر قسم کی مضرت کا بدلہ نہیں لیا جاسکتا تھا، بلکہ صرف اس جرم کی صورت میں جو بے رحمانہ اور مہلک اور عمومی ہو۔[3]

جنگ کا اعلان فعل کے ذریعے سے بھی ہو سکتا اور قول کے ذریعے سے بھی۔ فعل کے ذریعے سے اعلان اس وقت سمجھا جاتا جب کھلم کھلا جھگڑا شروع کیا جاتا اور ہتھیار پر ہاتھ ڈالا جاتا۔ اس صورت میں وہ لوگ جو جھگڑے اور اختلاف کے وقت موجود ہوتے، اس جنگ میں شریک ہو جاتے۔ قول کے ذریعے سے جنگ کا اعلان اس وقت ہوتا جب دھمکیاں دی جاتیں یا دشمن کو اشتعال دلانا شروع ہو جاتا۔ اسی کو ڈی فی داتیو یعنے اعلان مبارزت کہتے۔

جنگ کا بانی یعنے وہ شخص جو اس کا اعلان کرتا اور جو اس بات کا مدعی ہوتا کہ اس کے حریف نے اس کے خلاف تعدی کی ہے وہ اس جنگ کا سردار یا سرغنہ بن جاتا۔

جو لوگ لڑائی میں اس کے ساتھ شریک ہوتے، ان میں اولاً قریبی رشتہ دار شامل ہوتے۔ اگر جنگ کھلم کھلا اور اعلان کے ذریعے ہوتی تو جنگ کے سرغنے کے رشتہ دار کسی خصوصی اعلان کے بغیر خود بخود

---

[1] ڈی ڈبوا کی فرانسیسی تالیف "اسپین کے قانون تعزیرات کی تاریخ" صفحہ (۱۸۱) و (۱۴۹۴)۔

[2] فلپ ڈبومانوار کی فرانسیسی تالیف "بوووازی کے رواج" باب (۵۹)۔

[3] ڈی کانٹر کی فرانسیسی تالیف سینٹ لوئی کی تاریخ جس کی تالیف ژروین ویل نے کی اور جس پر جدید ملاحظات اور تاریخی مقالات کا اضافہ کیا گیا ہے" — دیکھئے مقالہ ۲۹ "خانگی جنگ اور قانون جنگ کے متعلق رواج" صفحہ ۳۰۳ و ما بعد۔

اس میں شریک سمجھ لیے جاتے اور اکثر اوقات اپنی مرضی کے خلاف اس میں پھنس جاتے۔ یہ فریضہ اتنا اہم سمجھا جاتا کہ کوئی شخص اس سے اس وقت تک اپنے کو علحدہ نہ کرسکتا جب تک کہ رشتہ داری سے دستبردار نہ ہو اور ساتھ ہی وراثت سے محروم نہ ہو جائے۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس درجے تک کی رشتہ داری سے جنگ کے سرغنے کا ساتھ دینے کی ذمہ داری پیدا ہوتی۔ اس کا فیصلہ یہ دیکھنے کے ذریعے سے ہوتا تھا کہ قانون مذہبی نے کن کن رشتہ داروں کو نکاح کے اغراض کے لیے محرم قرار دیا ہے۔ جس زمانے میں کلیسا نے سات پشت تک کے بھائی سے نکاح حرام رکھا تھا تو آٹھ پشت تک کے بھائیوں کو جنگ میں حصہ لینا پڑتا۔ ۱۲۱۵ء میں لاتراں کی پانچویں مجلس شورائے مذہبی نے یہ ممانعت چار پشت کے رشتے ہی تک محدود کردی اور جنگ کرنے کی ذمہ داری بھی اسی درجے کے رشتہ داروں تک محدود ہوگئی۔ دو حقیقی بھائیوں کو آپس میں جنگ کرنے کی بالکل اجازت نہ تھی کیونکہ ایک کے جتنے رشتہ دار ہوتے وہی سب کے سب دوسرے کے بھی رشتہ دار ہوتے۔ جنگ میں ایک مرتبہ شریک ہونے کے بعد بھی رشتہ دار اس سے الگ ہو سکتے لیکن اس کے لیے ضروری ہوتا کہ دشمن سردار کو اس کے آقا (بادشاہ) کی عدالت میں طلب کرکے یہ بیان کریں کہ انھوں نے جھگڑے کے اصل باعث کے متعلق کوئی رضامندی نہیں دی ہے اور انھیں قسم کھا کر یہ بھی وعدہ کرنا پڑتا کہ وہ اب اس میں مزید حصہ لینا نہیں چاہتے۔

آسامیوں کے لیے ضروری تھا کہ جنگ کے سرغنوں کا ساتھ دیں۔ اور اگر وہ اس میں شریک ہوتے تو ان پر حملہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انھوں نے صرف اپنا فرض ادا کیا تھا۔

خانگی جنگ کرنے کا حق نہ تو ان لوگوں کو حاصل تھا جو

مقتدر اعلیٰ کے اختیار میں ہوتے اور نہ ہی شہروں کے عام معززین کو۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ ایک شریف آدمی کے سوا کوئی اور جنگ نہیں کر سکتا۔ عوام الناس کو ایسی جنگ کا حق اس وقت تک حاصل نہ ہوتا جب تک بادشاہ ان کو اس کی خصوصی اجازت نہ عطا کرے۔

خصوصی جنگ کا اختتام یا تو اس طور سے ہو سکتا جسے صلح کا نام دیا جا سکتا ہے یا [جنگ سے دستبرداری کا] "اطمینان" دلانے کے ذریعے سے۔ اسی طرح جنگ کا اختتام اس طور پر بھی ہو سکتا کہ اول تو ہر دو فریق "جنگ کی ضمانت" کا عذر کریں یعنی جاگیردار یا آقا کی عدالت میں حاضر ہوئے ہوں اور اسی نے ان کو حکم دیا ہو کہ معاملے کا فیصلہ باہمی مقابلے کے ذریعے سے عمل میں آئے۔ اور دوسرے اس وقت بھی جب کہ جرم یا تعدی کا انتقام عدالت کے ذریعے سے حاصل کیا گیا ہو۔

مذکورہ بالا اطمینان دہانی کے متعلق کچھ تشریح ضروری ہوگی جو فریق جنگ میں شریک نہ ہونا چاہتا یا اس سے علٰحدہ ہو جانے کی خواہش کرتا اس کے لیے ضروری تھا کہ اپنے جاگیردار یا اس کی عدالت کے پاس رجوع ہو اور بتائے کہ اس کے حریف نے اس کو اطمینان دہانی عطا کر دی ہے یعنے اطمینان دلایا ہے کہ اسے جانی یا مالی کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا ہے اور جس بنا پر جنگ شروع ہوئی تھی وہ مسئلہ مقتدر اعلیٰ کے فیصلے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں مقتدر اعلیٰ اپنے ماتحت کو حکم دیتا کہ وہ فریق ثانی کو مطلوبہ اطمینان دہانی عطا کرے اور یہ اطمینان دہانی اس کے رشتہ داروں اور اس کی اولاد کے لیے بھی قابل پابندی ہوتی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس اطمینان دہانی کے لیے فریقین میں سے کسی ایک کی جانب سے مطالبہ ہونے کی ضرورت تھی۔ مقتدر اعلیٰ براہ راست اس میں دخل نہیں دے سکتا تھا؛ البتہ اس کو یہ حق

ضرور حاصل تھا کہ امن یا عارضی صلح کے لیے ان کو مجبور کرے۔

خانگی جنگ سے جو مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں ان کو ایک حد تک رفع کرنے کے لیے جو اولین تدبیریں اختیار کی گئیں ان میں سے ایک سیں لوئی کی طرف سے آغاز کردہ "شاہی چالیس دن" کا امن ہے۔ اور بعض مولف تو اسے فلپ آگسٹ کی طرف سے جاری کردہ قرار دیتے ہیں۔ دوکانژنے اس کا مقصد یوں بیان کیا ہے کہ "یہ اکثر پیش آتا رہا ہے کہ کسی جنگ کے سرغنے کی اولاد یا دیگر رشتہ داروں کو جنگ کے چھڑنے کی کوئی اطلاع نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی کسی مبارزت اور اشتعال دلائے جانے کی۔ بنا برآں ان کے رشتہ داروں کے دشمن ان کو بے خبری کی حالت میں جا دبوچتے ہیں۔ اسی لیے یہ حکم دیا گیا کہ سرغنے کی اولاد اس لڑائی میں اس وقت تک شریک نہ سمجھی جائے جب تک کہ اعلان جنگ اور اشتعال دلائے جانے پر چالیس دن نہ گزر جائیں بشرطیکہ یہ لوگ ان حاضرین میں موجود نہ ہوں جن کی موجودگی میں کسی جھگڑے یا دیگر عملی ذرایع سے جنگ کا آغاز ہوا ہو[1]"

چالیس دن کی یہ مہلت جنگ کی تیاریوں کے لیے استعمال کی جا سکتی، یا "اطمینان دہانی" اور جنگ سے اپنی علیحدگی کے لیے، یا عارضی صلح کے لیے، یا مستقل صلح کے لیے۔ جو کوئی "شاہی چالیس دن" کی پروا کیے بغیر اپنے حریف کے رشتہ داروں کی جان یا مال پر دست درازی کرتا تو اسے بطور غدار کے سزا دی جاتی۔ چالیس دن کی یہ مدت جنگ کے اصل سرغنے کو البتہ بالکل نہ ملتی۔

تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام پر بعض اور تدبیریں

---

[1] دوکانژ کی فرانسسی کتاب "سیں لوئی کی تاریخ" مقالہ نمبر ۲۹ "خانگی جنگ اور قانون جنگ کے رواجات"، صفحہ ۳۳۳۔

آغاز ہوئیں جن سے اس پر اور زیادہ تحدیدیں عائد کی گئیں۔ سنہ ۱۲۹۶ء میں "خوبصورت فلپ" نے اس بات کی قطعی ممانعت کا حکم دیا کہ بادشاہ خود جس زمانے میں جنگ میں مصروف ہو تو کوئی بھی خانگی جھگڑے شروع کیے جائیں اس نے سنہ ۱۳۰۵ء اور سنہ ۱۳۱۴ء میں جو احکام دیے ان میں سنہ ۱۲۹۶ء کے حکمنامے کی توثیق کی گئی ہے۔ "خوبصورت فلپ" کی موت پر مختلف صوبوں کے جاگیردار اس امر پر اصرار کرنے لگے کہ خانگی جنگ کا کرسکنا ان کے امتیازات میں سے ایک ہے۔

سنہ ۱۳۱۵ء میں ان کا مطالبہ پورا ہوتا ہے اور "شاہی چالیس دن" کا قاعدہ رواج باہر ہو جاتا ہے۔ سنہ ۱۳۳۰ء میں ایک شاہی حکمنامے نے پورے علاقۂ آئین میں خانگی جنگوں کی اجازت دے دی، لیکن یہ ضروری قرار دیا کہ ان کا قبل از قبل اعلان کیا جایا کرے۔ اور یہ بھی حکم دیا کہ جس زمانے میں خود بادشاہ کو بیرونی لڑائیوں کی مصروفیت ہوگی تو یہ خانگی جنگیں ملتوی کردی جائیں گی۔ جنگ کے حق کے استعمال پر جو شرطیں عائد کی گئیں ان کے تحت یہ ممکن ہوگیا کہ افسران شاہی اس غرض کے لیے دخل دہی کریں کہ ان شرطوں کی پوری تعمیل ہو۔ سنہ ۱۳۵۲ء کا حکمنامہ یہ ضروری قرار دیتا ہے جو جاگیردار اس مہم کی سرداری کرنے والا ہو، وہی فریق ثانی کو پیام اشتعال ومبارزت روانہ کرے اور یہ کہ کسی دوسرے شخص کو خانگی جنگ کا حق نہ ہوگا۔ اس کے ایک ہی سال بعد "شاہی چالیس دن" کا قاعدہ بحال کردیا گیا۔ سنہ ۱۳۶۱ء کے حکمنامے میں سب سے پہلی مرتبہ اس کی صراحت کے ساتھ ممانعت کی گئی کہ "جاگیرداروں کے امتیازات اور رواج کے باوجود" کسی بھی قسم کی خانگی جنگ کی جاسکے۔

اس کے چھے سال بعد ایک نیا تنسیخی حکمنامہ جاری ہوتا ہے جس نے یہ ضروری قرار دیا کہ "خاطی جلاوطن کیے جاسکیں گے اور ان کے قریبی رشتہ دار اور دوست گرفتار وقید کرلیے جاسکیں گے۔" سنہ ۱۳۱۱ء میں

86

ایک اور فرمان کے ذریعے سے خانگی جنگ کی ممانعت کی گئی۔[1] یہ اس وقت تک باقی رہا حتیٰ کہ گیارھویں لوئی نے جاگیرداری نظام ہی کو توڑ نہ ڈالا۔

جرمنی میں یہ برائی پوری شدت کے ساتھ جاری رہی اور حق قوت یعنی لاٹھی راج اپنے پورے نتائج کے ساتھ ایک مسلمہ قاعدہ سمجھا جاتا رہا۔ اور اس حق سے ہر کوئی مستفید ہوسکتا تھا۔ یہ نہ بھلایا جائے کہ جرمن شہنشاہت، بادشاہت کے تصورات سے متاثر ہوچکنے کے باوجود حقیقت میں ایک وسیع اعیانیت ہی رہی اور ماتحت حکمرانوں کی خود مختاری قریب قریب مکمل ہی رہی اور مرکزی اقتدار کا اثر تقریباً صفر رہا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جھگڑوں اور لڑائیوں کا ایک سلسلہ برابر جاری رہا۔ شہنشاہ، شہر، جاگیردار[2] اور عامہ رعایا یہ سب بارہا اس کی کوشش کرتے رہے کہ اس تکلیف دہ صورت حال کا کوئی علاج کریں۔

فریڈرک بار بروسہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس غرض کے لیے لڑتا رہا کہ ملک کے امن کا احترام کیا جائے۔ اس کے جانشینوں نے بھی اسی طرز عمل کو اپنا نمونہ بنایا۔

تورم برگ کی مجلس قومی نے جو شہنشاہ کے حکم سے منعقد ہوئی تھی، ایک عمومی امن کا اعلان کیا اور اس کی ممانعت کی گئی کہ خانگی جنگیں کی جاسکیں بجز اس کے کہ کوئی شخص اپنی ذات یا اپنے باپ یا اپنے حلیف کا انتقام لینا چاہتا ہو۔ اور خود اس صورت میں بھی اس کی اجازت نہ تھی کہ حریف کو باقاعدہ طور سے اطلاع دینے کے بعد

---

[1] دِربوا کی فرانسیسی کتاب "فرانس کی تعزیرات کی تاریخ" صفحہ ۵۲ و مابعد۔

[2] فون ویشتر کی جرمن تالیف "جرمن تاریخ پر مضامین خاص کر جرمن قانون تعزیرات کی تاریخ پر" صفحہ ۴۹ و مابعد۔ نیز دیکھیے یولیوس بروگ کی جرمن تالیف "قرون متوسط کی جرمن دولت عامہ کے قانون انتقام کے اصول"۔

تین دن گزرنے سے پہلے کوئی حملہ کیا جائے۔ ان احکام کی اکثر تجدید بھی ہوتی رہی۔

یہ علاج ناکافی ثابت ہوا۔ اس لیے "معاہداتی امن" کا اضافہ عمل میں آیا۔ اس کی ایک مثال ۱۲۴۷ء میں ملتی ہے۔ دوسرے فریڈرک کو معزول کرنے پر جرمنی میں جس قسم کا تاراج پھیل گیا تھا اس سے قوانین بیکار ہوگئے تھے، امن و امان برطرف ہوگیا تھا، عوام الناس کے لیے اطمینان رخصت ہوچکا تھا، اور خانگی جنگوں نے واقعی قزاقی اور ڈاکہ زنی کی صورت اختیار کرلی تھی۔ دریائے رائن اور سواب کے صوبوں کے جاگیرداروں نے ان علاقوں میں کسی اور برتر اقتدار کی قطعاً غیر موجودگی کے باعث خاص کر ایک ہولناک اباحیت برپا کرنے کا امتیاز حاصل کرلیا۔ اور یہ علاقے قتل اور لوٹ کی وارداتوں سے لبریز ہوگئے۔ مائنس اور ٹری ییر نیز کولون کے آرک بشپوں نے ۱۲۴۷ء میں بمقام ورمس اور اس کے بعد بمقام مائنس ان حکمرانوں سے ایک معاہدہ کیا جو اس قسم کی لوٹ مار سے سب سے زیادہ نقصان اٹھا رہے تھے۔ نیز دریائے رائن کے دونوں کناروں پر تسویزش سے کولون تک بسے ہوئے (۶۰) سے زیادہ شہروں سے بھی۔ اور ان معاہدہ کرنے والوں نے اقرار کیا کہ امن عامہ میں خلل ڈالنے والوں کے خلاف یہ سب مل کر ایک مدامی جنگ کریں گے۔

"حق قوت" میں بھی تنظیم پیدا کی گئی۔ چنانچہ شاہی احکام کا ایک سلسلہ نیز ۱۳۵۶ء کا "زرین فرمان پاپائی" اس غرض کے لیے جاری ہوئے کہ اس کے قواعد پوری تفصیل کے ساتھ بیان کریں۔ چنانچہ قرار دیا گیا کہ جو کوئی انتقامی جنگ تو مول لے، لیکن وہ شرطیں پوری نہ کرے جو اس کے لیے عائد کی گئی ہیں، تو وہ ملک کی امن شکنی کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ اور اسے وہ سزا دی جائے گی جو اس جرم کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ اعلان مبارزت ایک پیام رساں کے

ذریعے سے کیا جاتا، جو حریف کے گھروالوں کے لیے کوئی اشتعال انگیز چیز انجام دیتا۔ جنگ کے چھڑ جانے پر کلیسا سے تعلق رکھنے والے مذہبی افسروں بیماروں، زائروں، تاجروں اور کسانوں پر دست درازی نہیں کی جاتی۔
جرمن شہروں کی تاریخوں میں انتقامی لڑائی کی تاریخ کا ایک نہایت دلچسپ باب مل سکتا ہے۔ "شہری امن"، جس کے ذریعے سے شہر کے آزاد باشندوں کی حفاظت کا اطمینان دلایا جاتا، وہ نہ صرف تمام شہریوں کو حاصل ہوتا بلکہ اجنبی بھی اس میں شامل سمجھے جاتے۔ اور شہر کی فصیل کے اندر کوئی خانگی جنگ روا نہیں رکھی جاتی۔ البتہ حدود شہر کے باہر لڑائیوں کی جو اجازت دی گئی تھی اس کے معنے صرف یہ تھے کہ شہر والے اگر اس میں حصہ لیتے تو حکام شہر ان کے خلاف کوئی چارہ کار نہیں اختیار کرتے۔ جلدی ہی کسی شہر کے باشندوں کے مابین خانگی جنگ کی ممانعت عمل میں آگئی، بلا لحاظ اس کے کہ وہ جنگ کس جگہ لڑی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر ۱۱۸۶ء میں جو قانون بمقام نورمس بنایا گیا، اس کی رو سے اگر کوئی شخص اپنے ہم شہری کا تعاقب حدود شہر کے باہر کرے، بلا لحاظ اس کے کہ وہ شہنشاہی علاقے کے کس حصے میں عمل میں آیا، تو اس کے متعلق خیال کیا جائے گا کہ گویا اس نے شہر کے اندر ہی اس فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ اور اسی بنا پر اسے سزا دی جائے گی۔[۱]

متعدد شہروں نے بعض عجیب احکام صادر کیے۔ چنانچہ انھوں نے اجنبیوں کو تو آپس میں انتقامی لڑائی لڑنے کی اجازت دی لیکن اس شرط سے کہ جو کوئی اس میں حصہ لے وہ اپنے حقوق شہری سے دست بردار ہو جائے۔ اس طرز عمل کا باعث ذمہ داری کے مول لینے کا خوف تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی تک اس کا رواج نظر آتا ہے کہ

[۱] فون ماورر کی جرمن کتاب "جرمنی کے شہری دستوروں کی تاریخ" جلد (۱) صفحہ ۳۶۹ و مابعد۔

شہروں کے باشندے "اجازت کی سرفرازی" کی درخواست کرتے اور اپنے
حقوق شہری سے دست بردار ہوتے تاکہ جنگ میں حصہ لے سکیں۔
ظاہر ہے کہ یہ دست برداری عارضی ہوتی اور جھگڑا چکنے کے بعد لڑائی
میں حصہ لینے والے اپنے اپنے شہروں میں اپنی پرانی حیثیت
دوبارہ حاصل کر لیتے۔[لہ]

خود شہر بسا اوقات خانگی جنگ کرتے۔ کبھی تو طاقتور خاندانوں
کے خلاف، کبھی مختلف شہر آپس میں، اور کبھی خود اپنے بادشاہ کے خلاف۔
بہرحال اس قسم کا منظر صرف جرمنی ہی میں نہیں پیش آرہا تھا۔
انگلستان میں پہلے ایڈورڈ اور دوسرے ایڈورڈ کے زمانے میں "پانچ
بندرگاہیں" اور دیگر تجارتی شہر سدا اپنے ہمسایہ ساحلوں کے باشندوں
سے لڑتے رہے۔ ہالم نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ ریمر کے مجموعے
میں جو دستاویزیں ہیں ان میں سے آدھی سے زیادہ انھیں جھگڑوں
کی نسبت ہیں اور ان جھگڑوں کی شہادت دیتی ہیں جو ناروے اور
ڈنمارک کے جہاز رانوں سے پیش آتے رہے۔ خود رقابتوں کے باعث
انگلستان کے مختلف شہروں میں خونریز جھگڑے ہوتے رہے۔ فلانڈرس،
زیلانڈ اور فرانس کے ساحلی شہر بھی اپنے جھگڑوں میں ہتھیار سے
برابر مدد لیتے رہے۔[کہ] جرمنی کی اضطراب انگیز حالت سے ایک
خصوصی ادارہ وجود میں آیا جسے "آوس ترے گے" یعنی پنچایت کہنے لگے
چنانچہ جرمن شہنشاہت کی مختلف مملکتیں باہمی جھگڑوں کے لیے پنچ مقرر
کرنے لگیں۔

جرمنی سے خانگی جنگ کو ختم ہونے کے لیے صدیاں لگ گئیں۔
ترکوں کے خطرے سے جو دہشت پیدا ہو گئی تھی اسی کے دباؤ کے تحت

لہ۔ ایضاً جلد (۱) صفحہ ۳۱۴ و مابعد۔

کہ۔ ہالم کی فرانسیسی کتاب "یورپ قرون متوسط میں" باب ۵ حصہ دوم۔

سنہ ۱۴۹۵ء میں ثورش کی مجلس قومی نے مکرر اندرونی امن کا اعلان کیا اور شہنشاہی مجلس کو اس بارے میں اعلیٰ ترین اختیار سماعت عطا کرکے یہ حق دیا گیا جرمن "جمہ" کے مختلف "اعضاء" میں جو جھگڑے پیدا ہوں، ان کا قطعی فیصلہ کرے، اور اس فیصلے کا کہیں اور مرافعہ نہ ہوسکے۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی کے وسط تک اس حکمنامۂ ثورمس کی بجیس سے زیادہ مرتبہ توثیق کرنی پڑی۔

خانگی جنگ کا حق اٹلی میں بھی ایک مسلّمہ امر تھا۔ اس کے باعث وہاں عظیم الشان تباہیاں نازل ہوئیں۔ جو شہنشاہی قوانین جرمنی اور اٹلی میں قابل نفاذ تھے، انھوں نے اس صورت حال کی نزاکت کا علاج کرنے کی کوشش کی۔ ایک قانون جو خاص کر اٹلی کے لیے بنایا گیا تھا، اس میں یہ حکم تھا کہ "تمام ڈیوک، مارکوئیس، کونٹ، کپتان، ثالثانشور یعنی جاگیردار، صوبوں کے گورنر، قونصل، اور شہروں کے عمومی حکام عدالت، غرض یہ کہ جملہ آزاد اشخاص جن کی عمر (۱۸) اور (۶۰) سال کے مابین ہو، اس بات کا حلف لیں کہ امن کو ملحوظ اور باقی رکھیں گے اور یہ کہ وہ اس حلف کی ہر پانچ سال بعد تجدید کیا کریں"۔ اس حلف کی خلاف ورزی پر شہروں کو تو سو سو اشرفیوں تک جرمانہ کیا جاتا تھا، اور معمولی شہریوں کو چھے چھے اشرفیوں تک۔ امن شکنی سے جن لوگوں کو نقصان پہنچتا انھیں ان کے ہرجے کے تناسب سے معاوضہ دلایا جاتا۔[۱]

فریڈرک باربروسہ کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ اٹلی میں خانگی جنگ اور بہت دنوں تک برقرار رہی۔

اس امر کا بیان کرنا کافی دلچسپ ہے کہ "بیت المقدس کے قواعد" [جو تیرھویں صدی کے آغاز میں گوڈفرائے دبوئیوں کے حکم سے عیسائی سلطنت بیت المقدس کے لیے تیار کیے گئے تھے] خانگی جنگ کے

۱۔ دِربوا کی فرانسیسی تالیف "جدید قوموں کے قانون تعزیرات کی تاریخ" جلد (۲) صفحہ ۵۰۔۴۹۔

حق کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ چیز اس مملکت میں جائز نہیں سمجھی جاتی تھی۔

سویڈن میں یہ بربری رواج سولھویں صدی عیسوی کے وسط تک پھلتا پھولتا رہا۔ اوروں کی طرح بلند مرتبہ پادری بھی وسطی اور جنوبی یورپ میں اس حق کا اپنے لیے استعمال کرتے رہے، لیکن وہ اس کا استعمال اپنے نائبوں یا مختاروں کے ذریعے سے کرواتے تھے۔ اور سب سے آخر میں جو لوگ اس حق سے دستبردار ہوئے وہ بھی یہی تھے۔ گستاف واسا کے زمانے میں اس کی ضرورت پیش آئی کہ ایک سرکاری قانون نافذ کر کے ان لوگوں کے قبضے سے بہت سے قلعے لے لیے جائیں اور اُن قلعوں کی حفاظت بادشاہ کے سپرد کی جائے۔

وارڈ نے بیان کیا ہے کہ پولستان (پولینڈ) کو چھوڑ کر اسکاٹ لینڈ کے برابر کسی اور ملک نے خانگی جنگ کو اتنے زیادہ دنوں جاری نہیں رکھا۔[1]

اس کے علاج کے متعلق بادشاہوں کے پاس کوئی قوت نہیں ہوتی ہے۔

---

[1] سترھویں صدی کے بعد سے خانگی جنگ صرف شاذونادر ہی نظر آتی ہے۔ وارڈ نے بیان کیا ہے کہ مانفیلڈ کے ارنسٹ اور سکسنی گئے برنارڈ نے اپنے ہی طور پر "تیس سالہ جنگ" کے دوران میں جنگیں شروع کی تھیں (دیکھیے وارڈ کی انگریزی کتاب "دی یورپ کے قانون بین الممالک کی بنیاد اور تاریخ کے متعلق تحقیقات" جلد (۲) صفحہ ۳۱۲۔

ریال نے بھی دو مثالیں دی ہیں جو چودھویں لوئی کے زمانے کی ہیں۔ سنہ ۱۶۸۳ء میں بوئیوں کے ڈیوک نے، جو شخصی طور سے فرانس کی رعایا تھا اور جس کی ڈیو کی تاج فرانس کی حفاظت میں تھی، چودھویں لوئی کے دشمنوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی۔ اور اس کا اعلان بادشاہ کے حکم سے پاریس میں شائع اور چسپاں کیا گیا تھا۔ اسی سال اشافٹ لو کے پادری نے، جو شہنشاہت کے ماتحت حکمرانوں میں سے ایک کہلانا چاہتا تھا، فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ دیکھیے ریال دو کوربان کی فرانسیسی کتاب "علم حکمرانی" جلد ۵ صفحہ ۳۴۳)

وہ تدبیریں تو اختیار کرتے تھے لیکن انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ شاہی خزانوں کے حسابات اس کے متعلق اشاروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ایسے مراسلے بکثرت ہیں جن میں جاگیرداروں پر یہ بات واجب قرار دی گئی تھی کہ اپنے خونریز جھگڑوں کو ختم کردیں اور اپنی شکایتوں کو حکمرانوں کے انصاف کے لیے پیش کریں۔ پارلیمان بھی اس میں مداخلت کرتی ہے۔ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اعلان کیا کہ جاگیرداروں کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس نے ملزموں کو نام لے کر بھی متعین کیا۔ مگر یہ سب بے سود ہی رہا[1]۔ اس المناک داستان کی تکمیل کے لیے ان خانگی جنگوں کے علاوہ شاہی اقتدار کے خلاف بغاوتیں بھی بکثرت پھوٹ پڑتی رہیں۔ سترھویں صدی کا ایک انگریز مولف اسکاٹ لینڈ والوں پر بظاہر مبالغہ آمیز طور سے یہ الزام لگاتا ہے کہ انھوں نے ایک بربری طریقے سے اپنے حکمرانوں میں سے چالیس کو قتل کردیا تھا۔ اور وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ان میں سے بیس سے زیادہ موت کے ذریعے سے ان تکلیفوں سے بچ گئے جو ان کو دی جانے والی تھیں یا تباہ حالی میں موت سے دوچار ہوئے۔ اس سے ایک صدی پہلے جارج بکنن نے جو بڑا زبردست مخالف بادشاہت شخص تھا اپنی لاطینی کتاب "بادشاہ کے حقوق اسکاٹ لینڈ والوں پڑ" میں اس نظریے کی تائید کی ہے کہ ظالم پروار ہی کردینا چاہیے۔ اور اس نے مسرت کے ساتھ ایسی بارہ مثالیں دی ہیں جن میں اسکاٹ لینڈ کے بُرے بادشاہ یا تو قید کردیے گئے تھے یا جلاوطن یا قتل۔

نظریات کی دنیا میں خانگی جنگ کے ادارے کی تائید نہیں کیجاسکتی تھی۔ جو کوئی جنگ کا نام لیتا تو اس سے مراد مقتدرِ اعلیٰ کے اقتدار کا عمل میں آنا مراد ہوتا۔ جس واحد جنگ کی اجازت دی جاسکتی ہے وہ

---

[1] لاطینی کتاب "خزانوں کے حسابات" جلد (۱)، دیباچہ صفحہ ۵۹۔

سرکاری جنگ ہے۔ "قانون روما" بھی اس بارے میں دھوکا نہیں دیتا اور اس میں صراحت کے ساتھ (لاطینی میں) یہ قاعدہ بیان کیا گیا کہ "ہتھیاروں کی کسی قسم کا بھی استعمال حکمران کے علم کے بغیر کوئی اور نہیں کر سکتا۔" شہنشاہ قانطنطین اور قانینس کے حکمنامے میں (لاطینی میں) یہ قانون درج ہے کہ "کسی کو بھی ہرگز یہ حق نہ ہوگا کہ ہمارے علم اور اجازت کے بغیر ہتھیاروں کو حرکت میں لائے۔" قرون متوسطہ کے ماہرین قانون کے متعلق ہم اس واقعے کو جتنا بھی نمایاں طور سے واضح کریں وہ کم ہی ہوگا کہ وہ عام طور پر "قانون روما" کے تصورات سے متفق تھے، اور انھوں نے اس بارے میں جو بھی خیالات ظاہر کیے ہیں وہ بالکل صاف ہیں۔ اور حقیقت میں یہ ماہرین قانون ہر جگہ اس بات کے لیے لڑتے رہے کہ مرکزی اقتدار کو اس کے سب سے زیادہ قیمتی خصوصیات میں سے ایک واپس دلادیں۔ شروع سے وہ یہ کہتے رہے کہ صرف وہی شخص جنگ کرنے کا حق رکھتا ہے جس سے اوپر کوئی اور مسلمہ سردار نہ ہو۔ اور بارتولے نے بیان کیا ہے کہ اگر ایسے شہروں میں آپس میں جھگڑا پیدا ہو جو کسی ایک مقتدر اعلیٰ کے ماتحت ہیں تو حقیقت میں اسے جنگ ہی نہیں کہہ سکتے۔

ان درست خیالات کی تائید کرنے میں ماہرین قانون اکیلے نہ تھے۔ چنانچہ خود تیرھویں صدی میں اکویناس کے سینٹ ٹامس نے، جس کا اثر قرون متوسطہ کے خیالات پر عظیم الشان پڑا ہے، یہ لکھا ہے کہ کسی جنگ کے منصفانہ قرار دیے جانے کے لیے تین شرطوں کا مطالبہ ہوتا رہا۔ ان میں سب سے مقدم یہ ہے کہ (لاطینی میں) "حکمران کی اجازت سے جنگ کی جائے۔" یہ کہنے سے کہ جنگ کی اجازت حکمران کی طرف سے دی جانی چاہیے، یہ بتانا مقصود ہے کہ کوئی اور خانگی شخص اپنے طور پر جنگ کا اختیار نہیں رکھتا۔ چنانچہ یہ ممتاز ماہر دینیات ٹامس (جو کتاب "دینیات کے چوٹی کے مسائل" کا مولف ہے)

ایک طرف تو یہ بیان کرتا ہے کہ خانگی افراد اپنا حق عدالت کے سامنے آکر جتا سکتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ یہ بیان کرتا ہے کہ سپاہیوں کا طلب کرنا مقتدرِ اعلیٰ کا ایک اختیاری فعل ہے۔ اور چونکہ حکومت حکمران کے سپرد کی جاتی ہے، اس لیے اس حکومت کی مدافعت بھی اسی کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔

اکوئناس کے سینٹ ٹامس نے جنگ اور عدل گستری میں ایک مماثلت بھی قایم کی ہے۔

جنگ کا اعلان کس کی طرف سے عمل میں آسکتا اور جنگ کون کرسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ایک اور سوال پیدا کرنے لگا کہ اس بات کو معلوم کیا جائے کہ مقتدرِ اعلیٰ کون ہے؟

نظریے کی حد تک اس کا حل آسان ہے۔ پوپ اور شہنشاہ پوری طرح خود مختار ہیں۔ انھیں کو جنگ کا اعلان کرنے اور جنگ کرنے کا حق ہے۔ لیکن عمل کی حد تک یہ معاملہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ پوپ اور شہنشاہ نے اپنے آپ کے متعلق یہ اعلان کرلیا تھا کہ وہ دنیا کے آقا ہیں، لیکن ہر طرف ایسے حکمران یا شہر نظر آتے تھے جو اپنے اوپر کسی اور اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان ماہرینِ قانون نے تسلیم کرلیا کہ پوپ اور شہنشاہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی جنگ کے حق کا استعمال کرسکتے ہیں۔

"فِرژیے کا خواب" نامی فرانسیسی کتاب میں اس نظریے کو عمدگی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ "جو حکمران زمین پر کسی اور کو اپنا مقتدرِ اعلیٰ نہیں مانتا ہے، وہ عدالتی طریقۂ کار کو چھوڑ کر جنگ کرنے میں حق بجانب ہوسکتا ہے.... اور کوئی فرد رعیت اپنے مقتدرِ اعلیٰ کی اجازت کے بغیر جنگ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ایک قانون میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے یعنی: (لاطینی میں) ہتھیاروں کے استعمال کے قواعد، پہلا قانون، کتاب نمبر (۱۱)[۱]"

[۱]۔ فرانسیسی تالیف "فِرژیے کا خواب" حصۂ اول باب (۱۴۵)۔

اونورے بونے اس رائے کو قبول کرلیتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر کرسٹین ڈپیزان ہے، جو اس کو مزید ترقی دیتی ہے۔ چنانچہ:
"ان لوگوں کو جو اس نکتے پر بھٹک سکتے ہیں، اگر صحیح بات بتانا چاہیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلاشک وشبہہ حق اور قانون دونوں کے مطابق جنگ یا لڑائی کا اختیار کسی اور کو نہیں سوائے مقتدران اعلیٰ کے۔ مثلاً شہنشاہ، بادشاہ، ڈیوک، اور دیگر دنیاوی حاکم جو اسی طرح کے دنیاوی اختیارات کے نقطۂ نظر سے بڑے سردار ہوں"۔
یہ نکتہ فرانس کے قانون عمومی میں معتقدات کی سی حیثیت اختیار کرنے لگا تھا۔ کرسٹین ڈپیزان نے اسے ایک معقولیت پسندانہ بنیاد دے دینی چاہی۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "نہ کسی بیرن یعنی جاگیردار کو اور نہ ہی کسی اور شخص کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اس بات کا کوئی اختیار ہے؛ بجز اس کے کہ اس کا اقتدار اعلیٰ رکھنے والا سردار اس کی اجازت اور رضامندی دیدے اور اسے درست قرار دیدے .... کیونکہ اگر اس کے خلاف ہوسکے تو مقتدر حکمران کس کام آئیں گے جب وہ اپنی رعایا میں سے ہر ایک کے لیے حق کا نفاذ اور حق رسانی نہ کرسکیں؟ اور ان پر کسی استحصال بالجبر کے ذریعے سے ظلم ہو تو ان کی حمایت اور حفاظت نہ کرسکیں؟ جیسا کہ اچھا چرواہا اپنی بھیڑوں کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈال دیتا ہے، اسی طرح رعایا کے لیے ان کے راعی یعنی حکمران کو ایک پناہ گاہ بن جانا چاہیے، جب کہ رعایا کو کوئی مصیبت پیش آئے۔ اور اچھا حکمران اپنی رعایا کی خاطر ہتھیار اٹھائے گا، جب اس کی ضرورت ہو۔ یعنی اپنی پوری قوت سے رعایا کی مدد کرے گا کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کرے، چاہے یہ مدد عدالتی ذرائع سے ہو، چاہے ہتھیار اٹھانے کے ذریعے سے۔ یہ اصل نہیں

لہ کرسٹین ڈپیزان کی فرانسیسی تالیف "ہتھیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" حصۂ اول باب (۳)۔

ایک ادیبانہ انداز اور لطیف اسلوب میں اسی قاعدے کی توضیح کرتا ہے جس کے متعلق ہم نے دیکھا کہ قانون روما نے اس کو اتنی صفائی کے ساتھ قایم کردیا تھا۔

ژاں لوپیں نے اپنی لاطینی کتاب "استاد و شاگرد کے مکالمے" کے ایک مکالمے میں یہ سوال کیا ہے کہ "جو لوگ بطور واقعہ اپنے اوپر کسی سردار کو تسلیم نہیں کرتے، جیسے فرانس کا بادشاہ یا اسپین کا بادشاہ، آیا وہ صحیح معنوں میں جنگ کرسکتے ہیں یا نہیں؟" مولف نے اس کا جواب اثبات میں یوں دیا ہے کہ "ہاں۔ کیونکہ انھیں حکمرانانہ حقوق حاصل ہیں۔ اور انھیں کسی برتر سردار سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان پر کوئی اور سردار ہوتا ہی نہیں[1]"

فلپ ویلانت نے، جو ایک فلانڈری ماہر قانون تھا، قانون جنگ کے متعلق چند دلچسپ سطریں مختص کی ہیں۔ چنانچہ خاص کر اس سوال سے بحث کرتے ہوئے کہ کونسے حکمران جنگ کرنے کا حق رکھتے ہیں اس نے پوپ اور شہنشاہ کا ذکر کیا ہے: "کیونکہ ان کے اوپر کوئی سردار نہیں ہوتا" اس مولف کی رائے میں باقی تمام دوسرے حکمرانوں کو جنگ کرنے کا بطور واقعہ تو اختیار ہوتا ہے لیکن بطور حق نہیں کیونکہ جہاں تک حق کا سوال ہے ایسے حکمرانوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے سے برتر سرداروں کو تسلیم کریں۔ البتہ اس مولف نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ غاصبانہ تصرف اور رواج بے شبہہ اس آخر الذکر قاعدے کے خلاف ہیں۔ ان دیگر حکمرانوں میں ویلانت نے اسپین، انگلستان، اور اسکاٹ لینڈ کے بادشاہوں کا ذکر کیا ہے۔

نکولاس اے ڈر ہارڈی ایک قابل لحاظ شخص گزرا ہے۔ اس نے

93

[1] ژاں لوپیں (یحنس لوپس) کی لاطینی کتاب "حکمرانوں کی حلیفی کے متعلق مکالماتی رسالے" رسائل قانون عمومی جلد (۱۶) ورق ۳۰۳ و مابعد۔

نوبت بہ نوبت ہالینڈ کی مجلس شوریٰ کی اور مالی نیس کی مجلس شورائے اعظم کی صدارت کے فرائض انجام دیے تھے۔ اس نے لاطینی میں "مشورے" نامی ایک کتاب تالیف کی تھی۔ اس میں اس نے واضح کیا ہے کہ حکمران کی اجازت کے بغیر کوئی جنگ نہیں کر سکتا، اور یہ کہ حقیقت میں حکمران اس بارے میں رومی عوام کا قائم مقام ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں: "اگر قانون قدرت کا امن کے ساتھ انطباق عمل میں آئے تو اس کا مطالبہ ہو گا کہ اجازت لی جایا کرے، مشورہ لیا جایا کرے، بحث مباحثہ کیا جایا کرے اور تاجروں کو اطلاع دی جایا کرے تاکہ وہ ہنگامہ آرائی کے اندر حفاظت اور سلامتی سے رہ سکیں۔"

ژول فیرے تی نے، جو شارل کیں کا ایک عہدہ دار تھا، لکھا ہے کہ پوپ کو چھوڑ کر باقی تمام حکمران شہنشاہ کے ماتحت ہیں اور اسی سے اپنے امتیازات و اختیارات حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے اپنے الفاظ میں: "جن کو ایسے امتیازات حاصل نہ ہوں وہ شہنشاہت کے حقوق اور علاقوں پر غاصبانہ تسلط رکھنے والے سمجھے جائیں گے، سوائے اس کے کہ کوئی حکمران اپنی بہادری کے ذریعے سے اپنا وہ مقبوضہ علاقہ غیر عیسائیوں سے حاصل کریں مثلاً اسپین اور پرتگال کے بادشاہ۔"

الفونسو الوار یتس خیرے ای زو نے اپنی حد تک اس خیال کی تائید کی ہے کہ حقیقی جنگ کا اعلان شہنشاہی اجازت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ شہنشاہ کو یہ حق رومی عوام سے حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ اگر جنگ کسی اور کی اجازت سے کی جائے تو جنگ کے ذریعے سے جو حقوق حاصل ہوتے ہیں وہ حاصل نہ ہو سکیں گے، خاص کر قید کرنے کا حق۔ البتہ اس مولف نے تسلیم کیا ہے کہ اس کے زمانے میں رواج کے باعث، جو اصل میں ایک بگڑی ہوئی اور فسادی صورت حال سمجھی جا سکتی ہے، تمام بادشاہ جنگ کا اعلان خود کرتے ہیں اور اس

بارے میں نہ تو پوپ سے مشورہ کرتے ہیں اور نہ شہنشاہ سے؛ اور ایسی جنگ کو ایک درست اور حقیقی جنگ تصور کرتے ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک حق کا تعلق ہے، اسپین کا بادشاہ شہنشاہ کو اپنا سردار نہیں تسلیم کرتا، کیونکہ اسپینیوں نے اپنا علاقہ [شہنشاہ سے حاصل نہیں کیا بلکہ] غیر عیسائیوں سے چھینا ہے۔ اس مولف نے پھر بھی یہ بیان کرنا ضروری سمجھا ہے کہ فرانسس والے شہنشاہ کے ماتحت ہیں[۱]۔

[اسپینی مولف] فرانسوا دے ویتوریا اس بات کی طرف مائل نظر آتا ہے کہ جنگ کرنے کا حق صرف "مکمل جمہوریت" ہی کو حاصل ہونا چاہیے۔ اس اصطلاح سے وہ ایک ایسی جماعت مراد لیتا ہے جو قایم بالذات ہو، جس کے اپنے قوانین ہوں، جس کے اپنے حکام عدالت ہوں۔ کیونکہ مکمل اسی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ بلّی نے شہنشاہ کی ماتحتی سے آزاد حکمرانوں میں فرانس اور اسپین کے بادشاہوں کے علاوہ میلان کے ڈیوک کا نام بھی شامل کیا ہے جو اپنے علاقوں میں ایک واقعی حکمران ہے اور مکمل اقتدار رکھتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ شہنشاہ[۲]۔ اسی مولف نے بارتولے اور بالدے کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے ڈینیس والوں کا بھی ذکر کیا ہے کیونکہ "فل گو سے کے بیان کے مطابق ڈینیس ایک نیا روما ہے، وہ ایک عمومی وطن ہے، اور اس پر شہنشاہی قوانین کے ذریعے سے حکمرانی نہیں ہوتی ہے بلکہ قدرتی انصاف اور اس قانون کے ذریعے سے جو اس نے خود وضع کیا ہے[۳]۔"

94

[۱]۔ الفونسو الواریز خیرے ای رو کی لاطینی تالیف "پوپ اور شہنشاہ کے حقوق پر تبصرہ" باب (۱۴) منصفانہ و غیر منصفانہ جنگ۔

[۲]۔ بلّی کی لاطینی تالیف "فوجی اور جنگی معاملات پر رسالہ" حصہ اول حقوق عمومی کی بحث۔

البیری کوس جنتی لیس کی مشہور تعریف میں بھی یہی مفہوم پنہاں ہے اور وہ لاطینی تعریف یہ ہے کہ "جنگ پبلک (سرکاری) اسلحہ کے ذریعے سے منصفانہ مقابلے کا نام ہے"۔

جیسا کہ سر ٹرا ڈرس ٹوِس نے دکھایا ہے کہ جنتی لیس کی تعریف کے مطابق جنگ خانگی اشخاص کے مابین ہو ہی نہیں سکتی۔ اور یہاں جنگ سے مراد وہ صورت ہے جب اس کے حقوق اور واجبات قانون عمومی کے دائرۂ عمل میں آجاتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو تعریف گروشیوس نے کی ہے وہ محض ناکافی ہے۔ چنانچہ گروشیوس نے لکھا ہے کہ "جنگ وہ صورت یا حالت ہے جس میں فریقین کسی جھگڑے میں قوت سے مدد لیتے ہیں"۔ اس تعریف سے خانگی جنگ اور ڈوئل یعنے دو آدمیوں کا مقابلہ یہ دونوں اس اصطلاح میں شامل ہو جاتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ جلد (۱۶) ورق (۳۳۵) ومابعد۔

باب ششم

جنگ کے اسباب

گروتیوس نے اپنی لاطینی کتاب "قانون جنگ و صلح" کی تمہید میں بیان کیا ہے کہ اس کے پیشروؤں نے عام طور پر جنگ کے متعلقہ مواد کو صرف سطحی طور سے چھوا ہے۔ اس نے صرف بلتازار دے آیالا اور البیریکوس جنتی لیس کو اگرچہ بے عدیل قرار دیا ہے لیکن پھر بھی ان دونوں کے خلاف اس نے ایک دوسری شکایت کی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے ایک خاص نکتے یعنے جنگ کے منصفانہ یا غیر منصفانہ ہونے کے متعلق کافی بحث نہیں کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "آیالا نے بالکل وہ وجوہ بیان نہیں کیے ہیں جن کی بنا پر کسی جنگ کو منصفانہ یا غیر منصفانہ کہا جاتا ہے۔ جنتی لیس نے چند عام چیزوں کو جن سے وہ اجمالی طور سے بحث کرتا ہے، حسب دلخواہ نمایاں ضرور کر دیا ہے لیکن اس نے متعدد عمدہ اور عجیب مسایل کو چھوا تک نہیں ہے اگرچہ وہ مسایل نہایت عام واقعات کے گرد گھومتے ہیں"

ہم نے اس کی طرف پہلے ہی اشارہ کر دیا ہے۔ گروتیوسس کو بھول ہوئی ہے۔ جہاں تک خاص اسباب جنگ کے مسئلے کا تعلق ہے، اگر واقعی کوئی ایسی قابل ملامت چیز پائی جاتی ہے جس سے گروتیوس کے پیشرو نہ بچ نہیں سکتے، تو وہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے اس بحث کے متعلق چپ سادھ لی تھی[1]۔ ورنہ ان کی اکثریت اس بحث کے متعلق غیر معمولی توجہ کرتی ہے اور بہت سے تو عجیب عجیب نتائج پر پہنچتے ہیں۔ اگر ان کے خلاف واقعی کوئی تنقید کی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے ایک ضرورت سے زیادہ موشگافی سے، نیز مبالغہ آمیز استدلال کی نزاکت آرائی سے، امتیازات پیدا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ماہران قانون میں سے خاص کر متکلمین نے اس بحث میں ایک غیر معمولی مناظرانہ روش اختیار کی ہے جس میں ارسطو کا طاقتور اثر کام کرتا ہے کیونکہ وہی ان کے فلسفے کی اساس تھا، جیسا کہ سینٹ آگسٹائن ان کی دینیات کی اساس تھا۔

جیسا کہ بلونچ لی نے بیان کیا ہے، ایک شریف اور فیاض شخصیت جو قانون بین الممالک کی بہترین تالیفوں میں سے ایک کا مصنف ہو اور جو صرف اس بات پر قانع نہ رہنا چاہتا ہو کہ اخلاقی مسایل پر تفصیل سے بحث کر دے، وہ صرف اسی بات کی کوشش کر سکتی ہے کہ ایک فلسفیانہ انداز میں قانونوں کو معلوم کرے اور ان کی علتوں کا پتا چلائے۔ اور وہ ان متکلم ماہرین قانون کے خلاف، جنھوں نے اس موضوع پر انتہائی ناانصافی کے ساتھ بحث کی ہے، زور و شور کے ساتھ برس پڑتا ہے۔ لوری مر کا یہ بیان ٹھیک ہے کہ اصلاح عیسائیت کی تحریک کے زمانے سے پروٹسٹنٹوں کو کیتھولکوں کے خلاف کچھ اتنے شدید تعصبات تھے کہ وہ ان کو اس امر کی بھی اجازت

[1] نیس کی فرانسیسی کتاب "جنگ کا قانون اور گروتیوس کے پیشرو" مطبوعہ ۱۸۸۳ء۔

نہیں دیتے کہ فرقۂ مخالف کے متعلق ناطرفداری کے ساتھ رائے قایم کرسکیں۔[1]
یہ بالکل طبیعی بات تھی کہ جن مباحث کی طرف گروتیوس نے اشارہ کیا ہے، ان کی قرون متوسط کے دوران میں انتہائی توجہ کے ساتھ وضاحت کی گئی ہو۔ قانون اور دینیات کی تعلیم اُس وقت بے انتہا عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ چنانچہ ہر لمحہ یہ اہم مسٔلہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا کہ جنگ کے زمانے میں ذمہ داری کس کی ہوتی ہے؟ اور اس مسٔلے کی بحث و تنقیح سے ناگزیر اسباب جنگ کے مسٔلے سے بھی بحث کی ضرورت پیش آتی۔ ایک اور چیز کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ قرون متوسط میں ذہین لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا ہوئی تھی۔ اور اس زمانے کے قابل لوگوں اور محنت پسند مولفوں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے نازک مسایل پر بڑی دقیقہ رس بحث کی ہے۔ اس زمانے کے جامعات نے بھی اہم کام انجام دیا ہے، کیونکہ وہاں اساتذہ ایک ناقابل یقین بہادری کے ساتھ درس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ نیز ہمیں یہ بات بھی نہیں بھلانی چاہیے کہ قرون متوسط کا تمام آخری حصہ علی الاعلان قانونی رجحان لیے ہوئے تھا اور اس کی پوری تاریخ کی تہ میں قانونی تصورات کام کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی چیز اس زمانے کی بنیادی قوت محرکہ تھی، جس طرح آج کل کے زمانے میں بنیادی قوت محرکہ اول تو قوت و طاقت ہے اور اس کے بعد دعایہ اور پرچار۔[2] یہ چیز اتنی صحیح ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ صرف ماہرین قانون ہی

---

[1] جمیس لوری مر کی انگریزی کتاب "قانون بین الممالک کے احکام" مطبوعہ ۱۸۸۳ء جلد (۱) صفحہ ۱۱۔

[2] اسٹبس کی انگریزی کتاب "قرون متوسط اور زمانۂ جدید کی تاریخ اور متعلق مضمونوں پر سترہ تقریریں" صفحہ (۲۲۳)

کسی ملک میں حکمرانی کے فرایض انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ فرانسیسی تالیف "فرڈیے کا خواب" کی کتاب اول کے آخر میں لکھا ہے کہ: "کسی بادشاہ کے لیے سب سے اہم امر اور قابل مطالعہ چیز یہی ہوسکتی ہے کہ اپنی رعایا پر عقلمند لوگوں کے مشورے سے اچھی طرح حکمرانی کرے۔ اس سے مراد میں خاص طور پر ماہرین قانون کو لیتا ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قانون مذہبی اور قانون روما کے ماہر ہوں نیز رسم و رواج، دستوروں اور شاہی قانونوں سے خوب واقف ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے مشوروں سے رعایا پر حکمرانی کی جانی چاہیے نہ کہ فلسفہ پڑھنے والوں کے مشورے سے۔ جن اصولوں کے مطابق رعایا پر حکمرانی کی جانی چاہیے وہ اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات کی کتابوں میں مل سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ عمومی طور پر یہ علم ضرور حاصل کرتے ہیں لیکن انہیں اس کا عملی تجربہ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس کو عمل میں لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں...... فلسفیوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ رعایا پر حکمرانی کے اصول کو صرف چاٹ جائیں اور اس کے استعمال اور عملی تجربے سے سروکار نہ رکھیں۔ اس کے برخلاف ماہرین قانون اس کا استعمال کرتے اور اس کا عملی تجربہ رکھتے ہیں۔"

قرون متوسط کے نظریے، جو قانون جنگ کے متعلق تھے، چار ماخذوں سے حاصل ہوئے تھے: کچھ تو رومی نظریے، دوسرے سینٹ آگسٹائن، تیسرے قانون مذہبی (اور اس سلسلے میں خاص کر گراتیان کی کتاب "احکام")، اور چوتھے اکوئناس کے سینٹ ٹامس کی کتاب "چوٹی کے مسایل"۔ مولفین کے ہاں اختلافات پیدا ہوتے رہے؛ بعض نے تو جدت بھرے خیالات بھی پیش کیے۔ چاہے وہ ہمیشہ ٹھیک نہ رہے ہوں۔ بہرحال بہ حیثیت مجموعی پوری عیسائی دنیا میں قریب قریب ایک ہی نظریہ کار فرما رہا۔ قانون مذہبی اور قانون روما کی تعلیم اور اطلاق اس غرض کے لیے بہترین آلۂ کار بن گیا کہ جنگ کے

منصفانہ یا غیر منصفانہ ہونے کے متعلق تصورات کا پرچار کیا جائے۔ بالکل یہی حال پرائسجت یا کفاروں کی عدالت کا تھا جہاں ہر لمحے غیر منصفانہ طور سے حاصل کیے ہوئے مال غنیمت اور ظالمانہ طور سے کی ہوئی زیادتیوں کا سوال اٹھا کرتا تھا۔

ان مولفوں کی رائیں دلچسپ ہیں۔ وہ اس بات کی مجسم شہادت ہیں کہ کس طرح خیالات میں ارتقاء عمل میں آیا اور کس طرح ایک مسلسل ترقی پائی جاتی رہی۔ ہم یہ بات نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں کہ اس سب کو ایک اہمیت حاصل ہے۔ رابرٹ فلنٹ نے کیا صحیح بات کہی ہے کہ مفکرین کے خیالات بھی اس طرح تاریخی واقعات ہیں جس طرح لڑائیاں اور فتوحات، یا سیاسی واقعات اور انقلابات[1]۔ انسانیت کی الجھنوں بھری ترقی میں یہ بیان کر دینا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ متعدد فیاضانہ خیالات اس سے زیادہ بلندیوں تک پرواز کرتے رہے ہیں جتنا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے۔ یہ معلوم کرنا مفید ہوگا کہ کسی چیز کی صحت معلوم کرتے وقت مقابلہ کرنے یا اس کا مطالعہ کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ماضی کی طرف رجوع کریں۔ اسی لیے لمحات اولین کے کارپردازوں کی خدمات کا اعتراف کرنا مقتضائے انصاف ہے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کمال وولی سلسلے کے راہب گراتیاں کی تالیف "احکام" نے قرون متوسطہ میں کتنی بڑی وقعت حاصل کر لی تھی حتیٰ کہ دانتے کو اس کے متعلق کہنا پڑا کہ "وہ اپنی تالیفوں کے باعث وہ ہر ایک قانون کے متعلق اتنا مفید ثابت ہوا تھا کہ اسے جنت میں جگہ دینی پڑتی ہے۔" اس کتاب "احکام" کے حصہ دوم کی تمثیل[۲۳] "....." میں جنگ کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے

---

[1] رابرٹ فلنٹ کی انگریزی کتاب "تاریخ فلسفہ تاریخ" جلد (۱) صفحہ ۳۔

اس فصل کا عنوان (لاطینی میں) "مسائل فوج و جنگ" ہے اور یہ فصل آٹھ مسائل پر منقسم ہے۔

پہلا مسئلہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ "کیا جنگ کرنا ایک گناہ ہے؟" اس کا جو جواب دیا گیا ہے وہ معقول ہے۔ اس سلسلے میں گراتیان نے انجیل کے احکام کا حوالہ دیا ہے جن میں ہر جگہ نرمی کی سفارش کی گئی ہے اور انتقام سے روکا گیا ہے۔ ان احکام کی بناء پر یہ یقین کرنا پڑتا، کہ ہتھیار کا استعمال مطلقاً ممنوع ہے؛ اگر پادریوں نے یہ نہ لکھا ہوتا (اور کلیسا کے طرز عمل نے یہ نہ بنایا ہوتا) کہ اعتدال کے جذبات دل میں رکھتے ہوئے بھی ان لوگوں کی سرکوبی کی جا سکتی ہے جو ناانصافیوں کے مرتکب ہوں تاکہ وہ آیندہ پھر انھیں ناانصافیوں کا ارتکاب نہ کریں۔ گویا اس مولف نے تسلیم کیا ہے کہ جنگ جائز ہو سکتی ہے لیکن اس شرط پر کہ وہ ناگزیر ہوگئی ہو۔ اور اس مولف کے مطابق جو شخص بھی قوت کا استعمال کرنا چاہے تو اسے لڑائی میں اعتدال سے کام لینا چاہیے۔ چنانچہ: "جنگ صرف ضرورت کی بناء پر ہو سکتی ہے..... وہ ایک حالت مخاصمت ہے جسے لالچ اور بے رحمی کے ذریعے سے آگے نہیں بڑھانا چاہیے، بلکہ صرف اس مقصد کے لیے کہ امن تک پہنچ سکیں..... جب تک تم جنگ کرتے رہو اس وقت تک تم پر امن [؟ پرسکون] رہو اور جب فتح حاصل ہو جائے تو اپنے حریفوں سے امن کے فوائد منوالو۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ پُر امن لوگ کیا ہی خوش قسمت ہیں کیونکہ انھیں کو خدا کے بچے کہا جائے گا۔ اگر انسانی امن جس سے دنیاوی سلامتی حاصل ہوتی ہے، اتنا میٹھا ہے تو خدائی امن جس سے ابدی سلامتی حاصل ہوگی کتنا نہ میٹھا ہوگا!..... اسی لیے جس دشمن کے خلاف ہم لڑیں اس کو صرف ضرورت پر موت کے گھاٹ اتارنا چاہیے۔ نہ یہ کہ ہمیں اس کی چاہت ہو.....

لیکن جس طرح جبر کا استعمال اس شخص کے خلاف کیا جاتا ہے جو مقابلے پر اتر آتا ہے اور لڑتا ہے، اسی طرح رحم، شکست خوردہ پر کھانا چاہیے، قیدی پر کھانا چاہیے، اس شخص پر کھانا چاہیے جس سے امن کے متعلق کوئی خطرہ نہ پایا جاتا ہو"۔ سینٹ آگسٹائن نے پوپ بونی فاس کے نام جو امر تحریر کیا تھا، اور جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کرچکے ہیں، اس کی یہاں پوری کی پوری نقل کردی گئی ہے۔

سینٹ آگسٹائن نے مانوی مذہب والوں کے خلاف جو رسالہ لکھا تھا، اسی سے اخذ کرکے گراتیان نے ان چیزوں کی فہرست دی ہے جن کا کرنا جنگ میں نامناسب ہے۔ اور وہ چیزیں یہ ہیں: نقصان پہنچانے کی خواہش، انتقام میں بے رحمی، ٹھنڈا نہ ہونے والا غصہ اور اجڈپن، مقابلے میں وحشیانہ پن، اوروں پر مسلط ہونے کا جذبہ اور اسی کی جیسی تمام دوسری زیادتیاں۔ چنانچہ اس نے ہپوئن کے مشہور پادری یعنی سینٹ آگسٹائن کے الفاظ کو یہاں بھی دہراتے ہوئے لکھا ہے کہ جنگ کرنا کوئی فعل ناجائز نہیں ہے لیکن لوٹ کھسوٹ کی خاطر جنگ کرنا ایک گناہ ہے۔

قرونِ متوسط کے ابتدائی زمانے میں دو قابل لحاظ اہمیت رکھنے والی شخصیتیں پیدا ہوئی تھیں، جنھوں نے دورِ متوسط کو قدیم تمدن سے جا ملایا تھا یعنی اٹلی کا بوئے تھیس اور اشبیلیہ کا سینٹ اسی ذور۔ بوئے تھیس جو شہر راقیقے کا ایک ممتاز شہری تھا، عیسائی دنیا کے لیے یونانی خیالات محفوظ کردیے۔ ارسطو اور اس کے شارحین کی کتابوں کے ترجمے کرکے اس نے ارسطو کے فلسفے کو روشناس کردیا۔ جب پاؤیا میں اسے قید کردیا گیا تو اس نے "فلسفیانہ تسلی" نامی کتاب تالیف کرکے افلاطونی خیالات بھی پھیلائے۔ دوسری طرف اشبیلیہ کے پادری اسی ذور نے کچھ کم خدمتیں نہیں انجام دیں۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب "فقہ اللغہ" میں پورے پرانے تمدن اور قرونِ متوسط کے ابتدائی زمانے کے تمدن کا

99

نچوڑ جمع کر دیا۔ اس کی تالیف مدرسوں کے نصاب میں شامل ہوگئی۔ حتیٰ کہ انگریز پادری "قابل احترام سینٹ ہیڈ" نے اس کا چربہ اڑایا تو دوسرے انگریز ماہر دینیات آلکوئن نے اس کو اپنے مطالعے میں رکھا اور رابان مور نے اس کی نقل کی۔[1]

سسرو کے مکالمات جو "جمہوریت" یا "دولت عامہ" کے متعلق ہیں اور جن کا بڑا حصہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں آنجیلو مائے کو دستیاب ہوگیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بارھویں صدی عیسوی ہی میں ایک مفقود تالیف بن گئے تھے، مگر اشبیلیہ کے اسی دور نے سسرو کا ایک اہم خیال اپنی تالیفوں میں محفوظ کر دیا ہے۔

چنانچہ اس نے اپنی کتاب "فقہ اللغہ" کے اٹھارھویں حصے میں جنگ سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ چار قسم کی جنگیں ہوتی ہیں: منصفانہ جنگ، غیر منصفانہ جنگ، کشوری جنگ اور ماورائے کشوری جنگ۔ اس آخرالذکر اصطلاح سے مراد وہ ایسی جنگ لیتا ہے جو ہم خاندان جنھڑوں میں ہو۔ چنانچہ اس نے لاطینی میں لکھا ہے کہ "جائز جنگ وہ ہے جو پیشگی اطلاع دے کر [اپنی] چیزوں کو واپس لینے یا دشمن کو دھکیلنے کے لیے کی جائے۔ ناجائز جنگ وہ ہے جو جائز وجہ سے نہیں بلکہ وحشت و بربریت [یا لوٹ گھسوٹ] کے لیے شروع کی جائے۔ اس کے متعلق سسرو نے اپنی کتاب "جمہوریت" میں لکھا ہے کہ: وہ جنگیں ناجائز ہیں جو بغیر کسی وجہ کے شروع کی جائیں۔ چنانچہ سوائے انتقام لینے یا دشمن کو ڈھکیلنے کے کسی اور امر کی خاطر جنگ کرنی جائز نہیں اور یہی چیز تھوڑے سے اضافے کے ساتھ تولیوس نے یوں بیان کی ہے کہ: کوئی جنگ اس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی

---

[1] بورے کی فرانسیسی کتاب "وزی گوتھوں کے عہد میں اشبیلیہ کا عیسائی مکتب خیال" صفحہ ۱۰۲۔

[2] اس نقطہ پر بحث آگے آتی ہے اور دو تعلیقات بھی آیندہ صفحے پر دیے گئے ہیں (مترجم)۔

جب تک کہ وہ [دشمن کو اِعذار و اِنذار یعنی] دھمکی دے کر اور اعلان جنگ کر کے [اپنی] چیزوں کی واپسی کے مقصد کے لیے نہ ہو[1]، پس وہ تمام

---

[1] یہ عبارت آنجیلومائے کے دریافت کردہ جھلی پر لکھے ہوئے مخطوطے میں نہیں ملتی۔ سیسیرو نے اپنی لاطینی کتاب "فرائض کے متعلق" میں بیان کیا ہے کہ جنگ کو جائز بنانے کی جتنی شرطیں تھیں انھیں رومیوں کے قانون فِتیالی (مجلس خارجہ) نے نہایت عمدگی سے مدون کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اس قانون سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جنگ اس وقت تک جائز نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے شروع کرنے سے پہلے ہرجے کے مطالبے کا تصفیہ نہ کرا دیا جائے۔ اور ابھی اس کا اعلان نہ ہوا ہو تو جب تک کہ ان لوگوں کو اطلاع نہ دیدی جائے جن کے خلاف جنگ کی جانے والی ہے۔"

"جمہوریت کے متعلق" نامی سیسیرو کی کتاب میں ایک عبارت تھی جو سینٹ آگسٹائن کی تالیف "خدا کا شہر" میں نقل ہوئی ہے۔ چنانچہ ہپّون کے اسقف سینٹ آگسٹائن نے بیان کیا ہے کہ "میں جانتا ہوں کہ "جمہوریت کے متعلق" نامی کتاب کے تیسرے حصے میں اس خیال کی تائید کی گئی ہے کہ کوئی عقلمند جمہوریت کبھی جنگ نہیں کرتی بجز اس کے کہ وہ ایک فریضہ ہو یا ذاتی سلامتی کے لیے ضروری ہو۔" (اصل لاطینی عبارت کے بھی جو یہاں نقل کی گئی ہے یہی معنے ہیں۔ مترجم) ——— ایک دوسری جگہ سیسیرو یہ بتانے کے لیے کہ سلطنت کی نجات سے وہ وہ کیا مراد لیتا ہے اور کس قسم کی نجات اس کے پیش نظر ہے، یوں خیال آرائی کرتا ہے: "تکلیفیں جن کا کند سے کند طبیعتوں کو بھی احساس ہوتا ہے، افلاس، جلا وطنی، قید اور آلام کو چھوڑ کر افراد رعایا تو فوری موت کو پسند کرنے لگتے ہیں لیکن مملکتوں کے لیے سب سے بڑی تکلیف تو وہی موت ہے جس کے پاس عامۂ افراد تکلیفوں سے بچنے کے لیے جا پناہ لیتے ہیں۔ حقیقت میں کسی مملکت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے تشکیل کی جائے۔ اسی لیے کسی جمہوریت کے لیے کوئی قدرتی فنا کا سوال نہیں ہے جس طرح کہ عام آدمی کے لیے موت نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ مطلوب بھی ہوتی ہے۔ کسی جمہوریت کا غائب ہو جانا، تباہ ہو جانا، اور فنا ہو جانا ایک چھوٹے پیمانے پر خود دنیا کا تباہ ہو جانا کہا جا سکتا ہے۔" بے شک مذکورۂ بالا خیالات میں ایک بلندی پائی جاتی ہے

جنگیں جو بے وجہ شروع کی جائیں وہ سسیرو کے مطابق ناجائز ہیں۔ اور سسیرو نے اس کے بعد ہی یہ بھی بیان کیا ہے کہ کسی جنگ کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا اگر وہ اعلان کیے بغیر کی گئی ہو اور اس کی اطلاع نہ دی گئی ہو اور اس کا منشار تلافی کی خواہش نہ ہو۔ سسیرو کے الفاظ "پیشگی اطلاع دے کر"[۱] میں اسی ڈور نے یہ بات مضمر پائی کہ جنگ کا اعلان کیا جانا ضروری ہے۔ گراتیان نے بھی یہ عبارت نقل کی ہے لیکن وہ مذکورہ بالا الفاظ کی جگہ "بذریعۂ حکم نامہ[۲]" کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس طور سے یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ با اقتدار شخص کے حکم سے جنگ کی جانی چاہیے۔ گراتیان نے سینٹ آگسٹائن کا یہ خیال بھی نقل کیا ہے کہ "جائز جنگوں کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ یہ وہ جنگیں ہیں جن کے ذریعے سے مضرتوں کا انتقام لیا جاتا ہے۔ مثلاً جب کسی صورت میں کسی قوم یا شہر کا ہتیاروں کے ساتھ اس وجہ سے پیچھا کیا جائے کہ اس نے اپنے افراد میں سے کسی کو برائی کے کرنے سے روکنے میں غفلت کی یا اس چیز کے واپس دلانے میں تساہل کیا جو ناجائز طور سے لے لی گئی تھی۔ لیکن وہ جنگ جو خدا کے حکم سے کی جائے، اس کے جواز میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ایسی جنگ میں کوئی بے انصافی نہیں ہوتی ہے۔ اور خدا خوب جانتا ہے کہ کس کو کیا سزا دی جانی چاہیے۔ کیونکہ وہ شخص جو فوجوں کی قیادت کرے، اور وہ جم غفیر جن پر فوجیں مشتمل ہوتی ہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ جیسا کہ قبل میں نے بیان کیا ہے۔ ایک رومی، اس "سدا آباد شہر" کے ایک باشندے سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

[۱] لاطینی لفظ: ہیرے دِک تو = پیشگی کہنا۔ لیکن اسی لفظ کے معنی حکم حاکم کے بھی ہیں گویا لفظ کی تحلیل کر کے پیشگی اطلاع مضمر مانی گئی ہے [مترجم]۔

[۲] لاطینی لفظ: "اے دِک تو" = کہنا، یعنی حکم حاکم — دیکھو تعلیق بالا گویا یہاں ابہام کو رفع کر دیا گیا ہے (مترجم)۔

ان کو بانیانِ جنگ کی جگہ ایک بلند تر مثیت کے نافذ کرنے والے سمجھنا زیادہ صحیح ہوگا۔"

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ "ان مولفوں کی تعداد کثیر ہے جنھوں نے جنگ کو جائز بنانے والی شرطوں کی تحقیق و تنقیح کی ہے۔

101

اب دو قسم کے رجحان پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک قسم ان مولفوں کی ہے جو جنگ کے زیادہ حامی نہ بھی ہوں تو کم سے کم اس کو روا قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایک اور قسم ان مولفوں کی ہے جو جنگ کے سخت مخالف ہیں۔ اور کسی طرح مانتے ہی نہیں۔

قرون متوسط میں ایک بڑی ذہین شخصیت سوسے کے ہنری کی گزری ہے، جو لاطینی کتاب "زرین خلاصہ" کا مولف اور آوستیا کا کارڈنل بشپ تھا۔ اس نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ جنگ کے متعلق ہمیشہ ہی یہ تصور ہوگا کہ وہ ناجائز اور قابل لعنت ہے اور یہ کہ اس کے جواز اور منصفانہ ہونے کا جو دعویٰ کرے اسے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ لیکن بعض دیگر مولف اس کے برخلاف جنگ کو ایک معمولی و عادی واقعہ خیال کرتے ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ژرول فیرتی نے اعلان کیا تھا کہ شبہے کی صورت میں ہر اس جنگ کو جائز ہی سمجھا جائے گا جس کا اعلان شہنشاہ یا پوپ یا ایسے حکمرانوں نے کیا ہو جو اپنے اوپر کسی اور سردار کو تسلیم نہیں کرتے۔ بلتازار دے آیالا کی تالیف ۱۵۸۲ء میں شایع ہوئی تھی۔ اس نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ کسی جنگ سے پورے حقوقِ جنگ حاصل ہو جانے کے لیے یہ کافی ہے کہ اسے ان اشخاص نے کیا ہو جن پر لفظ "دشمن" کی تعریف صادق آتی ہو اور جو جنگ کرنے کا اختیار رکھتے ہوں۔

اسپین کا ایک ڈومینیکی پادری سینٹ ریموند دے پاں آفور تے کو نویں گریگری (پوپ) نے اس غرض کے لیے مامور کیا تھا کہ اس نے ۱۲۳۴ء میں جو مذہبی احکام شایع کیے تھے ان کا مجموعہ تیار کرے۔ اس پادری نے ایک نہایت اہم بیان اندرونی آواز یعنے ضمیر کے متعلق

لکھا ہے۔

توبہ اور گناہ کی تلافی کے پیشکش کا تصور جب ارتقا پانے لگا تو رفتہ رفتہ یہ خیال کیا جانے لگا کہ جس پادری کے سامنے اعتراف گناہ کیا جاتا ہے، اسے ایک حقیقی اختیار سماعت ہوتا ہے، گویا کہ وہ حاکم عدالت ہے۔ ورنہ اس سے پہلے جب اعتراف گناہ کی نوعیت ایک خاص مذہبی فعل کی تھی، تو اس کی حیثیت محض رسمی تھی۔ تیرھویں صدی کے شروع میں اعتراف گناہ واجب قرار دیدیا گیا اور اعتراف قبول کرنے والے پادری کا کام صرف یہ تھا کہ اخلاقی معاملات سے تعلق رکھے۔

اس سے پہلے ہی فلیمش بری کے رابرٹ نامی ایک انگریز نے اس کی طرح ڈال دی تھی۔ ریمونددے پاں آفورتے، جو ایک پختہ کار ماہر قانون مذہبی تھا، اسی کی پیروی کرتا ہے۔ اور اس کے بعد متعدد مولف پیدا ہوئے جنھوں نے لاطینی میں "خلاصے" (یا چوٹی کے مسائل) نامی کتابیں لکھیں۔ گروتیوس نے اپنی نوجوانی میں ایک کتاب "مال غنیمت کے قانون پر یادداشت" نامی لکھی تھی۔ اس میں اس نے ان میں سے متعدد لوگوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ انھیں کتابوں میں بکثرت نظائر سے بحث کی گئی، انھیں میں نازک نازک امتیاز پیدا کیے گئے، اور انھیں میں ان وجوہ و اسباب کا بھی ذکر ہوا جن کو کسی نہ کسی حل کی تائید یا مخالفت کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے۔

ریمونددے پاں آفورتے نے قانون جنگ کی بحث بھی نظرانداز نہیں کی ہے۔ اور اس کی کتاب کے حصۂ دوم باب (۵) میں جو ڈاکوؤں اور لیٹروں کے متعلق ہے، وہ جنگ کے جواز کی شرطوں سے بحث کرتا ہے اور ان کو پانچ قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی اشخاص، اشیاء، اسباب، نیت اور بانی۔ شخص تو دنیادار ہونا چاہیے، مذہبی نہیں۔ اشیاء کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی ہوں جو چھین لی گئی تھیں اور وطن کی مدافعت کی جانی چاہیے۔ جنگ اس لیے ضروری ہو کہ اس کے ذریعے سے

امن قایم کیا جا سکے۔ رحم، انصاف اور اطاعت شعاری کے جذبات متقاتل کی نیت میں موجزن ہوں، نہ کہ نفرت اور لالچ۔ اور لڑائیوں کا حکم با اقتدار شخص کی طرف سے ملنا چاہیئے۔[1]

سوسے کا ہنری جو پہلے سسٹروں کا پھر امبرون کا اسقف بنا اور آخر میں اوستیا کا کارڈینل بشپ۔ اس نے جنگوں کی جو تقسیم کی تھی اس کی قرون متوسطہ کے بہت سے مولفوں نے پیروی کی ہے۔

اس نے جنگ کی سات قسمیں قرار دی ہیں :۔

(۱) رومی جنگ جو ایمان والوں اور غیر مذہب والوں میں ہوتی ہے اس ممتاز ماہر قانون مذہبی نے بیان کیا ہے کہ یہ جنگ جائز ہوتی ہے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ روما عیسائی مذہب کی مادر وطن ہے۔

(۲) قانونی جنگ جو حاکم عدالت کے حکم کے باعث ایمان والوں کے خلاف کی جاتی ہے۔ یہ جنگ بھی درست ہے۔

(۳) متکبرانہ جنگ وہ لڑائی ہے جو باغی اپنی حکومت سے کریں یہ جنگ ناجائز ہے۔

(۴) حلال جنگ وہ جائز جنگ ہے جو کسی حکمران کے حکم سے کی جائے۔

(۵) جسارت آمیز جنگ وہ ناجائز جنگ ہے جو ایمان والے اپنی جائز حکومت کے خلاف کریں۔

(۶) خود پسندانہ جنگ وہ ناجائز جنگ ہے جو ایمان والے محض اپنی خواہش کی بنا پر کرتے ہوں۔

(۷) ضروری جنگ وہ ہے جب ایمان والے اس وجہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ دشمن کے خلاف اپنے آپ کی مدافعت کریں۔

---

[1] ۔ اسپین کی عربی جامعات میں حدیث و فقہ کی کتابوں میں صدیوں یہ چیزیں پڑھائی جاتی رہیں۔ (مترجم)۔

تیرھویں صدی عیسوی میں ایک نہایت حیرت انگیز قانونی کتاب کی تالیف اسپین میں عمل میں آئی۔ یعنی [قسطیلہ کا] "سات ارکان" نامی مجموعۂ قوانین، جس کا ہم اوپر [صفحہ (10) میں] ذکر کر چکے ہیں اس میں ایک ہی ساتھ کلیسائی قانون کا بھی ذکر ہے، سیاسیات کا بھی قانونی مدنی یا کشوری کا بھی، ضابطے کا بھی، تعزیرات کا بھی [جو اغلب ہے کہ اسپین کی اسلامی کتب فقہ کا اثر ہو۔ مترجم] اور اس میں ان تمام امور کے متعلق مواد و احکام کی عظیم الشان کثرت ہے۔ قانونِ جنگ کی اس میں جو بحث ہے، وہ بڑی ترقی یافتہ ہے۔ اور اس طرح "سات ارکان" نامی مجموعہ، قانون بین الممالک کی تاریخ کی ایک قیمتی یادگار بن جاتا ہے۔ قرونِ متوسطہ کی اسپینی قانون سازی میں تیز گام اور قبل از وقت پختگی کا ایک نادر مظاہرہ اسے اوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اور یہ بات خاص کر "سات ارکان" پر صادق آتی ہے۔ اور قوموں کے قوانین کے مقابلے میں یہ مجموعہ کئی صدی آگے بڑھا ہوا نظر آتا ہے" اور بظاہر یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ قرونِ متوسطہ میں اسپین قانون سازی کے ملکے میں رومیوں کا وارث ہو گیا تھا۔ [یا عربوں کی شاگردی کا اثر تھا؟ مترجم]

"سات ارکان" نامی مجموعے کی تالیف سنہ ۱۲۵۶ء اور سنہ ۱۲۶۵ء کے درمیان ہوئی۔ بادشاہ سینٹ فردیناند نے تجویز کی تھی کہ ایک یکسانیت لیا ہوا مجموعۂ قوانین مرتب کرائے جس کے سات اجزا (یا ارکان) ہوں اور اس کا نام "سپتناریو" (ہفت گانہ) رکھا تھا۔ اگرچہ اس تجویز کی تکمیل سے پہلے موت نے اسے آلیا، لیکن اس کے بیٹے دسویں الفونسو نے، جو ال سابیو (یعنی عقلمند، اور زیادہ صحیح الفاظ میں "عالم") کے لقب سے مشہور ہے، اس خیال کو نہیں بھلایا۔ اور "سات ارکان" کے شروع میں اس لئے اپنے ممتاز پیشرو کے متعلق ایک اثر انداز اشارہ کروایا۔

یہ تالیف قانونِ مذہبی اور قانونِ روما پر مبنی تھی۔ اس نے

فوراً ہی قانونی حیثیت نہیں حاصل کی۔ خود بادشاہ کا یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ حکمرانوں اور رعایا کے لیے نظریات کی ایک [درسی] کتاب تالیف کرائے۔ پھر بھی اس کتاب کو اس میں دیر نہیں لگی کہ ایک بڑی وقعت حاصل کرلے۔ ۱۳۴۸ء میں جو مجلس قومی القلعہ میں منعقد ہوئی تھی، اس کی رضامندی سے گیارھویں الفونسو نے اس کا ایک حصہ اپنے مشہور "حکمنامے" کے بعد [بآخر میں] شایع کیا۔ اس آخر الذکر قانون کی ہنری دوم نے ۱۳۶۷ء کی مجلس میں توثیق کردی۔ جب فرونیاند اور ایزابیلا کی حکمرانی شروع ہوئی تو پھر "سات ارکان" کے سند ہونے سے کسی کو انکار نہ رہا۔

الفونسو کی اس تالیف کے مطابق، جنگ میں بھلائی بھی ہے برائی بھی۔ اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جنگ کی چار قسمیں ہیں: جائز جنگ، ناجائز جنگ، کشوری جنگ اور ماورائے کشوری جنگ۔ یاد رہے کہ الفونسو کی یہ تقسیم اشبیلیہ کے اِسی ڈور کی نقل ہے۔[1] جہاں تک جائز جنگ کا تعلق ہے، اس نے اس کے تین اسباب بیان کیے ہیں: اولاً مذہبی مفاد کے لیے، کہ اس کی ترقی ہو اور اس کے دشمنوں کی تباہی ہو۔ دوسرے بادشاہ کی مدافعت کے لیے تیسرے ملک کی آن و عزت اور بقا کے لیے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "یہ تحقیق کرلینا مفید ہے کہ جنگ جائز ہو۔ کیونکہ اگر وہ منصفانہ اور جائز ہو تو خدا کی تائید کا یقین ہوجاتا ہے۔ مزید برآں، مقاتلوں (لڑنے والے سپاہیوں) کی ہمت بڑھ جاتی ہے، دوست اپنی مدد پیش کرنے پر مائل ہوجاتے ہیں، اور یہ بھی کہ خود دشمن گھبرا جاتا ہے" پرانے زمانے کے لوگ ان خیالات کا اظہار پسند کرتے تھے۔ اور بوسے نے اپنی فرانسیسی تالیف "کتاب مقدس سے ماخوذ سیاسیات" میں نفیس الفاظ میں انھیں خیالات کا یوں اظہار کیا ہے کہ

[1] دیکھیے اوپر صفحہ 99 نیز ابن خلدون کے مماثل خیالات کے لیے نیچے صفحہ (108) مترجم۔

اگر وجہ اچھی رہی ہو تو اس سے جنگ میں اور فائدوں کے علاوہ ہمت اور اعتماد یہ دونوں بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ نا انصافی کے خلاف نفرت و حقارت سے قوت بڑھ جاتی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ زیادہ پختگی اور زیادہ بہادری سے لڑتے ہیں۔ بلکہ یہ تصور کرنے کا بھی موقع ہوتا ہے کہ خدا ساتھ ہے، کیونکہ اس معاملے میں انصاف ہے تو طبعاً وہ [خدا] اس کی حمایت کرتا ہے۔ جب کوئی بے ضرورت اور محض دل کی چاہت سے جنگ کرتا ہے تو یہ فائدہ جاتا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ واقعہ جس کے ذریعے سے خدا اپنے احکام اور اپنے نہایت مخفی اقتدارات سے فتح عطا کرتا ہے ـــــ وہ واقعہ چاہے کچھ ہی ہو آدمی اپنی طرف سے خود انصاف نہ کرے تو دوسری طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر مساوی قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔"

اکوئیناس کے سینٹ ٹامس نے اپنی کتاب "دینیات کے تمام چوٹی کے مسایل" ۱۲۶۳ء اور ۱۲۶۹ء کے مابین تالیف کی۔ وہ کوئی قانون داں شخص نہ تھا، لیکن قانونِ مذہبی کی آبیاری کرنے والوں پر اس کا اثر بے انتہا قابل لحاظ ہے۔

چنانچہ اس کی کتاب کے حصۂ دوم کی دوسری فصل کے چوتھے مسئلے کی پہلی بحث میں جنگ کے جواز سے بحث کی گئی ہے اور وہ کہتا ہے کہ جنگ کا اعلان اگر حکمت کی مدافعت اور مصلحت عامہ کے لیے ہوا ہو، اور یہ اعلان ملک کے نظم و نسق کے ذمہ دار کی طرف سے کیا جائے تو ایسی جنگ قابلِ گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ اچھی نیت سے کی گئی ہو۔ البتہ دوسری صورتوں میں جنگ نادرست ہوگی۔

جنگ کے جواز کے لیے اس نے تین شرطیں یوں بیان کی ہیں:۔

"(۱) حکمران کی اجازت، جس کے حکم سے کہ لوگ جنگ کر سکتے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی خانگی فرد کو جنگ کرنے کا حق نہیں کیونکہ ایسے شخص کو اپنے حق کی مدافعت کے لیے اپنے سے بالاتر افسر کے پاس انصاف کے لیے رجوع کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ اسی طرح خانگی فرد کے ہاتھ میں یہ چیز

نہیں کہ وہ لوگوں کا جتھا فراہم کر سکے جس کی جنگ میں ضرورت ہوتی ہے اس کے برخلاف مملکت کی نگرانی چونکہ حکمرانوں کے تفویض ہوتی ہے، اسی لیے ان کے کسی ماتحت شہر یا مملکت یا صوبے کی مدافعت انھیں سے متعلق ہوتی ہے۔

(۲) یہ ضروری ہے کہ جنگ کی کوئی منصفانہ وجہ ہو۔ یعنی جن پر حملہ کیا جاتا ہے وہ قصور کے ارتکاب کے باعث حملہ کیے جانے کے مستوجب ہو چکے ہوں۔ چنانچہ سینٹ آگسٹائن نے کہا ہے کہ: ان جنگوں کو منصفانہ کہنے کا رواج ہے جن میں کسی مضرت کا بدلہ لینا مقصود ہو مثلاً جب کوئی قوم یا شہر اس کے ایہوں میں سے کسی کے برے کام پر اس کو سزا دینی یا ناجائز طور سے چھین لی ہوئی چیز واپس کرنی نہ چاہے تو اس سے مواخذہ کرنا۔

(۳) جو لوگ لڑائی لڑتے (یا جنگ کرتے) ہوں ان کی نیت ٹھیک ہو۔ دوسرے الفاظ میں ان کی تجویز یہ ہو کہ بھلائی کریں یا برائی کو روکیں۔ اس کے متعلق اسی ماہر کو یہ کہنا پڑا ہے کہ خدا کے سچے بندے انھیں جنگوں کو جائز اور مقدس سمجھتے ہیں جو کسی لالچ یا بے رحمی کے لیے اختیار نہ کی گئی ہوں بلکہ وہ امن کی محبت میں کی جائیں اور ان کا مقصد شریروں کی تذلیل [؟ سرکوبی، مترجم] اور اچھوں کی تائید ہو۔ اسی لیے یہ ہوسکتا ہے کہ جنگ کا جائز طور سے اعلان ایک جائز مقصد سے ہوا ہو اور پھر بھی وہ اس بناء پر ناجائز ہو جائے کہ اس جنگ کرنے والوں کی نیت بگڑی ہوئی ہو۔ کیونکہ سینٹ آگسٹائن نے کہا ہے کہ: ضرر رسانی کی خواہش، بدلہ لینے میں بے رحمی، ایک نہ دبنے والا جوش غضب جسے کسی طرح بھی ٹھنڈا نہ کیا جاسکتا ہو حملے میں وحشت انگیزی، اوروں پر مسلط ہونے کا جذبہ اور اسی طرح کی تمام دوسری زیادتیاں اس لائق ہیں کہ ان کو کسی جنگ میں ملعون قرار دیا جائے۔"

اکوی ناس کے سینٹ ٹامس نے اس پر بھی اصرار کیا ہے کہ جو لوگ جائز جنگ کرتے ہیں ان کا مقصد امن ہوتا ہے اور وہ صرف اس "برے امن" کے مخالف ہوتے ہیں جس کے متعلق، کسی انجیل پرست کے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اس قسم کے امن کو اس زمین پر لانے کے لیے ہرگز تشریف نہیں لائے ہیں۔ وہ سینٹ آگسٹائن کا یہ خیال یاد دلاتا ہے کہ: لوگ امن کی خواہش اس لیے نہیں کرتے کہ اس کے ذریعے سے جنگ حاصل کریں بلکہ جنگ اس لیے کی جاتی ہے کہ امن حاصل ہو۔ وہ لکھتا ہے: "بنا بر آں لڑنے میں امن پسند رہو تاکہ جن لوگوں سے تم لڑتے ہو انھیں شکست دینے کے بعد تم انھیں ایک نفع بخش صلح پر آمادہ کر سکو۔"

جن لوگوں کے خیالات سے دیگر مولفین کو نئی نئی چیزیں سوجھیں ان میں ایک فرانسسکانی سلسلے کا راہب مونالدے بھی ہے۔ اس نے سنہ ۱۲۷۰ء سے پہلے پیش آنے والے جملہ نظائر کے متعلق ایک "خلاصہ" مرتب کیا جو قانون روما اور قانون مذہبی دونوں پر بیک وقت مبنی تھا۔ وہ جائز جنگ سے بحث کرتے ہوئے گراتیان کا حوالہ دیتا ہے۔ اس کی تالیف نے اہمیت اختیار کر لی اور اعتراف گناہ کرانے والے پادریوں کے لیے درسی کتاب کا کام دینے لگی۔

فرانس کے مشہور ماہرین قانون میں سے ایک آں ری بواش تھا۔ یہ چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں پاریس میں پروفیسر تھا۔ اس نے ایک لاطینی تالیف "احکام مذہبی کی، پانچ کتابوں میں شرح" لکھی جس میں اس نے سوسے کے نہری ہی کی تقسیم قبول کی ہے کہ جنگ کی سات قسمیں ہیں۔ بہر حال وہ امن کی تلقین کرتا ہے اور زبور کے یہ (لاطینی) الفاظ دہراتا ہے، "نیک لوگ زمین کے وارث بنیں گے اور کثیر امن سے مستفید ہوں گے۔" نیز انجیل کے یہ (لاطینی) الفاظ کہ "وہ مبارک ہیں امن پسند اور یہی خدا کے

بیٹے کہلائیں گے"۔[1]

اسی صدی کے نصف دوم میں ایک اور مولف نے "جنگوں کا جھنڈا" نامی کتاب تالیف کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے مولف کا نام شہامت باز (یعنی نائٹ) ژو فرائے ڈلا تور لاندری تھا۔ جنگ کے اسباب سے اس میں کم بحث ہے۔ اس تالیف کا بڑا حصہ بعض بیکار مباحث پر مشتمل ہے، جن میں حکمرانوں کے فرائض اور شہامت بازوں کے خصائص سے بحث کی گئی ہے۔[2]

قانون روما کے شارحین نے بھی اس موضوع سے بحث کی ہے۔ چنانچہ ایک حاشیے میں لکھا ہے کہ "بذات خود تو قانون بین الممالک غیر منصفانہ ہے کیونکہ اس سے خلاف انصاف چیزیں پیدا ہوتی ہیں لیکن وہ اس وقت منصفانہ بن جاتا ہے جب اس سے پیدا ہونے والی جنگوں کا اعلان شہنشاہ اور رومی قوم نے کیا ہو۔" آزون نے لکھا ہے کہ صرف ایسی ہی جنگیں قانون بین الممالک کے تحت روا ہو سکتی ہیں، جن کا اعلان یا تو شہنشاہ نے کیا ہو یا رومی قوم نے۔ بالدے اور آن جیلو (جو اطالوی شہر پیروسہ کا باشندہ تھا) یہ بیان کرتے ہیں کہ قانون بین الممالک کا آغاز نسل انسانی کے ساتھ ساتھ نہیں ہو گیا بلکہ انسانی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی ہوئی، اور یہ کہ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگوں کا آغاز اولین انسانوں کے ساتھ ساتھ نہیں ہو گیا، بلکہ وہ اس وقت شروع ہوئیں جب انسان علحدہ علحدہ ملکوں میں مستقل طور سے بس گئے۔ اور ان جنگوں کا منشاء یہ ہوتا تھا کہ اپنی مقبوضہ اراضی کی مدافعت کی جائے۔ بالدے نے تین قسم کی جنگوں کو تسلیم کیا ہے:

---

[1] ہنری کس بواش کی لاطینی تالیف "احکام مذہبی کی پانچ کتابوں میں شرح" مطبوعہ وینیس صفحہ ۱۸۵)۔

[2] فرانسیسی کتاب "بیوے اِی کے ژاں کا نو عمر بچہ" دیباچہ از قلم کاحی نافر" صفحہ ۲۹۸)۔

اقدامی، مدافعتی، اور بغرض بازیابی [یہی اصطلاحیں لاطینی میں بھی دی گئی ہیں ــــ مترجم] اور اس نے ان طریقوں سے بحث کی ہے جن کی وجہ سے جنگ ناجائز ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے پانچ چیزیں تسلیم کی ہیں۔ اور اس بارے میں واقعۃً وہ پاں آفورٹ کے ریمونڈ کو سند بناتا ہے اور اسی کی طرح (لاطینی میں) یہ پانچ شرطیں ضروری قرار دیتا ہے: اشخاص، اشیاء، اسباب، نیت اور اجازت دہندۂ جنگ۔ جو شخص جنگ کرتا ہے وہ جنگ کرنے کی قوت رکھتا ہو؛ جس چیز کے باعث جنگ کی جاتی ہے وہ مبنی بر انصاف ہو؛ جنگ ناگزیر ہو گئی ہو، یہ نہیں کہ اس کی چاہت ہو؛ نیت یہ نہ ہو کہ بدلہ لیا جائے؛ اور آخری شرط یہ کہ جو حکمران جنگ کا اعلان کرتا ہے اسے اس اعلان کا حق ہو۔

لیکن قانون روما کے ماہرین کی اکثریت اکوی ناس کے سینٹ ٹامس کی پیروی کرتی ہے اور جائز جنگ کی شرطوں کو تین عنوانوں میں تقسیم کرتی ہے: اشخاص، اسباب، اور نیت۔ لنانو (وانغ آلی)، کاڑان (سیجنہ) بھی بالدے کا ہمعصر تھا۔ اس نے جنگ کے متعلق عجیب عجیب خیالات ظاہر کیے ہیں۔ وہ نہ صرف قانون مذہبی و قانون روما سے دلچسپی رکھتا تھا بلکہ ساتھ ہی علم نجوم کا بھی اسے شوق تھا۔ اسی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے اس کے خیالات کا کیا باعث تھا۔ جنگ کی اس نے لاطینی میں ایک نہایت عام تعریف کی ہے کہ "جنگ ایک جھگڑا ہے جس کی بنیاد فساد پر قایم ہوتی ہے۔ اور وہ انسان کی اس چاہت کے باعث ہوتا ہے کہ فساد کا خاتمہ کر دیا جائے۔" جنگ یا تو روحانی جنگ ہوتی ہے یا جسمانی جنگ۔ روحانی جنگ یا تو آسمانی ہوتی ہے یا انسانی۔ اور جسمانی جنگ یا تو عالمگیر ہوتی ہے یا مخصوص۔ روحانی جنگ کی آسمانی قسم وہ ہے جس میں فرشتے خدا سے بغاوت کرتے ہیں۔ اور روحانی جنگ کی قسم انسانی وہ ہے جب انسان اپنے ان جذبات و خواہشات کے

خلاف، جن کی اصل شیطانی ہوتی ہے، کشمکش کرتا ہے۔ روحانی جنگ کے مماثل جسمانی جنگ ہے کیونکہ ہر جسمانی فعل کا باعث کوئی نہ کوئی آسمانی عنصر ہوتا ہے۔ اور اسی بناء پر جنگ معنوی طور سے ایک ناپسندیدگی سمجھی جا سکتی ہے۔ اس ناپسندیدگی کی بنیاد ستاروں میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، لِناؔنو کا ژاں جو علم نجوم کا دھنی تھا اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس چیز کو ثابت بھی کر سکتا ہے۔ اس کا محبوب نظریہ یہ تھا کہ جنگ کے بغیر دنیا پنپ ہی نہیں سکتی۔ وہ اس نظریے کو صاف صاف اور مکمل طور سے تو قبول نہیں کرتا لیکن یہ بیان کرتا ہے کہ اس کے قبول کرنے میں کوئی گناہ نظر نہیں آتا۔

وہ ہر انسان کے معاملات میں ستاروں کا اثر پایا جانا بیان کرتا ہے اور یہی چیز اسے حکومتوں میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس نے بیان کیا ہے کہ جنگ کے ذریعے سے اس ناپسندیدگی کا جو اس طرح پیدا ہوتی ہے، علاج کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور جنگ اپنی یہ حیثیت لیے ہوئے خدا کے پاس سے آتی ہے۔ اور ہر وہ صلاحیت جو بھلائی کی طرف لے جاتی ہے، خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ لِناؔنو کے ژاں نے بیان کیا ہے کہ "حقیقت میں جائز جنگ کے پیش نظر بھلائی ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد پورے عالم کا امن اور آرام ہوتا ہے۔ اور جب خدا اس کی اجازت دیتا ہے تو گویا وہ ایک طبیب کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ خدا چونکہ دنیا کا محافظ ہے، اس لیے وہی جنگ کا حکم دیتا ہے تاکہ جرایم اور افعال ناجائز کا قلع قمع ہو جائے۔ خدا چونکہ خالق ہے، اس لیے خلقت کے لیے زمین پر وہ اجرام فلکی کے توسط سے اپنا منشار روبہ عمل لاتا ہے۔ اور مختلف اجرام فلکی کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔"[1]

---

[1] لِناؔنو کے ژاں کی لاطینی تالیف "رسالۂ جنگ" رسایل قانون عمومی، جلد ۱۶ ورق (۳۷۱)۔

یہ چیز قابل ذکر ہے کہ عدالتی علم نجوم کی آبیاری خالدیہ اور مصر کے پجاری نیز یونانی اور رومی کرتے رہے۔ اور یہ علم قرون متوسطہ میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جب ریاضی داں پیدا ہوئے تو ارسطو کے خیالات کو تقویت حاصل ہوئی۔ اور یہ بیان کیا جانے لگا کہ تاروں کو محرک اول سے حرکت حاصل ہوئی تھی اور اسی حرکت کو وہ باقی خلقت تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسی طرح سے وہ خدا اور مخلوقات سفلی کے مابین واسطے کا کام دیتے ہیں[1]۔ شہنشاہ دوسرے فریڈرک کو نجومیوں کی پیشین گوئیوں پر اعتقاد تھا اور وہی اُسے گھیرے رہتے تھے۔ بعد میں تو متعدد بادشاہوں اور حکمرانوں نے علم نجوم سے سیاسیات میں مدد لینی شروع کی۔ روما تک اس عمومی احاطے سے باہر نہ رہ سکا اور پاری ڈگراسس نے جو کلیسائے پاپائی کا افسر مراسم تھا، اپنی لاطینی کتاب "روز نامچے" میں بتایا ہے کہ پوپ دوسرے یولیوس نے بظاہر نجومیوں کی بیان کردہ چیزوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی اس فضول علم کی تائید نہیں کی لیکن اس نے ان عام اعتقادات کی تردید بھی نہیں کی جو اس علم کے متعلق مانے جاتے تھے۔

اپنی نوبت پر چودھویں صدی عیسوی میں ایک زبردست عرب مولف پیدا ہوتا ہے جس کے متعلق رابرٹ فلنٹ کو کہنا پڑا ہے کہ نظریۂ تاریخ کے ماہر کی حیثیت سے ڈیکو کے قبل کسی زمانے میں بھی اور کسی ملک میں بھی اس کا کوئی عدیل و مماثل نہیں پیدا ہوا یعنی ابن خلدون۔ اس نے اپنی تاریخ کے مشہور مقدمے میں اسباب جنگ سے متعلق بھی اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں[2]۔

---

[1] ۔ شارل ژوردین کی فرانسیسی کتاب "قرون متوسطہ کی تاریخی اور فلسفیانہ سیر" صفحہ (۵۶۱)۔

[2] ۔ رابرٹ فلنٹ کی انگریزی کتاب "تاریخ فلسفۂ تاریخ" جلد (۱) صفحہ (۸۶)۔

ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ "جنگ اور دیگر اقسام کی جدال وقتال فطرت میں اسی وقت سے موجود ہیں جب سے کہ خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ اس کا باعث انتقام کی ایک خواہش ہے جو چند انسانوں کو دوسرے کے خلاف ہوتی ہے .... جنگ انسان کے لیے ایک طبعی چیز ہے۔ اس سے کوئی قوم اور کوئی نسل خالی نہیں۔ اس انتقام کا سبب کبھی تو غیرت و رقابت ہوتی ہے، کبھی زبردستی و زیادتی، کبھی خدا اور خدا کے دین کی حمایت کا جذبہ، اور کبھی ملک کی حمایت اور وہاں امن و امان قایم کرنے کی کوشش۔ ان میں سے پہلی قسم کی جنگ اکثر ہمسایہ قبایل اور ہمسر خاندانوں میں ہوتی ہے۔ دوسری محض زیادتی اور ظلم ہے اور اکثر وحشی صحرا نشین قوموں میں ہوتی ہے..... تیسری وہ ہے جسے شریعت میں جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ اور چوتھی وہ سرکاری جنگ ہے جو باغیوں اور اطاعت شکنوں سے کی جاتی ہے۔ ان چار قسموں میں سے پہلی دو زبردستی اور زیادتی پر مشتمل ہوتی ہیں اور آخری دو حقیقی جہاد اور منصفانہ"[۱]۔

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اونورے بونے نے جو شلونے کی خانقاہ کا صدر تھا، چھٹے شارل کے نام اپنی فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" معنون کی۔ مولف نے اپنی کتاب کے اس عجیب نام کی یوں توضیح کی ہے کہ "اگر میری کتاب کے نام سے تم کو یہ خیال گزر سکتا ہے کہ میں ایک رنج و الم کے درخت کے سایے میں ہوں، تو تم خود یہ دیکھ لوگے کہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مقدس کلیسا جس عظیم الشان

[۱] فرانسیسی کتاب "پاریس کے کتب خانۂ قومی اور دیگر کتب خانوں کے مخطوطات کے حالات اور اقتباسات" شایع کردۂ مجلس علمی فرانس، جلد (۲۰) حصۂ اول، صفحہ ۵۷۔

[یہاں مولف نے ایک فرانسیسی کتاب سے یہ اقتباس نقل کیا ہے۔ ہم نے اصل عربی سے (دیکھیے باب سوم فصل ۳۸) ترجمہ کیا اور بعض فروگذاشتوں کا ازالہ بھی۔ مترجم]

مصیبت کے دور سے گزر رہا ہے اس کے باعث کسی کو اطمینان نہیں ہو سکتا...... اس کے بعد تم اس عظیم الشان اختلاف کو بھی دیکھ لوگے جو آج کل عیسائی بادشاہوں اور حکمرانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد تم اس بہت بڑی تکلیف اور فساد کو بھی دیکھ لوگے جو مختلف فرقوں میں پایا جاتا ہے پس [مصائب کے] اس [شاخ در شاخ] درخت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی کتاب کو [جس کا نام جنگوں کا درخت ہے] چار حصوں میں مرتب کرتا ہوں۔"

بونے کی تالیف حقیقت میں کلیسا کی ان تکلیفوں ہی کے متعلق ہے جو حضرت مسیح کی آمد سے پہلے اور اس کے بعد پیش آئیں۔ اسی طرح اس میں "چار سلطنتوں" یعنے بابل، قرطاجنہ، مقدونیہ اور روما کی تباہی اور مصیبتوں کا نیز "عام" اور "خاص" جنگوں کا بھی ذکر ہے۔ کتاب کے آخری دو حصے قانون جنگ کی ایک اچھی خاصی کتاب پر مشتمل ہیں اور ہمارے اس علم کی انتہائی قیمتی یادگاروں میں سے ایک ہے۔ اولورے بونے بڑے بڑے شارحوں کا ہمعصر تھا۔ اسی لیے کتاب "شجرۂ حروب" اطالوی اساتذہ کی تحریروں کے نقلی ترجموں کے اقتباسات سے بھری ہوئی ہے۔ اب جنگ کے فطری اسباب کے متعلق ہم اس کی معصوم خیال آرائیوں کا جو خلاصہ بیان کرنے والے ہیں وہ یا تو لِنانو کے آثار سے ماخوذ ہے یا کم از کم ایک ایسے مولف سے جس کے دونوں ہی مشترکہ طور پر خوشہ چین ہوں ـــــ کیونکہ قرون متوسطہ کے مولف بغیر کسی شرم و حیا کے دوسروں کے افکار ذہنی کی لوٹ مار کر لیا کرتے تھے اور وہ اسے اصطلاحی طور سے "مچھلیوں کا شکار کرنا" یا "اسباب باندھنا" کہتے تھے:۔

"اساتذۂ قانون کے مطابق جنگ صرف ایک فتنہ و فساد یا مناقشہ ہے، جو انسان کی خواہش پر ناگوار چیزوں کے لیے نازل ہوتا ہے تاکہ فریق ثانی کو مصالحت اور معقولیت کی طرف واپس

لایا جائے۔" اس کے سوا کوئی اور چیز ممکن نہیں کہ دنیا امن ہی کی حالت میں رہ سکے۔ "ایک ناممکن چیز ہے کہ آسمان آرام لیتا رہے یعنی وہ ان حالات پر کوئی حرکت نہ کرے۔ کیونکہ آسمان مشرق سے مغرب کی طرف جو مسلسل گھومتا رہتا ہے، وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آسمان خود حرکت کرتا ہے۔ اور یہ کام وہ ہر روز کرتا رہتا ہے۔ اجسام ارضی آسمان ہی کی حرکت کے مطابق متحرک ہوتے ہیں۔ اس سے آگے چلو۔ اجسام ارضی اصل میں اجرام فلکی ہی کی حکمرانی میں ہیں، جیسا کہ فلاسفہ بیان کرتے ہیں لیکن یہ صاف بات ہے کہ اجرام فلکی ہی سے اشیائے ارضی کو ان کی ناپسندیدہ طبیعت اور اختلاف احوال حاصل ہوتا ہے۔"

اونورے بونے اس خیال کو اور ترقی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "ایسے متعدد شہر ہیں جو اپنے آغاز ہی سے ایک دوسرے کے گرویدہ ہوتے ہیں حالانکہ اس محبت کے حصول کے لیے اپنے آغاز سے کبھی ایک نے دوسرے کی نہ تو کوئی خدمت کی ہے اور نہ ایسا کام جس سے محبت پیدا ہوسکتی ہو۔ اس کے بر خلاف تمھیں ایسے بھی شہر ملیں گے جنھوں نے اپنے آغاز سے کبھی ایک دوسرے کی برائی نہیں کی لیکن پھر بھی ان میں ہمیشہ نفرت ہی پائی جائے گی۔"

ایک عجیب چیز سمجھ کر ہم نے اس عبارت کو نقل کر دیا۔ البتہ یہ بیان کرنا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ایک اور عبارت میں اونورے بونے حق حکمرانی کے آغاز کی حقیقت بیان کرتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ سوال پیش کرتا ہے کہ "اختیار ساعت اور آقائی" کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ اس کا وہ جواب دیتا ہے کہ: "احکام مذہبی کے مطابق میں تجھ سے کہتا ہوں کہ وہ خدا کے حکم سے پیدا ہوتی ہے..... لیکن اگر کوئی یہ حجت کرے کہ آغاز عالم پر تو خدا نے انسان کو یہ

لہ۔ اونورے بونے کی فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" حصہ سوم باب دوم

حکم نہیں دیا تھا کہ وہ دوسروں پر آقائی جتائے' ــــ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ حجت صحیح ہوگی۔ لیکن خدا نے انسانوں کو عقل' احساس اور تمیز یا صوابدید کی قوت عطا کی تاکہ وہ معقولیت کے ساتھ اور مناسب طور سے زندگی گزار سکیں۔ کیونکہ ان تمام چیزوں میں جن کے اجزاء و اعضاء ہوتے ہیں' ہمیشہ ایک صدر یا سردار کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں کوئی سردار نہ رہے تو یقیناً وہاں حسن انتظام مفقود رہے گا۔ ہر عادلانہ اور حقیقی [؟ حق پسندانہ] اختیار سماعت خدا کی طرف سے پیدا ہوتا اور لوگوں کے انتخاب سے آتا ہے۔"

کرستین ڈپیزاں بہت سی چیزیں اونورے بونے سے اخذ کرتی ہے۔ اس کی فرانسیسی تالیت "ہتیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" کا ایک حصہ تو ابیج کا حال ہے' لیکن دوسرا حصہ یا تو فرؤں تیں سے ماخوذ ہے یا فے ژیس سے۔ اور ایک اور حصہ ایک جیتے جاگتے اور دلچسپ مکالمے پر مشتمل ہے جس میں کرستین ڈپیزاں اور اونورے۔بونے جنگ کے متعلق مختلف مسایل پر بحث کرتے ہیں۔ فرؤں تیں نے شہنشاہ دیوکلے سیاں کے زمانے میں "جنگی چالیں" نامی جو کتاب تالیف کی اور فے ژیس نے شہنشاہ فالنتی نیاں کے زمانے میں "فوجی ادارات" کے نام سے جو تصنیف لکھی وہ فن حربیات کے لیے ایسی یادگاریں بن گئیں جن کو ہمیشہ دیکھا جاتا اور جن کا احترام کیا جاتا تھا۔

"ہتیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" کے حصۂ اول کا چوتھا باب بونورے کا پورا اس مسئلے کی بحث کے لیے وقف ہے کہ "وہ کونسی تحریکیں ہیں کہ جن سے ہی خاص کر جنگیں اور لڑائیاں پھوٹ پڑتی ہیں"۔ چنانچہ کرستین کہتی ہے کہ "اس چیز کے متعلق اچھے غور کے بعد مجھے یہ نظر آتا ہے کہ عام طور پر ایسی پانچ بنیادی تحریکیں ہیں جن پر اسباب جنگ مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں سے

تین تو حقوق کے متعلق ہیں اور باقی خواہش کے متعلق"[1]

قانونی اسباب یہ ہیں :—

(۱) حق اور انصاف کی تائید۔

(۲) جو برے لوگ ملک، علاقے اور قوم کو روندنا، تکلیف دینا اور ان پر ظلم کرنا چاہتے ہیں، ان سے مقابلہ۔

111

(۳) کسی علاقے، کسی جاگیر یا کسی اور چیز کو جسے غیر منصفانہ طور سے چھین لیا اور غصب کرلیا گیا ہو، اور جو حکمران کی ہو یا اس ملک کے اختیار سماعت میں رہی ہو یا اس کی رعایا کی ہو، تو اس کو واپس لینا۔

---

[1] ۔ یہاں ہم نے بروسیل کے کتب خانۂ شاہی کے مخطوطہ نشان (۹۰۱-۱) کے حوالے سے یہ چیزیں نقل کی ہیں۔ ۱۴۸۸ء میں ویرار نے پاریس میں جو فرانسیسی کتاب شایع کی اس کا نام "فن شہامت تے ژیس کی رائے کے مطابق" تھا اور اسی کے آخر میں "ہتھیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" تھی۔ حقیقت میں یہ کتاب کرستین ڈپیزان کی ہے اور جہاں کہیں کتاب میں کرستین نے اپنے متعلق مونث ضمیریں اور صیغے استعمال کیے تھے ان سب کو ثے رار نے مذکر صیغے بنا دیا ہے اور بجائے عورت کے ایک مرد گفتگو کرتا ہے۔ ثے رار نے چند مخطوطوں کے مطابق اپنا متن مرتب کیا ہے لیکن بروسیل کے کتب خانۂ شاہی میں ایک مخطوطہ ہے جس کا نام "فن جنگ" ہے جو کرستین کی لکھی ہوئی اصل تالیف ہی ہے، بجز ان ترمیموں کے جو ثے رار نے کی ہیں۔ اس مخطوطے کا نمبر (۱۰۲۰۵) ہے۔

مولفین میں خاصے طویل عرصے تک اس بات کے متعلق جھگڑا رہا کہ آیا "ہتھیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" کرستین ڈپیزان ہی کی تالیف ہے۔ لیکن بلند مرتبت ناشر ولیم کاکس ٹن کو ذرا بھی دھوکہ نہیں ہوا۔ چنانچہ ۱۴۸۹ء میں اس نے اس کے آخر میں جو سطریں انگریزی میں لکھی تھیں وہ یہ تھیں "یہاں پر وہ کتاب ختم ہوتی ہے جو پیزا کی خرستین نے تے جیس کی لاطینی کتاب "متعلق بہ امور فوجی" اور فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" سے اخذ کی تھی"۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ فرانسیسی مخطوطہ اس کو ساتویں ہنری نے سپرد کر کے چاہا تھا کہ اس کو ترجمہ کر کے چھاپا جائے" تاکہ جو

جو اسباب خواہشات پر مبنی ہیں وہ یہ ہیں :۔
(۱) کسی مضرت کا جو دوسرے سے پہنچی ہو انتقام لینا۔
(۲) اجنبی علاقوں اور ملکوں کو فتح یا حاصل کرنا۔
قانونی اسباب میں سے (۱) پر بے انتہا احتیاط کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور کرسٹین اس کی تین ذیلی قسمیں بیان کرتی ہے :۔
(۱) کلیسا اور اس کے جائداد کی حمایت ــــ یہ ہر عیسائی پر واجب ہے۔
(۲) کسی ماتحت حکمران کی مدد جب کہ وہ مدد کا طلبگار ہو اور اسے جائز جھگڑا پیش آیا ہو اور حکمران نے اس جھگڑے کی مسالمانہ یکسوئی کی کوشش بھی کر دیکھی ہو۔
(۳) وہ مدد جو کسی جاگیردار یا کسی اور "اپنے دوست" یا کسی ملک کو دی جائے بشرطیکہ جھگڑا حق بجانب ہو۔
یہ چیز قابل ذکر ہے کہ کرسٹین ان شرطوں کے متعلق یہ نہیں کہتی کہ حکمران ہی تنہا ان کی جانچ کر سکتا ہے بلکہ وہ یہ رائے دیتی ہے کہ حکمران کو چاہیے کہ "عقلمندوں" سے مشورہ کرے۔ جنگ کے متعلق وہ کہتی ہے کہ وہ حکمران عقلمندوں کی مجلس شورائے اعظم اپنی پارلیمان میں طلب کرے گا اور اگر وہ مجلس کسی کی ماتحت ہے تو اپنے مقتدر اعلیٰ کی پارلیمان میں۔ اور وہ نہ صرف اپنے ملک والوں کو جمع کرے گا بلکہ جانبداری کے ہر شبہے سے باہر ہونے کے لیے وہ بیرون ملک کے بھی ایسے عقلمندوں کو جمع کرے گا جن کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ کسی فریق کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ ان عقلاء میں بڑائے جاگیرداروں کو بھی بلایا جائے، ماہرین قانون کو بھی اور دوسروں کو بھی۔ اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ شرفا سپہ گری کا پیشہ اختیار کریں وہ یہ بھی جان لیں کہ انھیں جنگ میں کس طرح برتاؤ کرنا چاہیے۔"

جو لوگ حاضر ہوں ان کے سامنے ہر چیز صحیح صحیح طور سے اور بغیر رنگ آمیزی کے خود پیش کرے گا یا پیش کرائے گا" اس کی بعض نظیریں بھی ہیں۔ کالے کا معاہدہ ۲۴ر اکتوبر سنہ ۱۳۶۰ء کو ہوا تھا۔ اس کی رو سے بادشاہ ژاں نے تیسرے ایڈورڈ کو پوں تیو، پوانتو اور گوی ئین کے علاقے سپرد کردیے تھے، لیکن ان علاقوں کا اقتدار اعلیٰ اپنے لیے باقی رکھا تھا۔ کم از کم اس بارے میں فرانسیسی تعبیر یہی تھی۔ جب پانچواں شارل تخت نشین ہوا تو اس نے ایک ایسی تدبیر شروع کی جس کے ذریعے سے یہ سپرد کردہ علاقے اس کو واپس مل جائیں بغیر اس کے کہ قانون کی کوئی خلاف ورزی ہو، کم از کم ظاہرداری کی حد تک۔ گوی ئین کے متعدد جاگیرداروں نے اپنی شکایتیں پیش کیں اور فرانس کے بادشاہ سے اس بات کی اجازت مانگی کہ عدالت امراء میں ان ناانصافیوں کے خلاف، جن کا ارتکاب ہوا تھا، استغاثہ پیش کریں۔ بادشاہ نے اپنی مجلس شوریٰ کئی بار منعقد کی اور چاہا کہ بولونیا، موں پیلے یے، تولوز اور اورلیاں کی جامعات اور روما کی متعدد عالم شخصیتوں کی رائے حاصل کرے۔ جب ان کے جواب سے اس کو اس بات میں کوئی شک نہ رہا کہ اس کا دعویٰ حق بجانب ہے تو اس نے حکمران ویلز کے نام تاریخ پیشی کے مقرر کرنے کی اطلاعیں بھیجیں۔ پھر پانچویں شارل نے ملک کے تینوں قسم کے نمائندوں سے مشورہ کیا اور آخر میں عدالت امراء نے ایک فیصلہ صادر کیا جس کی رو سے گوی ئین اور دیگر تمام علاقے جو فرانس میں شاہ انگلستان کے قبضے میں تھے، پانچویں شارل کے حق میں ضبط کرلیے گئے اور اس کی مملکت میں ضم کردیے گئے تھے۔ ۱۴ر مئی سنہ ۱۳۷۰ء کو بادشاہ کا جو مہری فرمان نکلا اس میں اس فیصلے کی توثیق کی گئی۔

سنہ ۱۴۱۳ء اور سنہ ۱۴۲۰ء کے مابین آرنولد گائیل ہوفن نے گروے نن دیل کی خانقاہ میں جو بروسیل کے قریب ہے ایک لاطینی کتاب لکھی جس کا نام "ضمیر کا آئینہ موسوم بہ گنوتو سولی توس" تھا۔ یہ "گنوتو سوئی توس"

112

حقیقت میں یونانی محاورہ تھا یعنی "تو خود اپنے آپ کو پہچان"۔ آرنولد اصل میں رُوتر دام کا باشندہ تھا۔ اس نے قانون مذہبی کی تعلیم اٹلی میں گاس پار کالد رینی اور وزا بار لآ جیسے اساتذہ سے پائی تھی۔ پھر یہ سینٹ آگستائن کے اگیانن یعنی) عہدہ دار پادریوں کے حلقے میں داخل ہوگیا۔ اس کی تالیف کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ بہرحال یہ بیان کرنا چاہیے کہ "قتل نہ کرو" کے متعلق احکام بیان کرتے وقت اس مولف نے جنگ کی وہ ہفت گانہ تقسیم نقل کردی ہے جو سوسے کے ہنری کے سلسلے میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ وہ یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ مولفین کی رائے میں منصفانہ جنگ میں خارج کو کوئی چیز واپس دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔[1]

ایک دلچسپ کتاب "ژاں تی بر ژو جاگیردار بُوت، مارتیں بورین اور ماسٹر ریوئے نے بیوے ای کے ژاں کے حکم سے جو ساں سیر کا کونٹ تھا، تالیف کی۔ اس کتاب کی حبارت آمیز آزاد بیانی نے انگریزی تباہی کو مدعو کیا تھا۔

بیوے ای کے ژاں کی فرانسسی تالیف "نوعمر بچہ" جس زمانے سے تعلق رکھتی ہے، وہ ایک اہم زمانہ تھا یعنی ۱۴۲۴ء سے ۱۴۵۳ء تک۔ "نوعمر بچہ" نامی کتاب میں ایک ایسے نوعمر کی تاریخ بیان کی گئی ہے جس نے ہتھیار چلانا نیا نیا سیکھا ہے، اور جو بڑے بڑے رتبوں پر پہنچ جاتا ہے۔ مولف اولاً اسے یگانگی کی حالت میں دکھاتا ہے یعنی وہ تنہا تھا اور اپنے سوا کسی اور کے لیے جوابدہ نہ تھا۔ اس کے بعد وہ گرہستی کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی اسے متعدد دیگر لوگوں کی گزر اوقات کے لیے کام کرنا پڑتا ہے اور آخر میں

---

[1] روتر دام کے آرنولد کی لاطینی کتاب "ضمیر کا آئینہ" یا: تو خود اپنے آپ کو پہچان" مطبوعہ بروسیل ۱۴۸۱ء۔ عنوان دوم کتاب اول، باب نمبر ۵ "قتل نہ کرو"، مسئلہ (۳۷) متعلق بہ جنگ۔

سیاسی حالت میں۔ اور وہ ایک بڑے ملک کا حکمران ہوتا ہے۔ یہ "نوعمر بچہ" خود ہیوے ای کاژاں ہی ہے۔ اور مولف کا اصل میں منشاء یہ تھا کہ اپنے وطن میں واپس آنے کے بعد جب اس نے یہ کہانی ۱۴۶۲ء میں لکھنی شروع کی، اپنے تجربوں سے ان نوجوان جاگیرداروں کو مستفید کرے جو ملازمت کی عمر رکھتے ہوں اور ان کو اطاعت شعاری کی اور مقابلہ کرنے کی، اور بالآخر حکومت کرنے کی تعلیم دے۔

113

"نوعمر بچہ" نامی کتاب کا مولف جنگ کے وہ قواعد بیان کرتا ہے جو قیدیوں، تقسیم حصص، تقسیم مال غنیمت اور پروانہ راہداری کے متعلق ہیں۔ یہ مولف انصاف، ایمانداری اور راستبازی کی تعلیم دیتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ صرف انہیں کے ذریعے سے امن حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ امن "ہتھیاروں کی ہر شاندار کامیابی پر ترجیح دینے کے قابل چیز ہے۔ اور یہی دنیا کے آغاز ہی سے جنگ کے قابل نفرت سرچشموں کو خشک کرتا رہا ہے اور اسی کے باعث وہ بدبختانہ تحقیر و انکار اور رشک و رقابت کے جذبات نہیں پیدا ہوتے جو ہمیشہ حکمرانوں کو ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر آمادہ کرتے ہیں۔" لیکن جنگ بعض وقت ایک "اچھی اور جائز بنیاد پر مبنی جھگڑا" ہو سکتی ہے اور اس صورت میں "وہی انصاف ہوگا اور وہی حق کی حمایت سمجھا جائے گا۔"

سپہ گری کا پیشہ ہیوے ای کے ژاں کو پھسلا دیتا ہے۔ وہ اپنے پیشے کا عاشق ہے۔ اور اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ جوش میں آجاتا ہے۔ وہ جنگی بہادری کی تعریف کرکے اسے آسمان پر چڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ "جو کوئی کسی بڑی فوج کا سردار ہو تو اُسے چاہیے کہ اپنے کو نمایاں کیا کرے، سر اٹھا کر چلا کرے اور کوچ اسی وقت کرے جب سورج کافی بلند ہو تاکہ وہ اپنے ہتھیار چمکا سکے اور اس طور پر کہ سورج اس کی زرہ کو جگمگاتا رہے۔" اُسے "اچھے کپتان" لاایر کی بات یاد آتی ہے جو اس نے اپنے سپاہیوں میں سے ایک سے کہی تھی کہ "اگر تو

چاہتا ہے کہ ڈر کبھی تیرے پاس نہ پھٹکے تو اس بات پر تیار رہا کر کہ پہلا وار کرنے کا ہمیشہ تجھی کو موقع ملے۔" یہ مولف جنگ کی مصیبتوں سے ناواقف نہیں ہے، لیکن یہ مصیبتیں صرف معمولی روحوں کو پہنچتی ہیں ورنہ بلند تر روحوں کے لیے تو خدا کی ذات میں تسکین و آرام کا سامان موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "مصیبتیں، خطرے، افلاس اور قحط جو [اس سے] پیدا ہوتے ہیں، ہنسی خوشی گزر جاتے ہیں کیونکہ جو لوگ ایک شریف دل کے مالک ہوں اور قوت اور اعتبار کے صفات سے متصف ہوں تو ان کے لیے اس دنیا میں ان چیزوں سے بڑھ کر کوئی اور خوشی ہو ہی نہیں سکتی۔ جو کچھ ہے، جنگی زندگی ہی ہے یہ ایک خوشگوار پیشہ ہے اور نوجوانوں کے لیے اچھی چیز۔ خدا بھی ان کو چاہتا ہے اور تمام دنیا بھی۔ اور جنگ کے زمانے میں بہت کچھ باہمی محبت لوگوں میں آپس میں پیدا ہو جاتی ہے۔[1]

سپہ گری کے پیشے کی وہ بہت تعریف کرتا ہے۔ چنانچہ "ایسے لوگوں کی ہمیشہ مانگ رہتی ہے۔ کیونکہ سپاہی یا تو مرجاتا یا قابل عزت افلاس کی حالت میں زندگی گزارتا ہے یا بالآخر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ بن جائے۔"

ایک تالیف جو انگلستان میں ہوئی تھی، وہ پندرھویں صدی کے نصف اول سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ قانون جنگ سے متعلق ہے۔ اس کے مولف کا نام نکولاس اپٹن ہے اور اس کتاب کا لاطینی نام

[1] سینٹ پارے کے لاکیورن کی فرانسیسی تالیف "نوعمر بچہ" نامی کتاب کے دو مخطوطے جن کا پاریس میں ۱۵۲۹ء میں چھپے ہوئے نسخے سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک ادبی یادداشت ہے جو کتبات اور ادب لطیف کی شاہی اکاڈیمی کے رجسٹروں سے ماخوذ ہے۔ دیکھیے جلد ۲۶۔ بیوے امی کے ژاں کی کتاب "نوعمر بچہ" جس کا دیباچہ کامی فاقر نے لکھا تھا اور جسے لیوں لے بستر نے باضافہ حواشی ایڈٹ کیا تھا، مطبوعہ پاریس ۱۸۸۷ء و ۱۸۸۹ء۔

فوجی مسایل پر چار کتابیں" ہے۔ آیٹن اس وقت انگریزی فوج کے ساتھ تھا جب وہ اورلیاں کا محاصرہ کیے پڑی تھی۔ وہیں اس کا سرپرست یعنے سالسبری کا کونٹ مرگیا۔ اب وہ اپنے ایک اور سرپرست کے مشورے سے مذہبی سلسلے میں داخل ہوگیا اور بعد میں سالسبری کا عہدہ دار پادری (کیانن) بن گیا۔

یہ تالیف سچ پوچھئے تو شہامت اور اسلحہ بازی پر ایک رسالہ ہے جو بارتولے کی لاطینی کتاب "تمغے اور ہتیار" سے مشابہت رکھتی ہے، اور اسی سے ماخوذ بھی ہے۔ لیکن دوسری لاطینی کتاب جس کا نام فوجی فرایض کے متعلق" ہے، اس میں آیٹن نے قانون جنگ سے بحث کی ہے۔ وہ اس بارے میں گراتیان کے قدم بقدم چلتا ہے اور مختلف موقعوں پر لناٗنو کے ژاں کا بھی حوالہ دیتا ہے اور وہی تقسیم قبول کرلی ہے جو لناٗنو کے ژاں نے بیان کی تھی کہ روحانی جنگ یا تو آسمانی ہوتی ہے یا انسانی؛ اور جسمانی جنگ یا عالمگیر ہوتی ہے یا خصوصی۔ لیکن آیٹن اس خواب آرائی میں اپنے آپ کو نہیں پھنسا لیتا جو بولونیا کے پروفیسر یعنی ژاں کے ہاں نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں قانونی ڈوئل (یعنی دو آدمیوں کی دست بدست لڑائی یا مبارزت) کو تسلیم کرلیا گیا ہے اور لومبارد کے بھی بکثرت حوالے ہیں۔ انتقام یا مواخذے کی بھی اچھی احتیاط کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اس کا جو طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے وہ بتادیا گیا ہے اور اس کے اصول بھی بیان کردیے گئے ہیں۔ آیٹن اس کے جواز کے متعلق خود کچھ نہیں کہتا بلکہ صرف بارتولے، بارے سو کے گای، بل ؤو کے ژاک، آندریا کے ژاں اور بالدے کا حوالہ دے دیتا ہے۔ اس کتاب کا ایک جملہ دلچسپ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے متعلق آیٹن اسی بے رحم نظریے کو قبول کرتا ہے، جو بالدے نے پیش کیا تھا۔ شاہان انگلستان کی اسلحہ آرائیوں سے بحث کرتے ہوئے وہ قانون روما

کے تحریری احکام کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے کہ چونکہ بادشاہ ژاں ایک قیدی تھا، اس لیے ہر وہ چیز جو اس کی ہو وہ تیسرے ایڈورڈ کی ہو جائے گی۔ اور یہ کہ نتیجۃً اسے یہ حق ہے کہ خانوادۂ فرانس کے ہتیاروں کی فتوحات کو بھی اپنی ہی قرار دے اور اسے اس بات کی کوئی ضرورت نہ ہوگی کہ اپنی ماں کے توسط سے اسے جو حقوق حاصل ہوئے ہیں، ان کا حوالہ دے۔

اسی زمانے کی ایک اور عمدہ فرانسیسی تالیف ملتی ہے جس کا نام "ایک نوجوان شہزادے کی تعلیم" ہے[ا]۔ مائن کے لاکرُوانے اور لاسرنانے بیان کیا ہے کہ یہ کتاب ژور ژشاتِ لیں کی تالیف ہے۔ پوت فیس نے بیان کیا ہے کہ یہ مشہور سیاح، سیاست داں اور واعظ ییئے لانوا کے گِل بیر کی تصنیف ہے جسے "اچھے فلپ" نے اپنی دوستی کا افتخار بخشا تھا۔ اس کتاب کا مولف چاہے کوئی ہو، بہر حال وہ جنگ کا مخالف ہے اور وہ اپنے پڑھنے والے کو حکم دیتا ہے کہ جنگجویانہ مہموں میں اس وقت تک شریک نہ ہو جب تک کہ انتہائی مجبوری نہ پیش آجائے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "جو حکمران اچھی شہرت، اپنی رعایا کی سچی اور پوری محبت اور ساتھ ہی جنت میں جانے کی عزت حاصل کرنی چاہتے ہوں، انھیں چاہیے کہ تمام چیزوں سے زیادہ اپنے آپ کو جنگ اور عیسائیوں کے خلاف معاملات سے بچائے رکھیں۔ خاص کر ان چیزوں سے جو ان کے ممالک اور رعایا کو تکلیف یا نقصان پہنچائیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ ان کی ذات کو جوکھم یا خطرہ لاحق ہوگا بلکہ صرف ان جذباتِ رحم و رافت کے باعث جو تمام ممالک کے لوگوں اور قوموں کے متعلق ہونے چاہییں۔"

ا۔ مخطوطۂ کتب خانۂ شاہی بروسیل نشان (۱۰۹۷۶) — پوت فیس کا شایع کردہ فرانسیسی "لانوا کے گِل بیر کا مجموعۂ تصانیف"

جنگ کی برائیوں کو دور کرنے کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے؟ ہمارے فیاض مولف نے اس کا جواب بڑے زور سے یوں دیا ہے کہ "معقولیت اور انصاف کے ساتھ حکومت کرو"۔ اور وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ جس طرح ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ ماں اپنے بچے کو پیار سے لیے پھرتی ہے، اپنی چھاتی سے لگائے رہتی ہے، اسی طرح معقولیت اور انصاف کی گود میں امن و مصالحت کی پرورش و پرداخت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جنگ، جس سے ہر چیز تباہ و برباد ہو جاتی ہے، تین شیطانی برائیوں سے پرورش پاتی ہے یعنی غرور، تکبر اور لالچ"۔

اس کا مشورہ یہ ہے کہ سفارتی ذرایع سے گفت و شنید اختیار کی جائے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ تمام حکمرانوں اور ان کے خاص مشیروں کو چاہیے کہ جنگ کے ہولناک اور بے رحمانہ مصائب میں پڑنے سے قبل اپنے معاملے کا خود مطالعہ کریں اور متعدد سفیروں اور سفارتوں کے ذریعے سے معقولیت پسند اور ناطرفدار حکام عدالت کی رائے معلوم کریں۔ اور اگر معاملہ اتنا مشکل اور جنگ پر اتنا مائل ہو کہ تم اور تمھارے خاص مشیر اس کا انتظام کرنے سے قاصر ہوں، اس طور سے کہ معاملات اتنے آگے بڑھ گئے ہوں کہ واقع ہونے ہی والے ہوں تو تمھیں چاہیے کہ اپنی سلطنت اور ملک کے تینوں طبقات کے نمایندوں کو کسی مناسب مقام پر جمع کرو، یعنی تمھارے ہم خون سردار، کلیسا کے لوگ، شجاعت باز اور جاگیردار، عوام اور علماء اور تمھارے شہروں اور اچھی بستیوں کے معززین [سے مشورہ کرو]"۔

مولف نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جنگ میں گھسنے کے راستے آسانی سے مل جاتے ہیں اور لوگ وہاں جلد پہنچ جاتے ہیں لیکن وہ راستے اور مخرج جن کے ذریعے سے اس سے باہر نکل سکیں، خطرناک اور مشکل ہوتے ہیں۔ اور اکثر اُسترے سے زیادہ تیز اور سوئی سے زیادہ

نکیلے ہوتے ہیں۔"

"فرانس اور انگلستان کے جنگی نقیبوں کا جھگڑا" نامی کتاب[1] ۱۴۵۳ء اور ۱۴۶۱ء کے مابین تالیف ہوئی۔ یہ کتاب اور لیباں کے شارل کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن اس خیال کی تائید میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں وہ قطعیت سے دور ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرانس کی انگلستان پر برتری نمایاں اور واضح کی جائے۔ اس کتاب میں فرانس کا جنگی نقیب اور انگلستان کا جنگی نقیب "عقل بانو" کے سامنے اپنی اپنی تائید میں بحث کرتے ہیں، اور باری باری سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے ہی ملک سے دیگر تمام عیسائی ممالک کے مقابلے میں زیادہ "احترام کا برتاؤ کیا جائے۔" برتری کے جو اسباب وہ بیان کرتے ہیں وہ تین قسم کے ہیں۔ : مسرت، شجاعت اور ثروت۔ مولف کو جنگ سے دلچسپی ہے اس کی رائے میں باوجود اپنے تمام نتائج کے، حالت جنگ بھی ویسی ہی مطابق فطرت ہے جیسی حالت امن۔ خونریز جھگڑے، وقت بہلائی کا ایک جائز طریقہ ہیں بلکہ وہ اس غرض کے لیے ضروری ہیں کہ "ہتیاروں کی اچھی مہارت" کے ذریعے سے جاگیرداروں کو اپنی شجاعت کے ثابت کرنے" اور عزت حاصل کرنے کا موقع ملے، جیسا کہ فرد اسار کی رائے تھی۔ اس کو بہت کم اہمیت حاصل ہے کہ آدمی کو فتح حاصل ہوئی یا شکست۔ دیکھنا صرف یہ چاہیے کہ وہ بہادر ہے یا نہیں۔ "کسی بادشاہ کے لیے اس دنیا میں یہ کوئی قابل ملامت بات ہرگز نہیں کہ اسے جنگ میں ناکامی ہو بشرطیکہ اس کو یہ بڑی عزت حاصل ہوچکی ہو کہ اس نے اپنے دشمن سے بہادری کے ساتھ جنگ کی تھی۔"

---

[1]. اسے لیوپول پانیے نے شایع کیا اور پاول مائیر نے ۱۸۷۷ء میں اس کی تکمیل کی۔

ہالینڈ کے ایک مولف نے لاطینی میں "جائز جنگ کے متعلق" ایک رسالہ تالیف کیا جو کافی بڑے مجموعے کا جزو ہے۔ اس کا نام ہنری فان گورکم ہے۔ وہ جامعۂ کولون میں عیسائی دینیات کا پروفیسر تھا۔ شروع میں وہ ایک بہت ہی خصوصی موضوع سے دلچسپی لیتا ہے۔ چنانچہ جس مسئلے سے وہ بحث کرتا ہے، وہ یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا کوئی فریق جو شکست کھا کر کسی شہر سے جلاوطن ہو جائے اور دوبارہ فتحمند ہو کر وہاں واپس آجائے تو کیا وہ مفتوحوں کے مال کو کام میں لا سکتا ہے؟ اس بحث کو پھیلاتے ہوئے وہ اکوی ناس کے سینٹ ٹامس کا نظریہ قبول کر لیتا ہے اور تین شرطوں کے پائے جانے کا مطالبہ کرتا ہے یعنی "با اقتدار شخص"، اور منصفانہ وجہ، اور "جنگجویوں کی درست نیت"[1]

اٹلی کا ایک ماہر قانون پاریس دل پوت سو تھا۔ یہ نیپلز کے حکمران فرڈیناند کا مشیر تھا۔ اس نے پندرھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں لاطینی میں ایک رسالہ "امور جنگ کے متعلق"، لکھا جس میں خاص کر ڈوئل یا مبارزت یعنی دو آدمیوں کی دست بدست لڑائی کا ذکر تھا اور ضمناً اس میں قانون جنگ سے بھی بحث تھی۔ پاریس دل پوت سو نے اپنی کتاب کا اطالوی سے لاطینی میں بھی ترجمہ کیا تھا[2]۔

[1] - یہ لاطینی کتاب شہر کولون میں ۱۵۰۳ء میں اس نام سے شایع ہوئی کہ مشوروں کا رسالہ جو محترم استاد، گوری کم کے ہنری کی تالیف ہے، جو دینیات کا نہایت درخشاں پروفیسر اور جو سابق میں جامعہ کولون کا نائب امیر تھا۔ نیز برسے موتی کے مدرسے کا صدر۔

[2] - یہ اطالوی تالیف تقریباً ۱۴۷۱ء میں نیپلز میں شایع ہوئی اور اس کا اطالوی نام یہ تھا "کتاب تمہید امور جنگ، جسے فاضل استاد پاریس دے پوتے کو، ماہر قانون، نے مادری زبان میں تالیف کیا" مطبوعہ نیپلز تقریباً ۱۴۷۱ء۔

۱۴۷۵ء میں ایک گمنام مولف نے چوتھے ایڈورڈ کو مخاطب کرکے ایک انگریزی تالیف "شرافت کے متعلق کتاب" شایع کی۔[1] بادشاہ گر یعنی وارک مرچکا تھا اور اقتدار شاہی بے چون و چرا مانا جاتا تھا۔ برگنڈی کا ڈیوک جس نے اپنے برادر نسبتی ایڈورڈ کی مہمان نوازی اس کی جلاوطنی کے زمانے میں کی تھی، اب اسے فرانس کے خلاف بھڑکانے لگا۔ باوجود اپنی کاہلی و بے وقوفی کے، بادشاہ نے یہ مشورہ سن لیا اور ایک مہم اختیار کی۔ اگرچہ اس مہم کو انگلستان میں عام طور سے پسند کیا گیا لیکن گیارھویں لوئی کی چالاکی کے سامنے وہ ناکام رہی۔

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ بادشاہ کو اعلان جنگ پر آمادہ کرے۔ مولف اپنی کتاب کا آغاز خدا سے مدد کی درخواست سے کرتا ہے اور پھر بیان کرتا ہے کہ انگلستان نے بتدریج نارمنڈی، گاس کنی، گوی ین، اور مائن اور پوئی تیو کی کونٹیاں کھودی ہیں۔ وہ انگریز نسل کی بہت تعریف کرتا ہے جو ٹرائے والوں کی اولاد ہیں اور وہ فرانس پر یہ الزام لگاتا ہے کہ اس نے ۱۴۴۴ء کی صلح توڑ ڈالی ہے۔ جنگ کے جواز کے مسئلے سے تو بحث کی گئی ہے لیکن یہ بحث محدود تر کی گئی ہے اور صرف عیسائیوں کے خلاف جنگ سے بحث کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ یعنی "کیا یہ جائز ہے کہ عیسائی خون کے خلاف جنگ کی جائے؟"۔ اس میں جس خاص سند کا حوالہ دیا گیا ہے وہ "شجرۂ حروب" نامی کتاب ہے جو اس مولف نے کرستین ڈی پیزاں کی طرف منسوب کی ہے۔[2] کتاب کے مختلف باب

---

[1] انگریزی تالیف "شرافت کے متعلق کتاب" جو چوتھے ایڈورڈ کو اس کے حملۂ فرانس بابتہ ۱۴۷۵ء کے موقع پر مخاطب کرکے لکھی گئی جس کا دیباچہ جان گف نکلس نے لکھا اور روکس برگ کلب کے لیے ۱۸۶۰ء میں لندن میں چھپی۔

[2] حالانکہ وہ اونورے بونے کی ہے۔ (مترجم)

قدیم زمانے کے ہیروؤں اور انگلستان کے بادشاہوں کے کارہائے نمایاں سے مختص ہیں۔ ہر لمحہ مولف یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فرانسیسیوں نے معاہدات کی ذرا بھی پابندی نہیں کی۔

اسی زمانے میں ایک فرانسیسی کتاب تالیف ہوئی جس میں ان مباحث کی تفصیل ہے جو ثالوا کے فلپ اور تیسرے ایڈورڈ میں پیش آئے تھے۔ کتاب میں یہ یاد دلایا گیا ہے کہ ملک کے تینوں طبقات کے نمایندوں نے اعلان کیا ہے کہ تخت فرانس کا حقدار فلپ ہی ہے۔

فرانسیسی تالیف "دو جنگوں کا گلستان" اس کا مولف گیارھواں لوئی سمجھا جاتا ہے۔ مولفوں کا خیال ہے کہ اس بادشاہ کے حکم سے یہ کتاب اے ٹی پیئیں پورشے اور اے ٹی پیئن گوزینو نے تالیف کی۔ لیکن حقیقت میں اس کا مولف پی پیر شوانے ہے جو "نجومی طبیبوں" میں سے ایک تھا اور جسے گیارھواں لوئی اپنے ساتھ ہمیشہ رکھا کرتا تھا[۱]۔ یہ کتاب سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں چھپی اور فرانسیسی تالیف "فرانس کا تاریخی گلستان" کا حصہ اول اور حصۂ سوم اسی پر مشتمل ہے۔ اسی کی چند سطروں میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب "ایک گلستان ہے جس میں متعدد خوبصورت گلاب، تعلیمی کلیاں اور بادشاہوں، حکمرانوں، شہامت بازوں، کپتانوں اور سپاہیوں کے لیے عمدہ تعلیم درج ہے جس سے وہ معلوم کر سکتے ہیں کہ انھیں اپنا رکھ رکھاؤ کیسے کرنا چاہیے حکمرانی کیسے کرنی چاہیے، فوجیں جمع کرنے اور اپنے دشمنوں کے خلاف خشکی اور تری میں لڑنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔" واقعہ یہ ہے کہ "دو جنگوں کا گلستان" نامی کتاب کے حصۂ اول کا یہ ایک خلاصہ ہے۔ اس کا آغاز اخلاقی

[۱] ۔ ژاں کاذیک کی فرانسیسی کتاب "کیا گیارھواں لوئی "جنگوں کا گلستان" نامی کتاب کا مولف تھا؟" "تاریخی تبصرہ" جلد (۲۱) صفحہ ۳۱۴۔

مشوروں سے ہوا ہے، پھر سیاسی انتظامات سے بحث ہے اور اس کے بعد ایک اچھے سپاہی کے خصائص پر نظر ڈالی گئی ہے۔ جو چیزیں "کسی حکمران کے لیے انجام دینی اور اپنے علاقے میں ملحوظ رکھنی ضروری ہیں"، "کتاب گلستان" ان کے متعلق بیان کرتی ہے کہ بادشاہ کو چاہیے کہ گرجا کے پادری کی عزت کرے اور ان چیزوں کی حفاظت و حمایت کرے جو عمومی ملک ہیں۔

"جنگوں کا گلستان" نامی کتاب کے حصۂ دوم میں مختلف تاریخوں کے انتخابات ہیں۔ ان کا بڑا حصہ فرانسیسی کتاب "فرانس کی بڑی تاریخیں" اس کتاب کے کم و بیش لفظی اقتباسات پر مشتمل ہے[1]۔

فرانسیسی کتاب "جنگوں کی ناؤ" ۱۵۰۲ء میں چھپی۔ اس کا مولف ژوبیر ڈ بالزاک تھا جو آں تریک کا جاگیردار، حاجب شاہی، مشیر شاہی اور آٹرنے اور گاس کنی کے علاقوں کا افسر عدالت بھی تھا۔ ۱۵۱۴ء میں فرانسیسی زبان میں "جنگ کی چالیں اور چالاکیاں" پاریس میں چھپی۔ اس کے مولف کا نام کم از کم ناشر کے بیان کے مطابق رے ایل بنیے رُوسُو تھا۔ اس میں زیادہ تر فردوں ٹیس اور دیگر مولفوں کے اقتباسات پائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اصل میں اس کا مولف سینٹ ژوس کا ایمری ہو[2]۔

ایسی اور بھی کتابیں ہیں جن میں فن حرب سے بحث کی گئی ہے۔ ایک کتاب میں، جو بارھویں لوئی کے زمانے میں فوجی ضبط و نظم کے متعلق لکھی گئی تھی، خاص کر یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ سب سے پہلے

---

[1] برٹش میوزیم مخطوطات ہارلے میں سے نشان (۴۴۰۶) — فرانسیسی کتاب "ایک بڑے کتب خانے سے لیے ہوئے اقتباسات کا مجموعہ" جلد ۵ صفحہ ۲۲۔

[2] مذکورۂ بالا فرانسیسی کتاب "مجموعہ" جلد (۲۷) صفحہ (۵)

اور ہر کام سے مقدم حکمران کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس کی جنگ درست اور منصفانہ ہے تاکہ خدا اور معقولیت اس کے ساتھ ہوں۔ پھر اسے خود اپنی حالت کے متعلق دیکھنا چاہیے کہ آیا اس کے پاس جنگ کے لیے کافی روپیہ اور آدمی ہیں۔ پھر یہ چیز اچھی طرح سے معلوم کر لینی اور اپنے نہایت عقلمند فوجی افسروں سے خوب بحث کر کے دریافت کر لینی چاہیے کہ بالآخر اس کی مہم کا کیا انجام ہوگا؟" اسی میں یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ "اپنے ساتھ والوں اور مددگاروں کے لیے اچھی خبریں پھیلائے اور پہنچائے"۔

ہم اوپر "خلاصہ" نامی کتابوں کا ذکر کر چکے ہیں اور ان کی خصوصیات بھی بیان کر چکے ہیں۔ ایسی بکثرت کتابیں شایع ہوئیں اور تقریباً ہر ایک میں یا تو جنگ سے بحث تھی یا مال غنیمت اور اس کے حاصل کرنے کے جواز سے۔ چودھویں صدی کے آغاز میں لاطینی کتاب "آستیانی خلاصہ" تالیف ہوئی تھی۔ اس کا مولف آستی کا ایک فرانسسکانی پادری تھا۔ لاطینی کتاب "پیزائی خلاصہ" پندرھویں صدی کے آغاز میں مرتب ہوا۔ اس کا مولف پیزا کا بارتیلمی تھا۔ اسی زمانے میں انتونیائی خلاصہ فورچی لیوئی کے انتوان نے تالیف کیا تھا۔ اسی صدی کے اواخر میں باپتیستیانی خلاصہ سالیس کے باپتست نے لکھا اور اسی کو نظر ثانی کے بعد وہ "روز ے لا" یعنے چھوٹے گلاب کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ کیا ٹاسو کے آن جیلو نے آن جیلیائی خلاصہ مرتب کیا؟ سِل ڤستری خلاصے کا مولف پیرے ای رئیو کا سِل ڤستر موت سولیتی ہے۔ یہ پندرھویں صدی کے اواخر کی تالیف ہے۔ ان تالیفوں میں قانون جنگ کے مختلف مسایل اٹھائے اور حل کیے گئے ہیں اور زیادہ تر عدالت کفارہ و توبہ کی

118

لہ۔ برٹش میوزیم کے اضافہ شدہ مخطوطات میں سے نمبر ۲۰۸۱۳۔

ضرورتیں پیش نظر تھیں۔

گابریل بیل جو استاد گابریل کے نام سے مشہور ہے، جرمنی میں اوکام کی نئی تحریک کا علمبردار تھا۔ یہ ماٹنس میں واعظ اور ٹیوبنگن میں فلسفے اور دینیات کا پروفیسر تھا۔ اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ پندرھویں صدی نے جو چند نہایت ٹھوس شخصیتیں پیدا کیں، یہ ان میں سے ایک تھا۔ اس نے اپنی لاطینی کتاب "اہم فیصلوں کے خلاصوں کا مجموعہ چار جلدوں میں" پی ییر لومبارد کے نام معنون کی جیسا کہ کتاب کا نام بتاتا ہے۔ یہ لومبارد افسر فیصلہ جات تھا۔ مولف نے جنگ کا ذکر ناجائز طور سے چھینی ہوئی چیز کی واپسی کی بحث میں کیا ہے اور اسے سب سے زیادہ اس کی کاوش رہتی ہے کہ جنگ کس کے حکم سے ہوئی۔ یہ بے رحم واقعہ اپنی جگہ موجود تھا کہ مختلف حکمران، شہنشاہ یا پوپ سے پوچھے بغیر جنگ کر لیتے تھے۔ لہذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس طرح کی جنگ سے گرفتاری اور گرفتاری سے چھٹکارے پر آزادی کے حقوق پیدا ہوتے ہیں یا نہیں؟ بیل کی رائے یہ تھی کہ تین صورتیں ایسی ہیں جن میں جنگ کے جواز کے لیے شہنشاہی اور کلیسائی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان میں سے پہلی صورت یہ تھی کہ ضرر رساں ہی اب ضرر رسانی کا ہدف بنا ہو۔ دوسرے جس شخص پر زیادتی ہوئی ہو وہ ایک مسلح ہاتھ کے حملے کا ہدف بنا ہو۔ اور تیسرے وہ مظلوم جس کا یہ دعویٰ ہو کہ اس سے جو چیز جبراً چھین لی گئی تھی، وہ اسے واپس لینا چاہتا ہے۔

قدیم مولفوں ہی کی نہج پر ژاں لوپیز نے جنگ کی دو قسمیں کی ہیں: ایک وہ جسے جنگ کہنا ٹھیک ہے اور دوسری وہ جسے جنگ کہنا ٹھیک نہیں۔ اس مولف کی رائے میں جس صورت کو جنگ کہنا ٹھیک ہے، صرف اسی کی صورت میں جنگ کے اثرات

مترتّب سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس نے جنگ کی تعریف لاطینی میں یوں کی ہے: "جنگ صرف ایسے حکمران کی اجازت سے ہو سکتی ہے جو اپنے اوپر کسی اور سردار کو تسلیم نہ کرتا ہو۔" لیکن یہ شرط ناکافی ہے اور مولف نے بعض اور شرطیں بھی ضروری قرار دی ہیں اور بیان کیا ہے کہ جنگ ضروری اور ناگزیر ہو گئی ہو۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ میں "جنگ ضروری ہو گئی ہو اور ہم حقیقت میں جنگ اسی لیے کرتے ہیں کہ امن چین سے زندگی گزاریں"۔[۱]

ایک ولندیزی مولف نے اپنی لاطینی تالیف "درست اور جائز جنگ پر کتاب" لکھی جو بہت ترقی یافتہ اور اچھی طرح مرتب شدہ ہے۔ گروتیوس نے اپنی لاطینی کتاب "قانون جنگ و صلح" میں قانون جنگ پر اپنے بیشتر موقعوں میں وِل ہِل موس ماتے ای کا بھی نام لیا ہے اور اپنی لاطینی تالیف "قانون غنیمت پر یادداشت" کی تعلیقوں میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ گروتیوس کی کتابوں کا جن لوگوں نے ترجمہ کیا ہے وہ، اور خاص کر باربی راک، صاف طور پر یہ بیان کرتے ہیں کہ "انھیں معلوم نہیں کہ ماتے ای کون تھا! کس قوم کا تھا"۔ انھیں مترجموں میں سے ایک اور انتوان ڈکورتیں کے خیال میں یہ شخص ولیم ماتی سن ہے۔ باربی راک لکھتا ہے کہ "اگر یہ صحیح ہے تو یہ نام انگریزی معلوم ہوتا ہے"۔ حقیقت میں گروتیوس کا ذکر کم و بیش بالکل صحیح ہے۔ وِل ہِل موس ماتیے، — یا ماتیاس کا بیٹا ولیم — ایک لاطینی کتاب کا مولف ہے جس کا نام "درست اور جائز جنگ پر کتاب" ہے اور جو ۱۵۱۴ء میں آن ڤیرس میں چھپی ہے۔[۲]

۱۔ ژاں لُموینر (یحنّس لُوپیس) کی لاطینی کتاب "جنگ اور جنگ کرنے والوں کے متعلق رسالہ" رسائل قانون عمومی جلد (۱۶) ورق صفحہ ۳۲۸۔

۲۔ (لاطینی میں): درست اور جائز جنگ پر کتاب ..... انتورپ کے مطبع میں نہایت احتیاط سے

اس تالیف میں مولف نے منطقی استدلال، حسن ترتیب اور عمیق معلومات کا خصوصی مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں جن مولفوں کا بطور سند حوالہ دیا گیا ہے ان میں اکویناس کا سینٹ ٹامس، سوسے کا ہنری، بارتولے، بالدے، تودیس کس کا نکولاس (جو قرون متوسطہ کے بڑے ماہرین قانون مذہبی میں سے ایک تھا) اور گابریل بیل بھی شامل ہیں۔

وِل ہل مس ماتیسے کی رائے کے مطابق جائز جنگ کی تین شرطیں ہیں۔ پہلے جائز سبب، دوسرے جائز طریقہ اور تیسرے ناگزیر ضرورت۔ جائز سبب یا آخری سبب یا مجبور کرنے والا سبب سہ گانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اسی بارے میں مولف نے بیل کے نظریے کی پیروی کی ہے، جو حقیقت میں یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ قوانین الہٰی و انسانی کا احترام کیا جائے، وطن اور اہل وطن کی مدافعت کی جائے، مضرتوں کا انسداد کیا جائے، اور ناجائز طور سے چھینی ہوئی چیزیں واپس حاصل کی جائیں۔

جائز ذریعے یا جائز طریقے میں یہ امر مضمر ہے کہ جنگ میں انصاف ملحوظ رکھا جائے۔

اگر صورتہائے ذیل میں سے کوئی ایک بھی پائی جائے تو سمجھا جائے گا کہ جائز طریقہ ملحوظ نہیں رکھا گیا یعنی جب وعدہ خلافی کی جائے، بے قصور پر زیادتی کی جائے، مفتوح پر زیادتی کی جائے جن کو محفوظ و مامون رکھنا ہے ان پر دست درازی کی جائے، مال غنیمت کو غصب کیا جائے، غاصبانہ طور سے کوئی ایسی حیثیت اختیار کی جائے جو حاصل نہ ہو، بدنیتی، متکبرانہ برتاؤ۔ وِل ہل مس ماتیسے نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ نکولاوس نے مریم عذرا کے زیر حمایت ولادت خداوند حضرت مسیحؑ کے ۱۵۱۴ء میں ستمبر کے مہینے میں تحت عنایت و اجازت شائع کی۔

ان خیالات کو جس طرح سے پھیلایا ہے، وہ بہت عجیب ہیں۔ سینٹ آگسٹائن نے کہا تھا کہ دشمن سے کیے ہوئے وعدے کا بھی لحاظ کیا جائے۔ چنانچہ یہ قول یہاں دہرایا گیا ہے۔ اجنبی تاجروں کا اسباب صرف اسی صورت میں ضبط کیا جا سکتا ہے جب ان تاجروں کے پیش نظر فریق ثانی یعنے دشمن کی تائید کرنی ہو، ورنہ اگر صرف کاروبار کا سیدھا سادہ ارادہ ہو تو صرف حمل و نقل کو روکنا ہی روا ہو سکتا ہے دشمن کو وہ نقصان پہنچانا چاہیے جس سے وہ سب سے زیادہ ڈرتا ہو اور جس سے وہ سب سے جلد امن پر آمادہ ہو جائے۔

[اشخاص و اشیاء کو] جو حفاظتیں حاصل ہیں وہ یا تو حق قدامت کی بناء پر حاصل ہوتی ہیں، یا رسم و رواج پر مبنی ہوتی ہیں، یا قانون مذہبی پر۔ اور اس کا معیار یہ دیکھنا ہے کہ آیا وہ حفاظتیں عارضی صلح کے باعث حاصل ہوئی ہیں یا عمل درآمد و رواج کی بناء پر یا قانون مذہبی کے باعث۔ مال غنیمت سردار کے حوالے کر دینا چاہیے، جو اسے سب میں تقسیم کرے گا۔ مذہبی خدمات انجام دینے والے ملازمین کو لڑائی میں حصہ نہیں لینا چاہیے بجز اس کے کہ کسی محصور شہر کی مدافعت کرنی ہو۔ ارسطو کے قول کے مطابق جنگ کا مقصد امن حاصل کرنا ہوتا ہے سپاہی اصل میں انصاف کو نافذ کرنے والے ہوتے ہیں اور کبھی مقاتلوں یعنی لڑنے والوں کو صرف تکبر اور خود نمائی کے جذبات کے تحت نہیں لڑنا چاہیے۔

تیسری شرط ناگزیر ضرورت کا ہونا ہے۔ سینٹ آگسٹائن کا (لاطینی میں) یہ قول ہے کہ "جنگ ایک ضرورت کا نام ہے"۔ جنگ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دوستانہ دخل دہی یا عدالتی دخل دہی یا کسی برتر شخص کی دخل دہی ناممکن ہو چکی ہو۔

جان مایر نے پیکے بعد دیگرے پاریس، گلاسگو، اور سینٹ انڈریو میں تدریس کا کام کیا تھا۔ اس نے اپنی فرانسیسی کتاب "پی ییر لوں بار کے

121

فیصلوں کی چوتھی کتاب پر سوالات" میں جائز جنگ کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ حکمران کے حکم سے کی گئی ہو، کسی جائز سبب پر مبنی ہو اور اچھے ارادے سے اور اعتدال کے ساتھ لڑی گئی ہو۔" صرف وہی بادشاہ جو اپنے ملک میں شہنشاہ [؟ مکمل حاکم] ہو، وہی جنگ کا اعلان کرسکتا ہے"۔[1]

ہم اوپر ضمناً پری اے ریو کے سل فِستر مُوت شولینی کی لاطینی کتاب "سل فِستری خلاصے" کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس میں جنگ کے متعلق چند دلچسپ صفحے ہیں۔ وہ خصوصی جنگ کا بھی الگ ذکر کرتا ہے اور اسی میں ڈویل یعنی دو آدمیوں کے دست بدست مقابلے اور انتقام یا مواخذے کو بھی داخل کرتا ہے۔

سل فِستر مُوت شولینی کی رائے میں بھی جائز جنگ کے لیے وہی تین شرطیں ضروری ہیں جو اکویناس کے سینٹ ٹامس نے ضروری قرار دی تھیں۔ چنانچہ اس کی رائے میں ایک تو ایسا شخص ہونا چاہیے جو جنگ کے اعلان کا مجاز ہو۔ اور وہ اس نکتے پر اصرار کرتا ہے کہ سچ پوچھو تو صرف پوپ ہی ایک ایسا شخص ہے جس کے اوپر کوئی سردار نہیں پایا جاتا۔ لیکن وہ ایک رواج کو تسلیم کرلیتا ہے کہ "واقعے کی حد تک بعض قومیں کسی اور سردار کو نہیں مانتیں"۔ اسی لیے ایسی قومیں خود ہی جنگ کرنے کی مجاز ہیں۔

سولھویں صدی کے آغاز میں ایک تالیف لکھی گئی جو سنہ ۱۵۵۸ میں چھپی۔ اس کا عنوان یہ تھا "فن جنگ کے خصوصی نکات کی تعلیم بھری ہو کہ بڑی غرض وہ سب جو لوگوں کو آزوقہ اور اسباب جنگ مہیا کرنے کے لیے ضروری ہو نیز توپ خانے کا خرچ اور اس کی

---

[1] جان مایر (یعنس مایور) کی لاطینی کتاب "فیصلوں کی چوتھی کتاب پر مفید ترین سوالات" عنوان نمبر ۱۵، سوال نمبر (۲)۔

122

بارود گولی۔ اور یہ کتاب اعلیٰ اور معزز حکمران، کلیف کے حضور ڈیوک فلپ نے، جو رافشتائن کے بھی سردار ہیں، تیار اور تالیف کی اور نہایت ممتاز، نہایت اعلیٰ اور نہایت طاقتور حکمران شارل کی (جو اس نام والے پانچویں شخص ہیں، رومیوں کے شہنشاہ ہیں، جرمنی اور اسپین وغیرہ کے بادشاہ ہیں) خدمت میں پیش و حاضر کی گئی۔ اور آں جلالتمآب نے اس پر تا حال عمل کیا ہے اور وہی اسے اپنے نہایت عزیز نوجوان بھتیجوں اور دیگر شہزادوں کو عطا فرماتے ہیں۔[1] معلوم ہوتا ہے کہ لندن کے مخطوطے میں کتاب کا نام ٹھیک نہیں ہے کیونکہ متن کتاب میں مولف نے شہنشاہ مکس می لیان کا اس طور سے ذکر کیا ہے کہ گویا وہ زندہ ہو۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ شارل کے شہنشاہ ہونے سے پہلے یہ کتاب تالیف ہوئی۔ جہاں تک قانون جنگ کا تعلق ہے کلیف کے فلپ نے اس پر اس طور سے بحث کی ہے کہ آیا جنگ کرنا ضمیر کے مطابق ہے؟ اور وہ یہ ماننے سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے کہ جنگ صرف غیر مذہب والوں کے خلاف کی جانی چاہیے۔ اور ساتھ ہی وہ یہ مشورہ دیتا ہے کہ فتح کے بعد بیرحمی نہیں کرنی چاہیے۔

ماہرین قانون ملک، ماہرین قانون مذہبی، اور ماہرین دینیات کے خیالات کا خلاصہ بلجیم کے ایک قابل مولف نے مرتب کیا تھا جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں یعنی فلپ ویلانت۔ دائو ویر نے اسی مولف کے بیانات نہایت نامناسب طور سے چرائے تھے۔[2] مجرمانہ طرز عمل" نامی فرانسیسی کتاب کا مولف بیان کرتا ہے کہ جنگ کے جائز ہونے کے لیے چار شرطوں کا جمع ہونا ضروری ہے: پہلے

---

[1] ۔ برٹش میوزیم کے مخطوطات لانس ڈون نمبر ۸۰۴۔

[2] ۔ دوبوا کی فرانسیسی تالیف "فلپ ویلانت، علوم تاریخی کا پیغامبر" مطبوعہ ۱۹۳۱ء۔

ایسے لوگ جو جنگ کرنے کے قابل ہوں، دوسرے کوئی جائز سبب، تیسرے نیک نیتی اور چوتھے کسی برتر سردار کی اجازت۔

ویلانت نے خاص کر اطالوی مولفوں اور بالخصوص سوسے کے ہنری کے حوالے سے جنگ کی مختلف قسمیں گنائی ہیں۔ چنانچہ رومی جنگ اس کی رائے میں وہ ہوتی ہے جو کلیسا کے مفاد کے لیے کی جائے۔ قانونی جنگ وہ ہے جو باغیوں کے خلاف کی جائے۔ متکبرانہ جنگ وہ ہے جو باغی اپنے مقتدر اعلیٰ کے خلاف کریں۔ حلال جنگ وہ ہے جو شخصی مفاد کے لیے اور جائز بناء پر کی جائے۔ جسارت آمیز جنگ وہ ہے جو حق بجانب لوگوں کے خلاف کی جائے۔ خود پسندانہ جنگ بلا کسی وجہ کے اختیار کی جاتی ہے۔ اور آخر میں، ضروری جنگ وہ ہے جس کے لیے آدمی کو مجبور کردیا گیا ہو۔

فلانڈرس کا ایک اور مولف ہے جو ذکر کیے جانے کے قابل ہے۔ یہ یوسے خان کلشت ہوفے ہے جو نیوپورٹ میں پیدا ہوا تھا اور پارس میں نوار کالج کا پروفیسر تھا یہ امن کے پرجوش حامیوں میں سے تھا۔ اس نے اپنے خیالات کی سرگرمی اور قابلیت کے ساتھ تبلیغ کی۔ اگرچہ اس نے یہ بھی تسلیم کرلیا کہ ایسی صورتیں پیش آہی جاتی ہیں جن میں جنگ جائز ہو مگر وہ کوشش کرتا ہے کہ ان کی تکرار کم ہو جائے۔ اس کی تالیفوں میں سے ایک، معنے اور اسلوب، دونوں لحاظ سے بڑی دلپذیر ہے[1]۔

اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے امن کا پرچار کیا تھا، یہ کہ امن آسمان سے آتا ہے، یہ کہ جنگ اور خاص کر عیسائیوں کے مابین ہونے والی جنگ جہنم کی پیداوار ہے۔ کلشت ہوفے

[1] یوسے خان کلشت ہوفے کی لاطینی تالیف "رسالۂ جنگ و امن۔ عیسائی حکمرانوں کو جنگ کے جھگڑے کی جگہ امن کا پیام" مطبوعہ پارس ۱۵۲۳ء۔

مسلمانوں کا خطرہ دیکھ کر بوکھلا جاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ایشیا اور افریقہ جو کسی وقت عیسائی ہو گئے تھے، اب مسلمان ہو گئے ہیں۔ اسی طرح وہ ترکوں کی یورپ میں حملہ آوری اور پیش قدمی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور عیسائی حکمرانوں کو قسم دیتا ہے کہ اس طاقتور دشمن کے خلاف متحد ہو جائیں۔

لوتھر نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ترکوں سے لڑنا حقیقت میں خدا سے مقابلہ کرنا تھا، کیونکہ خدا ہی عیسائیوں کو سزا دینے کے لیے ان سے کام لے رہا تھا۔ کلشت ہو نے اس رائے کی تردید کرتا ہے اور بعد میں ان مولفوں نے بھی جو جنگ کے جواز کے مسئلے کی تحقیق کرنے لگے تھے، لوتھر کی اس رائے کو غلط قرار دیا تھا۔

ایک ہولناک زمانہ شروع ہوتا ہے اور میٹھے اور روادار نشأۃ ثانیہ کے بعد مذہبی معاملات میں عدم رواداری اور شدید سختیوں کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کلشت ہو نے اس کے متعلق ہاں یا نہ کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ اور بالآخر وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ملحدوں اور افتراق پسندوں سے جنگ کی جا سکتی ہے بشرطیکہ ایسے لوگ اپنے غلط خیالات کی حمایت کے لیے ہتیار ہاتھ میں لے لیں۔

فرانسوا آریا نے نہایت صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جنگ کا ناگزیر ہو چکا ہونا ضروری ہے۔ یہ امن کا پرجوش حامی تھا اور جنگ کے جواز کا بہت ہی افسوس کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے اس کی کوشش کرتا تھا کہ اس کو محدود اور کم کر دے۔ جنگ دو قسم کی ہوتی ہے: یا عمومی یا خصوصی۔ آخر الذکر کو جنگ کہنا ٹھیک نہیں۔ صرف پہلی قسم ہی، جو کسی اپنے سے بڑے سردار کو نہ ماننے والے حکمران کی اجازت سے کی گئی ہو، اصل میں جنگ ہے

اس نے (لاطینی میں) لکھا ہے کہ "امن اپنی خواہش پر حاصل کیا جا سکتا ہے اور جنگ اس کے برخلاف صرف ضرورت پر ہی ہونی چاہیے۔" نیز "امن کی تلاش اس لیے نہیں ہونی چاہیے کہ جنگ کی تیاری کی جائے بلکہ جنگ اس لیے کی جانی چاہیے کہ امن حاصل کیا جائے"[1] گویا سینٹ آگسٹائن کا خیال ہی پھر نئے سر سے دہرایا جاتا ہے۔

غزول فیرتی نے (لاطینی میں) "جنگ کے امور اور ضبط و نظم پر زرین رسالہ" تالیف کیا تھا۔ اس نے سپاہیوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ آسمانی فوج، جائز فوج اور مسلح فوج۔ جائز جنگ اس کی رائے میں صرف وہی ہے جس کا اعلان پوپ کی طرف سے کلیسا کو نہ ماننے والوں کے خلاف، کیا جائے خواہ وہ غیر عیسائی ہوں یا عیسائی جمہوریت کے دشمن ہوں۔ اسی طرح جائز جنگ وہ بھی ہے جس کا اعلان شہنشاہ کرے جو کہ پورے عالم کے دنیوی معاملات کا آقا ہے۔ اسی طرح وہ جنگ بھی جس کا اعلان وہ بادشاہ اور حکمران کریں جو اپنے اوپر کسی سردار کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ 124

الفونسو الفارینس نے رے ای رو کی ولادت پرتگال میں ہوئی تھی۔ نیپلز کی بادشاہت میں اس نے ملازمت اختیار کی اور وہاں کی چانسلری کا صدر اور مونوپولی کا اسقف بھی بن گیا۔ اس نے ۱۵۱۳ء میں ایک لاطینی کتاب "جائز اور ناجائز جنگ کے متعلق رسالہ" شایع کی۔ اس کی رائے میں جنگ یا تو مدافعت کے لیے ہوتی ہے یا اقدام کے لیے یا شہرت حاصل کرنے کے لیے۔ پہلی صورت قانون بین الممالک اور قانون ملک اور قانون الٰہی سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری صورت کا تعلق کسی

[1] فرانسوا آریا کی لاطینی کتاب "جنگ اور اس کے جواز پر رسالہ"، رسائل قانون عمومی جلد (۱۲)، ورق (۳۲۵) و مابعد۔

قانون سے نہیں لیکن بعض صورتوں میں اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ تیسری صورت قانون الٰہی کے تحت جائز ہو سکتی ہے مثال کے طور پر اس صورت میں جب غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کی جائے۔

سولھویں صدی میں اسپین کی حیثیت بہت بلند تھی۔ وہاں آٹھ صدیوں سے جنگ جاری تھی، جس دوران میں (۳۷۰۰) مرتبہ دشمن دین [یعنی مسلمانوں] سے لڑائیاں ہوتی رہی تھیں، اور اب وہ جنگ بالآخر عیسائی بادشاہت کی مکمل فتح پہ ختم ہوئی تھی۔ قومی وحدت ایک عظیم الشان تیزی سے حاصل ہو گئی۔ ۱۴۷۸ء میں یہاں متعدد و خود مختار بادشاہتیں تھیں۔ لیکن ۱۵۱۶ء سے بھی پہلے ان تمام اجزاء نے مل کر ایک کُل کی حیثیت اختیار کر لی۔ جہاں تک بیرون کا تعلق ہے، ایک ایسی توسیع ہوئی جس کی تاریخ میں کم نظیریں پائی جاتی ہیں۔ اٹلی کا شمال و جنوب، آرتوا، آزاد کونتی، نشیبی ممالک یعنی ہالینڈ، بالیار اور کناری کے جزائر ایک طرف اور دوسری طرف افریقی ساحل پر اہم مقامات مثلاً سیوطہ، وہران ایشیا میں فلپائن اور ملاقہ۔ نئی دنیا یعنی امریکہ میں نہایت وسیع علاقے یعنی مکسیکو، وسطی امریکہ، قنزفئلا، نیا غرناطہ، پیرو، چلی، کوبا، سینٹ ڈومنگو، جمائیکا ــــ یہ سب کیتھولک بادشاہوں کے مطیع ہو گئے تھے۔

اسپینی قوم بلا خوف تردید دنیا کی سب سے زیادہ جنگجو قوم تھی۔ اسی طرح وہ ان قوموں میں سے ایک تھی جو ذہنی ترقیوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھیں۔

وزیگاتھیوں کے عہد میں وہاں ذہنی آبیاری کسی طرح معدوم نہ تھی۔ لیکن وہ اس وقت پھلا پھولا جب عرب عناصر نے سائنس سے مدد لینی اور یہودی قابلیتوں سے کام لینا شروع کیا

پھر تو اس سے وہ درخشاں تحریک شروع ہوئی جس کا اثر پورے مغربی یورپ میں محسوس ہونے لگا۔ ممتاز مولف زناں یہ بتانے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کرتا کہ سائنس اور اشیائے جمیل کا ذوق دسویں صدی عیسوی میں دنیا کے اس خوش قسمت کونے یعنی اندلس میں استحکام حاصل کرچکا تھا اور وہاں ایک ایسی رواداری پائی جاتی تھی جس کی نظیر خود حالیہ زمانے میں بھی مشکل سے پیش کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس کے الفاظ میں "عیسائی، یہودی، مسلمان سب ایک ہی زبان بولتے تھے، ایک ہی نظمیں گاتے تھے اور ایک ہی ادبی اور علمی چیزوں کے مطالعے میں شریک رہتے تھے۔ وہ تمام بندشیں جو انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں، یہاں ٹوٹ گئی تھیں اور سب ہی مل کر متفقہ طور سے مشترکہ تمدن کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ قرطبہ کی مسجدیں، جہاں طلبہ کی تعداد ہزاروں سے ہوتی تھی، فلسفے اور سائنس کے مطالعے کی کارکرد مرکز بن گئی تھیں[1]"۔

قرون متوسط کی ذہنی تحریک میں سامی عنصر کا حصہ بہت قابل لحاظ ہے۔ عرب اور یہودی کچھ نئی چیزوں کے پیدا کرنے والے تو نہ تھے لیکن انھوں نے قدیم علوم کے پھیلانے میں بے انتہا حصہ لیا ہے۔ چنانچہ یہ انھیں کی عنایت سے ممکن ہوا کہ مغرب، یونانی فلسفے سے دوچار ہوا ہے۔ اور انھیں کی وجہ سے مغرب، طب میں بقراط و جالینوس کو، ریاضی میں اقلیدس کو، اور ہیئت میں بطلیموس کو جان سکا۔ انھوں نے ہی علم کلام میں منطق کی روانی کو مستحکم کیا جس کا آغاز بوئے تھے کی تالیفوں کے ترجمے سے ہوا تھا۔ اسی طرح انھوں نے ہی تصوف کی روانی کو

---

[1] زناں کی فرانسیسی تالیف "ابن رشد اور ابن رشدیت" صفحہ ۴۔

مستحکم کیا جس سے اسکاٹ ایری جنس نے روشناس کرایا تھا۔ اور جو اسکندریہ اور اثینا (ایتھنز) کی نئی فلاطونیت تک جا پہنچتا ہے۔[1]

عربوں نے اپنے وطن میں تو نیم خانہ بدوشانہ زندگی بسر کی تھی لیکن جب وہ وہاں سے نکلے تو وہ یونانی تمدن کے باقیات سے دو چار ہوئے۔

پانچویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں کلیسائے ایران نے کلیسائے روما سے پوری طرح تعلق منقطع کر لیا تھا۔ اس نے ایشیا میں ایک بار آور تبلیغ شروع کر دی تھی۔ یہ عیسائی جن کو ان کے مخالف نسطوری عیسائی کہتے ہیں اور جو خود اپنے آپ کو خالدیہ کے عیسائی کہتے ہیں، انھوں نے اپنے پھلتے پھولتے مدرسوں میں یونانی علم کا خزانہ محفوظ کر لیا تھا۔

دوسری طرف جب ۵۲۹ء میں اثینا کے فلاسفہ نے اپنے مدرسوں کو بند کیا جاتا دیکھا تو وہ ایران میں جا پناہ گزیں ہوئے، جہاں یہ توقع تھی کہ انھیں ایک ایسی رواداری میسر آسکے گی جو کلیسا اُن کو یورپ میں عطا کرنے سے انکار کرتا تھا۔ انھیں مایوس ہونا پڑا۔ اور اگرچہ ان کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ زیادہ زرخیز زمین نہ مل سکی لیکن پھر بھی وہ پوری طرح ضایع نہیں ہو گئے۔

126

یونانی کتابوں کے ترجمے مشرق کی اکثر زبانوں میں ہو گئے۔ عربی میں بھی، سریانی میں بھی، عبرانی میں بھی، فارسی میں بھی، خالدیائی میں بھی۔

یہودیوں نے اسکندریہ میں اتنی کچھ بڑی خدمتیں انجام دی تھیں۔ اب وہ یہ اہم کام انجام دینے لگے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے

---

[1] ڈنی کی فرانسیسی تالیف "زمانہ قدیم میں اخلاق کے متعلق نظریات اور تصورات کی تاریخ" جلد (۲)، صفحہ ۲۱۵ و مابعد۔ شارل ژوردین کی فرانسیسی تالیف "قرون متوسطہ کے متعلق تاریخی اور فلسفیانہ سیر"، صفحہ ۷۰ و مابعد۔

مابین واسطہ نہیں۔ رُناں اس نکتے پر بہت زور دیتا ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے جو فریضہ انجام دیا ہے اس کا کافی اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔[1]

جو عیسائی۔ بادشاہتیں رفتہ رفتہ نئے سر سے اسپین میں قایم ہونے لگیں، ان میں ترقی چاہے بہت بڑی نہ رہی ہو لیکن بہرحال وہ مسلسل جاری رہی۔ جو ادارے عربوں نے علوم کی ترقی کے لیے قایم کیے تھے، انھیں عام طور پر باقی رکھا گیا۔ چنانچہ قرطبہ، اشبیلیہ، بلنسیہ، اور مرسیہ کے مدرسے قایم رہے اور جلدی ہی ذہنی سرگرمی کے یہ بڑے مرکز، یعنی جامعات، نظر افروز ہونے لگ گئے۔ سالامانکا کا "مدرسۂ عمومی" تیرھویں صدی میں قایم ہو گیا۔

غرناطہ کے سقوط پر ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اسپین کا مستقبل درخشاں نظر آنے لگتا ہے۔ نظریہ آنے لگا تھا کہ یہ شریف علاقہ ایک ایسی راہ پر گامزن ہے جو اُسے تباہ نہ ہو سکنے والی قوت اور عظمت تک پہنچا دے گی۔ یہ راہ کیتھولک فردیناند نے مقرر کی تھی۔ لیکن عظمت و شہرت کا دور مختصر ہی رہا۔ اور سو سال سے بھی کم عرصے میں ایک زوال کے جراثیم نظر آنے لگ گئے جنھوں نے سترھویں صدی عیسوی میں نہایت شدت اختیار کر لی۔

عیسائی اسپین کی علمی ترقی کا سب سے بڑا دور فردیناند اور ایزابیلا کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ تعلیم کی حمایت کی جاتی ہے۔ ہر طرف مدرسے قایم کیے جاتے ہیں۔ جامعات میں سرقسطہ، بلنسیہ، اشبیلیہ، القلعہ اور سیں ٹاک (سینٹ جیمس) کی جامعات کا اضافہ ہو گیا۔ اِراسمَس نے اسپین کے اساتذہ کی یہ کہہ کر

---

[1] رُناں کی فرانسیسی تالیف "ابن رشد اور ابن رشدیت" صفحہ ۲۰۲۔ شارل ژوردین کی فرانسیسی تالیف "قرون متوسط کے متعلق تاریخی و فلسفیانہ سیر" صفحہ ۱۷ و مابعد۔

صحیح قدر کی ہے کہ آزادانہ علوم کے باعث تھوڑے ہی زمانہ میں ایک ایسی بار آور صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ اس سے نہ صرف خراج تحسین وصول کرنے کا موقع پیدا ہو گیا تھا، بلکہ وہ خود ان قوموں کے لیے بھی ایک نمونے کا کام دینے لگی جو نہایت روشن خیال تھیں۔

اگر صرف علم قانون بین الممالک سے ہی ہم محدود رہیں تو بھی یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سولھویں صدی میں اسپین، مغربی یورپ کے دیگر ممالک سے کس قدر آگے نکل چکا تھا۔ سیاسی صورت حال بے انتہا موافق مرام تھی۔ اور فرانسوا دے وی توریا اور دومی نیک سوتو اور متعدد دیگر ماہرین کی برتری کا راز اس وقت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے جب ہم اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ شاہیت نے وہاں عظیم الشان ترقی کی تھی، اور وہ یورپی معاملات میں بڑا حصہ لے رہی تھی، اور نیز ایسے اہم معاملات بہ کثرت پیش آرہے تھے جن کو حل کرنا تھا اور نئی دنیا کے مسائل نیز سفارتی جوڑ توڑ سے بھی سابقہ تھا۔

127

قانون جنگ اور قانون سفارت کے قدیم مولفوں میں سے متعدد یا تو فردیناند کے ہاں عہدہ دار تھے یا شارل کین کے ہاں یا فلپ دوم کے ہاں۔ اور مولفوں نے بھی اپنے خیالات پھیلائے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جامعات میں بہت بڑی آزاد خیالی کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ سیاست حاضرہ کے مسائل پر وہاں بحث ہوتی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ خود نظم و نسق کا کشوری ادارہ عقلمند الفونسو کے ان الفاظ سے متاثر ہو چکا تھا جو "سات ارکان" نامی مجموعۂ قانون کی تمہید میں درج ہیں۔ اس مجموعے کو "مدرسۂ عمومی" کے نام معنون کرتے ہوئے اس نے وہاں کے اساتذہ پر سوائے اس کے اور کوئی فریضہ عاید نہیں کیا کہ

اپنے شاگردوں کو اپنے معلومات سے آگاہ کریں اور ان کے سامنے کتابوں کو دیانتداری کے ساتھ اور علمیت کے ساتھ پڑھیں اور انھیں جہاں تک ممکن ہو اچھی طور سے سمجھائیں۔

امرندیوں یعنے امریکہ کے اصلی باشندوں کے متعلق اسپین میں بحث مباحثے کا ایک بڑا بازار گرم رہا۔ بارتیلمی ڈلاس کازاس، ژاں ڈکوے تے ڈو، انتوان رامی ریتس، ژاں خینیس دے سے پلفتے دا، فرانسوا دے تی توریا، ملچیور کانو، اور ڈومی نیک سوتو نے اس میں اہم حصہ لیا۔ یہ ناگزیر تھا کہ اس بحث میں قانون جنگ کے مسئلے سے بھی دوچار ہونا پڑے۔

ژاں خینیس دے سے پل فے دا، جو شارل کین کا اپنا پادری اور تاریخ نگار تھا، اور شہزادہ ڈون فلپ کا مودب تھا، وہ امرندیوں کے حقوق سے سختی اور بے رحمی کے ساتھ انکار کرتا تھا۔ سنہ ۱۵۳۳ء میں اس نے ایک کتاب تالیف کی جو روما میں اس (لاطینی) نام سے شایع ہوئی کہ "فوجی ضبط و نظم اور عیسائی مذہب کے تطابق پر مکالمہ۔ ایک عمومیت پسند کا لکھا ہوا ـــ" اس میں ایک مکالمہ تھا جو تین اشخاص میں ہوتا ہے: ایک جرمن، ایک اسپینی، ایک یونانی۔ اور بحث یہ ہوتی ہے کہ عیسائیت میں جنگ جائز ہے یا نہیں۔ کچھ عرصے بعد اس نے ایک دوسری لاطینی کتاب جائز جنگ کے اسباب کے متعلق مکالمہ، ایک عمومیت پسند کے مطابق"، لکھی لیکن اسے وہ باوجود کوششوں کے چھپوا نہ سکا کیونکہ حکومت کو خوف تھا کہ اس سے امرندیوں کے دشمنوں کو دلیلیں ہاتھ آئیں گی۔ لیکن اس کتاب کی بیشمار قلمی نقلیں مروج ہوگئیں[۱]۔

اسی آخرالذکر کتاب میں ژاں خینیس دے سے پل فے دا نے امن کی بڑی تعریف کی ہے اور اسباب جنگ سے بحث کی ہے

۱۔ یہ کتاب سے پل فے دا کے مجموعۂ تالیفات میں سنہ ۱۷۸۰ء میں بمقام مجریط (میڈرڈ) چھپی ہے۔

لیکن وہ اس ہیبتناک نتیجے پر پہنچتا ہے کہ بربریت پسندوں اور وحشیوں کو اس بات پر مجبور کیا جانا چاہیے کہ وہ ایک زیادہ انسانیت پرور اور زیادہ متمدن زندگی اختیار کریں اور بہتر اخلاق پیدا کریں۔ اور وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قوت کا استعمال جائز ہے۔ جنگ کے متعلق اس کا بیان تھا کہ جائز اور ناگزیر وجوہ کے بغیر جنگ نہیں کی جانی چاہیے۔ وہ یہ بھی اضافہ کرتا ہے کہ اچھے لوگ جنگ صرف اس لیے اختیار کریں کہ امن کی تلاش کی جائے۔ چنانچہ اس کے الفاظ ہیں "محض لوگوں کی پرہیزگاری اور تقویٰ یا مذہب یا خداترسی سے جائز اسباب جنگ نہیں پیدا ہو جاتے بلکہ [فریق ثانی کا] جرم اور مکروہ لالچ۔ اچھا حکمران نہ تو جسارت آمیز کام کر سکتا ہے اور نہ لالچ کے باعث۔ اسے تو مسالمانہ ذرایع ڈھونڈھنے چاہئیں اور کوئی چیز ناتجربہ کاری کے ہاتھوں نہ چھوڑ دینی چاہیے۔ لیکن اگر مسالمت کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہو جائیں، تو اسے جنگ کرنے سے نہ رکنا چاہیے۔" ژاں ژینیس دے سے پلفئے دا اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ اس صورت کو جائز وجہ جنگ قرار دیا جائے گا جب جبر و قوت کا مقابلہ کرنا مقصود ہو، چھنی ہوئی چیزیں واپس لینی ہوں، مفسدوں کے خلاف اپنے آپ کی حفاظت کرنی ہو، نیز کوئی اور ذریعہ نہ ہونے کی صورت میں ہتیار کے ذریعے سے ایسے لوگوں کو مطیع کرنا مقصود ہو جو اپنی طبیعی حالت کے باعث اسی لایق ہوں کہ دوسروں کی اطاعت کریں۔

اس زمانے کے بڑے نمایندوں میں سے ایک، بلکہ شاید سب سے بڑا نمایندہ فرانسوا دے ڤی توریا ہے جو ۱۵۲۶ء سے ۱۵۴۶ء تک جامعۂ سالامانکا میں دینیات کا پروفیسر تھا۔ یہ بیان کی وضاحت، اور استدلال کی صفائی کا بے نظیر استاد تھا اور ایسے

کم متکلمین ہوں گے جنھوں نے اس کی طرح، غلغلوں اور ثقیل طرزبیان سے بچے ہیں، کامیابی حاصل کی ہو یا ان ناگزیر فوائد سے استفادہ کیا ہو جو اس طور سے حاصل ہو سکتے ہیں کہ مفکر ہی [اپنے پڑھنے والوں کو] اپنے نظریوں کے متعلق جتنے اعتراضات ہو سکتے ہیں اور ان کے جو جواب دیے جا سکتے ہیں انھیں خود ہی شمار کرائے اور واقفیت کا موقع دے۔

فرانشواد ے ڤیتوریا اپنے جو درس املا کرایا کرتا تھا، وہ اس کے مرنے کے بعد چھپ گئے۔ یہ کتاب مختلف موضوعوں پر دیے ہوئے درسوں پر مشتمل ہے: مثلاً کلیسا کا اقتدار، کشوری اقتدار، پوپ اور مجلس شورائے مذہبی کا اقتدار، امرندی یعنے امریکہ کے اصلی باشندے، امرندیوں کے خلاف جنگ کا قانون، خیرات، شراب نوشی میں اعتدال، قتل انسان، مقدس اشیاء کی تجارت، جادو، عقل سے کام لینا۔ کتاب کا جو عمومی عنوان تھا وہ مختلف طباعتوں میں کچھ کچھ بدلتا رہا ہے۔ کبھی تو اس کا نام "تیرہ درس" نظر آتا ہے تو کبھی "گیارہ درس"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کلیسا کے اقتدار اور امرندیوں کے متعلقہ درس کی ذیلی تقسیم بعض کتابوں میں کی گئی ہے اور بعض کتابوں میں نہیں کی گئی ہے۔ جو درس "امرندیوں اور بربریت پسند علاقوں میں اسپینیوں کا قانون جنگ" کے متعلق ہیں وہ حقیقت میں طریقۂ بحث اور علم کے لحاظ سے شاہکار ہیں۔ ایک انگریز مولف نے ایک مرتبہ سلواریتس کی بڑی تالیفوں کا عربوں کے خوبصورت تعمیراتی کارناموں سے مقابلہ کیا ہے۔ حقیقت میں ہم یہاں ڤی توریا کے سلسلے میں بھی ایک یادگار تعمیری کارنامے سے دوچار ہوتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ آیا کام کی پختگی کی زیادہ تعریف کی جائے یا اس حسن و نزاکت کی جو اس کام میں نظر آتی ہے۔ یہ صفحے انسانیت کی محبت میں

ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب ہم انھیں پڑھتے ہیں تو ہمیں ایک حقیقی آزاد ذہنیت دکھائی دیتی ہے جس کی ہر ہر سطر وسیع اور عمیق مطالعے کا ثبوت ہمیا کرتی ہے۔ اور ہمیں یہ افسوس ہونے لگتا ہے کہ فرانسوا دے فیتوریا اور اس کے ممتاز شاگردوں کا قانون بین الممالک کے علم پر اور زیادہ اثر کیوں نہیں ہوا۔

قانون جنگ پر اس کے درس میں چار نکات سے بحث ہوئی ہے: آیا[1] عیسائی جنگ کر سکتے ہیں؟ جنگ[2] کا اعلان کرنے یا جنگ لڑنے کا اختیار کس کو حاصل ہے؟ جنگ[3] کے جائز وجوہ کیا کیا ہیں؟ دشمن[4] کے ساتھ کیا کیا کرنا جائز ہے؟ پہلے سوال کا جواب اثبات میں دیا گیا ہے۔ دوسرے سوال کا جو جواب دیا گیا ہے، اسے ہم پہلے ہی نقل کر چکے ہیں۔ تیسرے سوال پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور یہ ممتاز ڈومینیکی پادری یہ رائے دیتا ہے کہ مذہب کا اختلاف یا سلطنت کی توسیع کی خواہش یا شہرت حاصل کرنے کا ارادہ ہرگز جنگ کے جائز وجوہ نہیں ہو سکتے۔ جنگ کی صرف ایک ہی جائز وجہ ہو سکتی ہے اور وہ کسی ضرر کا پہنچنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سینٹ آگسٹائن کی بھی یہی رائے تھی۔ اکوینا س کے سینٹ ٹامس نے بھی یہی رائے دی تھی کہ "ان لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانا، جنھوں نے تمھارے ساتھ کوئی برائی نہ کی ہو، ہرگز جائز نہیں، کیوں کہ قانون قدرت کسی بے گناہ کے قتل سے روکتا ہے۔ لیکن ہر قسم کی مضرت رسیدگی سے جنگ درست نہیں ہو جاتی۔ جنگ سے نازک اور بیرحمانہ نتائج پیدا ہو جاتے ہیں اسی لیے جنگ اس صورت میں نہیں کی جا سکتی جب صرف معمولی قسم کی مضرت پہنچی ہو۔ مضرت کی مقدار کے تناسب ہی سے سزا دی جا سکتی ہے۔"

فرانسوا دے فی توریا کے شاگرد ڈومی نیک سوتو نے اپنے استاد

کے ترقی دیے ہوئے قاعدوں کی کوئی تردید نہیں کی۔

پیئیر بلی نے اپنے لاطینی رسالے "متعلق بہ امور فوج وجنگ" میں جنگ کی بنیاد، جنگ کے وجوہ، دشمن سے ہمارے اسباب کی بازیابی، قیدیوں، صلح، جنگ سے پیدا ہونے والی بعض صورتوں سپاہیوں، فوجی سفرتوں، اجازت نامۂ سفر، امن، اور یرغمالوں سے بحث کی ہے۔ اس کا ذہن بہت ہی سلجھا ہوا اور باقاعدگی پسند تھا۔ اور اس نے اپنے زمانے میں جو نظریے پائے جاتے تھے اور ان پر جس حد تک عمل ہوتا تھا، ان کا نہایت صحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ خود نفس جنگ کے متعلق اس نے وہی تقسیم نقل کردی ہے جو سوسے کے ہنری اور بالدے کے حواشی میں دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "تمام اچھے لوگوں کی رائے ہے کہ کسی نازک وجہ کے بغیر جنگیں نہیں کی جانی چاہئیں اور یہ کہ نازک وجوہ ہی کو جائز اور ضروری وجوہ تصور کیا جا سکتا ہے۔"

شاید ایک اور مولف کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے جو انتونیو دے برناردی ہے۔ یہ کاسرت کا بشپ تھا اور جنتی لیس نے اپنی لاطینی کتاب "قانون جنگ" میں متعدد موقعوں پر اس کا حوالہ دیا ہے اور اسے وہ لاطینی میں "ہمارا علامہ کاسرتانس" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔ اس مولف نے ایک لاطینی کتاب "مبارزت کا خاتمہ" تالیف کی جس میں وہ خاص کر اس امر سے بحث کرتا ہے کہ آیا جنگ کے جواز سے مبارزت (ڈوئل) کے جواز کا قیاس کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کی رائے میں اس کا جواب اثبات میں ہے۔ اور وہ بیان کرتا ہے کہ جنگ ہی کی طرح مبارزت بھی اسی صورت میں جائز ہو سکتی ہے جب کہ حق کو تسلیم کروانے کا کوئی اور ذریعہ نہ رہا ہو[1]۔

---

[1] گومی دے ٹوسی ناتو کا فرانسیسی مضمون "انتوان برناردی، کاسرت کا بشپ"

لائیبنا کے ژاک دے کو اُردقیاس نے جو سیگوقیا کا بشپ تھا، جنگ کے جائز وجوہ میں حسب ذیل چیزوں کا ذکر کیا ہے: وطن کی مدافعت، مضرت کا انتقام، باغیوں کی سزادہی، چھنے ہوئے سامان کی بازیابی، بے ضرر آمد و رفت کی اجازت سے انکار۔[ـه] آیالا اور جنتی لیس بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔

اول الذکر نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا ہے کہ آیا جنگ کبھی جائز بھی ہو سکتی ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اس مسئلے میں اختلاف رائے رہا ہے، لیکن بے وجہ۔ عقلمند شخص جنگ کے ضروری ہونے پر افسوس ہی کرے گا اور وہ بہر صورت عمومی مفاد ہی کے لیے جنگ کرے گا۔ آیالا نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ پہلے مفتوحوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس طرح غلام بنانا نہ صرف قوم کے لیے مفید ہے بلکہ خود ان لوگوں کے لیے بھی جنھیں یہ سزا دی جائے اور جو مزید ضرر رسانی سے روک دیے جائیں۔

وجوہ جنگ کے سلسلے میں آیالا، حکومت اور اس کی رعایا اور ان کی جائداد، اور ان کے حلیفوں کی مدافعت کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح کسی مضرت کے انتقام اور دشمن کے چھینے ہوئے سامان کی بازیابی کو بھی۔ لیکن وہ یہ بھی بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ سب سے زیادہ جائز جنگ صرف وہی ہے جو حکمران اپنی باغی رعایا کے خلاف کرے۔ اس کے زمانے کے جو حالات تھے وہ اس کے نظریے کی اس خصوصیت کا اصلی باعث ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: جو فرانسیسی رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی جلد (۱۶) میں چھپا دیکھو صفحہ ۵۹۹۔

ـه لائیبنا کے ژاک دے کو اُردقیاس کے لاطینی "مجموعۂ تالیفات" میں اس قاعدے کی تشریح کہ "جرم [یا گناہ] کے پیچھے قانونی قواعد" د ۹۔

آیالا اسپین کا باشندہ تھا اور شاہ پسند جماعت ہی سے اس کا خاندان اور اس کا مفاد پوری طرح وابستہ تھے۔ یہ الگزانڈر فارنیس کا شخصی دوست تھا۔ سرگرم کیتھولک تھا اور خاص کر علاقۂ آرمینج کے حکمران اور اس کے ساتھیوں سے تعلق رکھتا تھا۔ روشن خیال بلجیمیوں کی نظروں میں یہی لوگ مذہبی اور سیاسی آزادی کی مقدس تحریک کے نمایندے تھے۔ اور تاریخ نے بھی اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ لیکن دوسرے فلپ کی فوج کے صدر محاسب کی نظروں میں یہ لوگ باغی تھے۔ چنانچہ جب آخرالذکر شخص نے ان پر حملہ کیا اور قوانین جنگ کے سلسلے میں ان کے لیے کسی بھی قسم کے حق ہونے کی مخالفت کی، تو وہ اسی بناء پر تھا۔ بغاوت ایک سخت اور نازک قسم کی مضرت ہے جو خدا کے خلاف عمل میں لائی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر قسم کا اقتدار خدا ہی کی طرف سے حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ سینٹ پاول کا قول ہے۔ اس لیے جو مضرت حکمران کو پہنچائی جائے وہ گویا خدا کے خلاف ہوتی ہے۔ باغی کبھی دشمن کے مماثل نہیں ہوسکتا۔ جو بھی باغی سے مقابلہ کرتا ہے وہ جنگ سے کہیں زیادہ عام اختیار سماعت کے حق کو کام میں لاتا ہے۔ باغیوں کو اس کا حق نہیں ہے کہ حقوق جنگ، گرفتاری، اور بازیابی اسباب کا مطالبہ کرسکیں، جس طرح کہ بحری اور بری ڈاکوؤں کو ان حقوق کے مطالبے کا حق نہیں ہوتا۔ لیکن باغیوں کے خلاف لڑنے والوں کو یہ حقوق ضرور حاصل رہتے ہیں[۵]۔ اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ کسی شخص کو الیین کی بات پر اعتراض کا حق نہیں کہ خانہ جنگیوں کے

---

[۵] - آیالا کی لاطینی تالیف "حقوق وواجبات جنگ اور فوجی ضبط ونظم" کتاب اول باب دوم ۱۵ و ۲۳۔

سلسلے میں فریقین کو ایک دوسرے کا دشمن نہیں خیال کیا جاسکتا۔ اسپینی قوانین میں جو احکام ہیں، ان کا اس سلسلے میں استفادہ نہیں کیا جاسکتا کہ خانہ جنگی میں جو مال چھینا جائے اس کا سوگنا واپس دینا پڑے گا کیونکہ اس صورت میں صرف یہی ایک بات صادق نہیں آتی کہ جس وقت شہنشاہت کا جاہ و جلال خطرے میں ہو اور سلطنت کی تباہی کی سازش ہوئی ہو تو اس زمانے میں جھگڑے کیسے جاری رہے ہوں۔ رعایا کی نافرمانی یعنی بغاوت ایک نہایت نازک جرم ہے اور اسے الحاد کے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے۔" ان تمہیدوں کا شایان شان نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ "ظالم کو قتل کرنا جائز ہے جب کہ اس نے اقتدار کسی جابرانہ اور ناجائز طریقے سے حاصل کرلیا ہو بشرطیکہ اس ظلم کا انسداد کسی اور طور سے نہ ہوسکتا ہو۔"

اس آخرالذکر جملے کے باعث آیالا کو اس قدیم نظریے کے حامیوں میں شامل کیا جاتا ہے، جو "ظلم کش" کے نام سے مشہور ہیں[1] لیکن یہ غلطی ہے۔ خود اس نے اپنے خیال کی توضیح کردی ہے۔ وہ اس مذہبی حکم کا حوالہ دیتا ہے جس کے مطابق شہر کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی نے ۱۴۱۵ء میں گرسن کی کوشش سے اس مشہور نظریے کو غلط قرار دیا تھا جس کا کوردلی فرقے کا ایک فرانسکائی پادری (ژاں پتی) حامی تھا۔ آیالا نے (لاطینی میں) یہ بھی لکھا ہے کہ "کوئی جائز حکمران، چاہے وہ بے رحم اور ظالم ہی کیوں نہ ہو، غاصب نہیں کہلا سکتا۔" رعایا پر ہر طرح کی حکمرانی اور ہر طرح کا اختیار فرمانروا کو حاصل

[1] لیکی کی انگریزی تالیف "یورپ میں معقولیت پسندی کے عروج و اثرات کی تاریخ" جلد (۲) صفحہ ۱۶۳۔

ہوتا ہے۔ اسی لیے رعایا اپنے فرمانروا کے متعلق حکم لگانے کی مجاز نہیں۔ بے شبہ پوپ کسی فرمانروا کو اس پر مجبور کر سکتا ہے کہ وہ انصاف کرے کیونکہ پوپ، زمین پر، خدا کی جگہ ہوتا ہے اور اسے دنیاوی و روحانی دہری تلوار حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر عیسائیت کے مفاد کا تقاضا ہو تو پوپ بادشاہوں کو معزول بھی کر سکتا ہے۔ اور اگر اسی قسم کا اختیار رعایا کو عطا کیا جائے، جیسا کہ بعض لوگوں نے کیا ہے، تو وہ مہمل اور غیر منصفانہ بات ہوگی، اور اس سے مملکت تہ و بالا ہو جائے گی۔

حقیقت میں آیالا ان سیاسی خیال آرائیوں کی مخالفت کرتا ہے جو کالؔ ڈی نیت اور خاص کر فرانسیسی احتجاجیت (پروٹسٹنٹ تحریک) سینٹ بارتیلمی کے زمانے سے اختیار کرنے لگی تھیں۔ اور آیالا نے اوت ماں کی تالیف "فرانکو گالیا" کی تنقید کی ہے اور شاہ کستی کو بہت برا فعل بتایا ہے۔ لیکن یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اس کا مقصد اصل میں یہ ہے کہ بغاوت کو کچلنے کا جواز زیادہ زور کے ساتھ نمایاں ہو جائے کیونکہ آیالا نے جس ظلم کا ذکر کیا ہے اس سے اس کی مراد باغیوں کے سرو ار سے ہوتی ہے۔ وہ جو نظریے پیش کرتا ہے، ان سے علمی غرض و غایت وابستہ ہوتی ہے۔ ایک فرانسیسی رسالہ "جنگ کے حقوق اور واجبات اور فوجی ضبط و نظم" ایک پڑاؤ میں جو لُوَر نے کے سامنے ڈالا گیا تھا، ۳۱ اکتوبر ۱۵۸۱ء کو لکھا گیا تھا۔ ۱۵ جون ۱۵۸۰ء کو الگزانڈر فارنیس نے وہ ظالمانہ حکمنامہ شایع کیا تھا جس کی رو سے آرینج کے حکمران کے سر کے لیے قیمت لگا دی گئی تھی۔ ۲۶ جولائی ۱۵۸۱ء کو ملک کے تینوں طبقات کی مجلس نمایندگان نے باضابطہ طور سے یہ اعلان کیا تھا کہ ان کے خراب حکمران سے اقتدارات شاہانہ چھین لیے گئے ہیں۔

جب اس کے خلاف فیصلہ صادر ہو گیا اور اسے باغی قرار دیدیا گیا تو اس خاموش حکمران کو ان اصول کے شکنجے میں پھنسنا پڑا جو آیالا نے مرتب کیے تھے۔ اور اس طرح آیالا نے مفت میں یہ فریضہ انجام دیا کہ ایک بدترین جرم کی تائید کا پیشگی ہی انتظام کر دے۔ چنانچہ اس نے قانون کے متعلق ایک کتاب میں بالتازار ژیرار کے اس نفرت انگیز فعل کی بڑی ستایش کی ہے۔

البیری کُس جنتی لیس کی مشہور (لاطینی) کتاب "قانون جنگ" اور اس کی دیگر تالیفیں حقیقت میں قانون بین الممالک کی تاریخ میں ایک اہم حصہ رکھتی ہیں اور اگر عام طور پر گروتیوس کے مقابلے میں وسعت نظری میں جنتی لیس کا درجہ گھٹا ہوا ہے تو ایک اور نقطۂ نظر سے جنتی لیس کا درجہ بڑھا ہوا بھی ہے۔ چنانچہ وہ سیاسی دائرے میں پیدا ہونے والے واقعات کی احتیاط سے تحقیق کرتا ہے۔ ہم نے اپنی ایک اور تالیف میں[1] اسکلوپس کے اس قول کا حوالہ دیا ہے کہ جنتی لیس کی تالیف اصل میں سولھویں صدی عیسوی کے واقعات کی قانونی تشریح ہے۔ یہ قول ٹھیک ہے اور جیسا کہ اسکلوپس نے بیان کیا ہے جنتی لیس کی کتاب میں وہ تمام بڑے بڑے اختلافات جو شارل کینٹ اور فرانسوا اول میں یا نشیبستان (یعنی ہالینڈ) اور اسپین میں یا اٹلی اور اس پر ظلم کرنے والوں میں پیش آئے تھے، ان سب کی قانون عمومی کے نقطۂ نظر سے جانچ کی گئی ہے۔[2]

جنتی لیس کی کتاب "قانون جنگ" کے حصۂ اول یعنی

---

[1] - نیس کی فرانسیسی تالیف "قانون جنگ اور گروتیوس کے پیشرو" صفحہ ۱۸۸۔

[2] - پروفیسر ٹامس ارسکن ہالینڈ نے جنتی لیس کے متعلق انگریزی میں جو "افتتاحیہ لکچر" دیا تھا، اس کا ہمارے لیے خاص طور پر ذکر کرنا ضروری ہے۔ نیز جنتی لیس کی

تقریباً چوتھائی کتاب میں وجوہ جنگ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ وجوہ تین اقسام پر مشتمل ہیں یعنی وجوہ ربّانی، وجوہ فطری اور وجوہ انسانی۔ جہاں تک ربّانی وجوہ کا تعلق ہے، جنتی لیس کے خیالات کا ان کے متعلق ہم آیندہ ذکر کریں گے۔

جہاں تک وجوہ فطری کا تعلق ہے جنتی لیس کی رائے میں ایسی کوئی جنگیں نہیں پائی جاتیں جن کے متعلق فطرت کا تقاضا ہو، سوائے اس کے کہ ایسی جنگ کے شروع کرنے میں آدمی فطرت کی گویا پیروی کرتا ہے اور اس کو اپنا رہنما بناتا ہے اور بعض ایسی صورتیں پیش آتی ہیں جب جنگ اس لیے کرنی پڑتی ہے کہ فریق مخالف ایک ایسی چیز کے استعمال سے روکتا اور جھگڑتا ہے جو فطری طور سے حاصل ہوتی ہے۔ وجوہ فطری میں اولاً "ضروری مدافعت" اور "مفید مدافعت" نیز "دیانتدارانہ مدافعت" شامل ہیں۔ اس طور سے جنگ یا تو ضرورت کے لیے کی جاتی ہے یا فائدے کے لیے یا نیک نیتی اور دیانتداری سے۔ جہاں تک ضرورت کے تحت جنگ کرنے کا تعلق ہے، اس کا منشا واضح ہے۔ مفید مدافعت اس وقت سمجھی جاتی ہے جب کسی کو اس کا ڈر ہو کہ خود اسی پر حملہ کر دیا جائے گا۔ دیانتدارانہ مدافعت اس وقت سمجھی جاتی ہے جب دوسروں کی خاطر جنگ کی جائے اور دوسروں کی حمایت و حفاظت پیش نظر ہو۔ وجوہ فطری کی دوسری قسم میں وہ صورتیں داخل ہوتی ہیں جب جنگ ایک ایسی چیز کے لیے کی جائے جو فطرت نے تو عطا کی ہو اور انسان اس میں آڑے آتے ہوں۔ چنانچہ اس کے (لاطینی) الفاظ میں "جب جنگ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ لاطینی کتاب "قانون جنگ" کے اس عمدہ اڈیشن کا بھی جو آکسفورڈ کے اس پروفیسر نے شایع کیا تھا۔

اس لیے پیش آئے کہ فطرت نے تو عطا کیا تھا اور انسانوں نے لینے دینے سے انکار کیا ہو"۔ اس سلسلے میں جنتی لیس نے بے ضرر گزر سکنے، بحری سفر کر سکنے اور تجارتی کاروبار کر سکنے کا ذکر کیا ہے۔

وجوہ انسانی اس وقت پیش آتے ہیں جب قانون کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔ جنتی لیس کہتا ہے کہ ایسی صورتیں بہت سی ہیں۔

جنتی لیس کے بعد سے ہمارے اس علم نے انگلستان میں ترقی کرنی شروع کی۔ بہت سی کتابیں شایع ہونے لگیں۔ اور اس کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ جو کتابیں صرف قانون جنگ سے متعلق تھیں ان کے علاوہ ایسے رسالے بھی شایع ہونے لگے جو قانون سفارت اور بین الممالک بحری قانون سے متعلق تھے۔

تین کتابیں جو قانون جنگ کے متعلق تھیں، یکے بعد دیگرے ۱۵۸۹ء، ۱۵۹۱ء اور ۱۵۹۳ء میں شایع ہوئیں۔ ان میں سے پہلی دو تو ترجمہ تھیں، اور آخری ایک ذاتی تالیف تھی۔ بے شبہہ اس زمانے میں انگریزی قوم میں جو جذبات سرایت کیے ہوئے تھے وہ ان تالیفوں میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان تالیفوں کا [لاطینی کی جگہ] عوام الناس کی زبان میں لکھا جانا بھی اس کو ثابت کرسکتا ہے۔ لیکن ان تالیفوں کے وجود میں آنے کی ایک اور مساوی اہم وجہ یہ بھی تھی کہ جنتی لیس نے ان کے لیے راستہ کھول دیا تھا۔

بلحاظ تاریخ، ان تالیفوں میں سے جو سب سے مقدم ہے اس کا انگریزی نام "جنگوں کی ہدایتیں" ہے۔ یہ جس فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے اس کا نام "جنگ کرنے کے متعلق ہدایتیں" تھا۔ یہ سب سے پہلے ۱۵۴۸ء میں شایع ہوئی اور اسے اس کے اصل مولف یعنی پاڈیا کے ریموں بیکاری نے جو فرک ڈو کا باڈرن تھا، مشہور جنگجو اور سیاست داں گیوم دو بلے کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

اس کا ترجمہ ایک انگریز معزز شخص پال آلفٹ نے کیا تھا۔ دیباچے میں مولف نے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ جنگ جائز ہے۔ لیکن اس پر چند پابندیاں عاید کی ہیں ۔ چنانچہ اسی سلسلے میں وہ ان عیسائی قوموں کو جوش و خروش سے ملامت کرتا ہے جنھوں نے اپنے ان مشرقی بھائیوں کو کوئی مدد نہ دی جن پر ترکوں نے حملہ کر دیا تھا ۔ مولف غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کو سب سے زیادہ جائز اور منصفانہ قرار دیتا ہے اور وہ عیسائیوں کے خلاف جنگ کو اس بنا پر مردود قرار دیتا ہے کہ اس سے دشمن دین کو خوش ہونے اور فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ وہ ایسی جنگ کو غداری قرار دیتا ہے۔ غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کے جائز ہونے کے لیے ایک شرط ہے ۔ اور وہ یہ کہ ایسی جنگ اس لیے ناگزیر ہو گئی ہو کہ مسلمانوں کے حملے کا خطرہ دور کرنا مقصود ہو ۔ ایسی جنگ محض مذہب کے پرچار کے مقصد سے کوئی جائز نہیں ۔ ایک اور جنگ بھی درست ہو سکتی ہے ۔ وہ یہ کہ وطن کو بچانے کے لیے جنگ کی جائے ۔ اس مولف نے بیان کیا ہے کہ بہر حال وجوہ جنگ کی ہر صورت میں لڑائیاں اس طور سے لڑی جانی چاہییں کہ جہاں تک ہو سکے ان سے تباہی اور خونریزی کم سے کم عمل میں آئے ۔

برنارڈ لوک کی فرانسیسی تالیف کا ایک اور ترجمہ جو جان ایلیٹ نے کیا تھا، سنہ ۱۵۱۰ء میں شایع ہوا ۔ اس کا انگریزی نام "قانون اور مبارزت یا دست بدست جنگ پر مقالہ" ہے۔ مانوی مذہب اور ڈوناتی مذہب کے مطابق کسی شخص کا محض اس کے عقائد کی بنا پر پیچھا نہیں کیا جانا چاہیے ۔ ان خیالات پر اس کتاب میں تنقید کی گئی ہے اور مولف کی رائے میں حکمران اپنی ملحد رعایا کو سزا دے سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ

جنگ بھی کر سکتا ہے لیکن اسی صورت میں جب کہ نازک وجوہ تحریک پیدا ہو گئے ہوں۔ امن کو برقرار رکھنا اصلی مقصد رہے۔ اور بہر صورت اس کی اجازت نہیں کہ دوسروں کا مال چھیننے کے لیے ہتھیار اٹھائے جائیں۔

سٹ کلف کی کتاب جس کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں، اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ۱۵۹۳ء میں لندن میں چھپی اور اس میں (۳۴۲) صفحے ہیں۔ اس کا پورا انگریزی نام یہ ہے "ہتیاروں کا چلانا اور استعمال کرنا اور ہتیاروں کے قوانین جو نہایت بہادر اور ماہر کپتانوں کے طرز عمل سے ماخوذ ہیں اور جن کی قدیم اور جدید ہر دو قسم کی مثالوں اور نظریوں سے توثیق ہوتی ہے۔" اس کتاب میں (۲۱) باب ہیں۔

ماتھیوسٹ کلف ایک ممتاز ماہر دینیات اور مناظرہ باز تھا، جس کا ثبوت ہمیں اس کے ان جھگڑوں سے ملتا ہے جو بلارمین اور پارسنس اور گارنٹ سے پیش آئے تھے۔ یہ قانون روما کا بھی ماہر تھا۔ اس کا نام "ڈاکٹرس کامنس" کی کالج کے اساتذہ کی فہرست میں بھی نظر آتا ہے اور وہ اس کالج کے مدرسین میں بھی شامل تھا جو جیمس اول نے قایم کیا تھا[1]۔ اس کی تالیف

[1] جیمس اول نے چلسی میں ایک کالج قایم کیا تھا جہاں مباحثوں کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ ماہرین دینیات کو یہاں تعلیم پانی پڑتی تھی اور رومن کیتھولک خیالات کے ماہرین دینیات سے جو جھگڑے تھے ان کا مطالعہ کرنا اور ان کا جواب لکھنا پڑتا تھا۔ اس کالج کے قایم کرنے کی ایک بڑی وجہ فلرنے یہ بیان کی ہے کہ جس طرح حضرت سلیمانؑ نے اپنے لوگوں کو کسی ایسے کام میں لگانا پسند نہیں کیا جس کا تعلق عمارات کے بنانے سے ہو اور اس کی وجہ مستند طور سے یہ بیان کیجاتی ہے کہ یہ لوگ حضرت سلیمانؑ کے اہل جنگ تھے [اور سپاہی کا کام معماری نہیں] =

35

سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا عالم شخص تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ = اسی طرح رومن کیتھولک کلیسا اپنے ماننے والوں پر ہرگز یہ بوجھ نہیں لادتا کہ وعظ کریں یا کسی گرجا کے حدود عمل کی فکروں میں مبتلا ہوں بلکہ وہ ان کو صرف مباحثہ بازی کی تعلیم میں لگائے رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف انگلستان میں ایک ہی شخص پر یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ سبق بھی پڑھائے، وعظ بھی کرے، عقائد بھی سکھائے، مناظرے بھی کرے۔ مذہبی مراسم تقدیس بھی انجام دے، وغیرہ۔ طلبائے دینیات کے علاوہ چل سی کے کالج میں کم سے کم دو اچھے مورخ بھی ہوتے تھے تاکہ آیندہ نسلوں کے لیے مملکت اور کلیسا ہر دو کے یادگار ترین واقعات کی روایت پہنچا سکیں۔

یہاں کے صدر اور دیگر اساتذہ کی نامزدگی بادشاہ نے ۸ مئی سنہ ۱۶۱۰ء کو کی۔ اور ماتھیو سٹ کلف جو اکزے ٹر کا ڈیکن یعنی بڑا پادری تھا، اس کالج کا صدر بنایا گیا۔ ولیم کاڈمن یہاں کے مورخوں میں سے ایک تھا۔ سنہ ۱۶۱۱ء میں بادشاہ نے ڈومی نیس کے مارک انتوان کو جو سابق میں اِسپالاترو کا آرک بشپ اور ونڈسر کا ڈیکن تھا، یہاں کا استاد مقرر کیا۔

یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے مختلف اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ بادشاہ نے کمزور تائید کی یا بشپوں اور یونیورسٹیوں میں جھگڑے ہو گئے یا اساتذہ کی نااہلی ـــ صرف سٹ کلف ہی لائق تھا۔ یا پارلیمان کے بعض ارکان کا اختلاف جنھیں ڈر ہونے لگا کہ کہیں یہ کالج دربار شاہی اور وہاں کی دینیات کا ضرورت سے زیادہ گرویدہ نہ ہو جائے، اور یہاں کی لکھی ہوئی تاریخ کہیں ضرورت سے زیادہ بادشاہ کے موافق نہ لکھ لی جائے۔

یاد رہے کہ آٹھویں ہنری نے "انس آف کورٹ" کے نمونے پر ایک مدرسہ قایم کرنا چاہا تھا جہاں قانون اور صاف و صحیح لاطینی اور فرانسیسی زبان کی تعلیم دی جا سکے۔ بادشاہ چاہتا تھا کہ اجنبی ممالک میں بھیجنے کے لیے جو ملازم درکار تھے ان کو یہاں تیار کیا جائے ایک یا دو طلبہ سفیروں کے ساتھ

سٹ کلف جنگ کے جائز ہونے کے مسئلے پر بحث کرنے میں اپنے کو الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ جو لوگ اس کے جواز سے انکار کرتے تھے وہ سٹ کلف کی رائے میں مذہب و سیاست کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ لیکن سٹ کلف جنگ کے وجوہ کے متعلق بڑی خوشی سے تفصیلی بحث کرتا ہے۔ اس نے جو وجوہ گنائے ہیں وہ کافی طویل ہیں۔ وجوہ جنگ میں اس نے حسب ذیل چیزوں کو بھی داخل کیا ہے: ملک کی مدافعت، سچے مذہب کی حمایت، جائداد کی حفاظت، لٹیروں اور بحری ڈاکوؤں کے حملے کا مقابلہ، ناجائز طور سے چھینی ہوئی جائداد پر حق جتانا، ہموطنوں کے خلاف عمل میں لائے ہوئے افعال ناجائز، سفیروں کے حقوق کی خلاف ورزی، حلیفوں کی حفاظت، معاہدہ شکنی، ہمارے دشمن کو مدد دی جانی، نیز ایک اور وجہ جو چند ہی روز سے ظاہر ہوئی تھی۔ یعنی (یورپ کی سلطنتوں کی قوت میں) توازن برقرار رکھنا۔

جہاں تک جائز جنگ کا تعلق ہے سٹ کلف بھی مروجہ نظریہ قبول کر لیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جنگ وہی لوگ شروع کریں جن کو اس کا اختیار حاصل ہو۔ یہ کہ اولاً چھینی ہوئی چیز کی واپسی یا تلافی کا مطالبہ کر لیا گیا ہو اور یہ کہ وحشت وبربریت کام میں نہ لائی جائے۔

جنگ کرنے میں بے رحمی نہیں برتنی چاہیے۔ اور یہ مولف

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: بھیجے جا سکیں۔ دو طلبا اس بیرونی ملک کی تاریخ یا حالات لکھ سکیں۔ اور واقعات سے باخبر رکھ سکیں۔ نیز براعظم یورپ میں اگر کوئی جنگ چھڑے تو ایسے لوگوں کو بھیجنا ہوتا جو رپورٹ کر سکیں۔

یاد دلاتا ہے کہ اسپینی قانون جنگ کے مطابق عورتیں، بچے اور بوڑھے شہروں کی لوٹ کے وقت سپاہی کی تندی سے محفوظ سمجھے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں سٹ کلف نے چوتھے ہنری کی تعریف کی ہے کیوں کہ اس نے پارکیس سے غریبوں اور بیماروں کو باہر نکل جانے کی اجازت دے دی تھی جب کہ اس کی فوجوں نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا تھا۔

اس کتاب میں ایک اصول بیان کیا گیا ہے، جو اُن تصورات کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے جن کی ہم تحلیل کر رہے ہیں۔ اور وہ (انگریزی میں) یہ ہے: "وہی جنگیں منصفانہ اور جائز ہیں جو نہ صرف مقتدر اعلیٰ حکمران کی طرف سے کی جائیں بلکہ جائز اور منصفانہ وجوہ کے لیے ہوں۔ اسی طرح مطابق قاعدہ ان کا معینہ صورتوں میں اعلان ہوا ہو اور اعتدال کے ساتھ وہ جنگیں لڑی گئی ہوں اور ان کا منشا یہ ہو کہ انصاف عمل میں لایا جائے اور امن حاصل کیا جائے"۔۔۔ غرض مقتدر اعلیٰ کا حکم ہو، جائز وجوہ ہوں، قانون کے مطابق اعلان ہوا ہو، اس کے عمل میں لائے جانے میں اعتدال برتا گیا ہو اور مقصد اعلیٰ امن ہو، یہ وہ شرطیں ہیں جو کسی جنگ کو جائز بنانے کے لیے مطلوب ہوتی ہیں۔

اس تالیف کے دوران میں مولف، مال غنیمت اور قیدیوں کے متعلق تفصیلات میں پڑ جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں اسپینی قواعد کا ذکر کرتا ہے۔ وہ سپہ سالار کے صفات پر بحث کرتا ہے اور چند ایسے عملی تجاویز پیش کرتا ہے جن کا منشا یہ ہے کہ زنگر ولوٹں کو بھرتی کرنے میں ہم قوموں کو ترجیح دی جانی چاہیے اور سپاہیوں کی تنخواہ باقاعدگی سے دی جانی چاہیے۔ کتاب کے آخر میں وہ فوجی ہدایت ناموں کا

ایک نمونہ دیتا ہے جو بری اور بحری دونوں فوجوں کے لیے حالت امن اور حالت جنگ میں رہنمائی کرے۔

تقریباً اسی زمانے میں مشہور سر والٹر رالے نے ایک کافی الجھا ہوا مقالہ مرتب کیا جس میں اس نے خاص کر جنگ سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کا نام کافی لمبا ہے اور اس سے کتاب کے موضوع کی وسعت کافی طور سے معلوم ہو سکتی ہے اور وہ (انگریزی) نام یہ ہے: "کسی قدرتی، رواجی، رضاکارانہ، اور ضروری جنگ کی بنیاد اور اساسی وجوہ پر ایک مقالہ۔ کلیسائی افسر ہمیشہ دنیوی حکمرانوں کے ماتحت رہے ہیں اور یہ کہ پوپ کو انگلستان کے کشوری یا کلیسائی معاملات میں کبھی بھی جائز اقتدار اس وقت سے حاصل نہیں رہا جب سے کہ رومی سلطنت سے برطانیہ کو فتح کے ذریعے سے چھین لیا گیا۔" یہ مقالہ لندن میں سر والٹر رالے کے مجموعۂ تالیفات میں سنہ ۱۷۵۱ء میں چھپا اور جہاں تک نظریات کا تعلق ہے اس میں کوئی خاص دلچسپ چیز نہیں ملتی۔

ولیم فل بک، لندن کا ایک وکیل تھا۔ اس نے سنہ ۱۶۰۲ء میں (۱۸۰) بڑی تقطیع کے صفحوں کا ایک رسالہ شایع کیا جس کا (انگریزی) نام یہ تھا: "قانونِ اقوام کا مجموعہ، جس میں قانونی مسائل و نکات و معاملات پر مختلف مقالے ہیں جن کے متعلق دنیا کی قوموں میں اتفاق و رضامندی پائی جاتی ہے اور جن سے بادشاہت، انگلستان کے قانونِ ملک، اور قانون غیر موضوعہ کے بنیادی مقاصد، مسائل، قواعد اور نظائر کے سمجھنے اور بوجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔" اس تالیف میں تیرہ باب ہیں۔

137

لہ برٹش میوزیم کے مخطوطات ہارلے جلد (۶۲۷۴)

دو میں کسی قدر دلچسپی کا سامان ہے۔ ساتویں باب میں قانون جنگ سے بحث ہے۔ اور اس کا عنوان ہے: "ہتھیاروں کے قانون اور ان کے منصفانہ ہونے، نیز حلیفوں، سفارتوں، اعلان جنگ، صلح، اجازت نامہ ہائے سفر، قیدیوں، یرغمالوں، جنگی چالوں اور قانون قدرت کے مطابق فتوحات کا ذکر۔" فل بک نے خاص کر جنتی لیس اور آیالا کو سند میں پیش کیا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ جنگ کا باضابطہ طور سے اعلان کیا جانا چاہیے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ قیدیوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ فاتحوں کو بہت سے مبالغہ آمیز حقوق حاصل ہونا تسلیم کرتا ہے اور اس کے مطابق ان حقوق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ شہروں کو تباہ بھی کر دیں۔

سولھویں صدی کے اواخر میں ژاں ژوبیر (؟ جان رابرٹ) نے جو ڈورا کے شاہی محاصرے میں لفٹنٹ جنرل تھا، ایک فرانسیسی کتاب لکھی جس کا نام "قانون جنگ کی چار کتابیں" تھا۔[1] وہ اطالوی ماہرین قانون سے شروع کرتا ہے اور "ان لوگوں کے خیالات کی، جو یہ کہتے ہیں کہ جنگ خدا ہی کے حکم سے کی جاتی ہے" اور "ان لوگوں کے خیالات کی، جو کہتے ہیں کہ جنگ شیطان کے حکم سے شروع کی جاتی ہے"، ان دونوں خیالات کی تحقیق و تنقیح کرتا ہے" اور ان دونوں خیالات میں تطابق

---

[1] فرانسیسی تالیف "قانون جنگ پر چار کتابیں" مؤلفہ استاد ژاں روبیر۔ جو محافظ فوج کا لفٹنٹ جنرل تھا۔ ان میں سے چوتھی کتاب میں مختصر طور سے ان تعزیزی قواعد کا ذکر ہے جو فوجی قواعد و ضوابط کے باعث فوجوں کے متعلق بھی ملحوظ رکھے جاتے ہیں اور معمولی عدالتوں میں بھی۔ پاریس کے قومی کتب خانے کے مخطوطات فرانسیسی ۱۲۸۴ء۔

پائے جائے" کے نتیجے پر پہنچتا ہے۔

پییئیر دِو فورڈسین ژوری کا حوالہ گروتیوس بھی دیتا ہے۔ اس نے ایک لاطینی کتاب لکھی تھی جس کا نام "چھے مہینے" تھا۔ یہ کتاب ہمارے مبحث کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ گروتیوس نے ایک اور مولف کا بھی حوالہ دیا ہے جو قرطاجنہ کا ژاں ہے اس نے خاص کر پوپوں کے دعووں کی حمایت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرلیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ پوپوں کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے غیر مذہب والوں کے ہتیاروں سے مدد لیں۔

جرمنی میں سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں کونار دبراؤن نے اپنی لاطینی کتاب "متعلق بہ بغاوت" میں جنگ کا بھی کچھ ذکر کیا تھا۔ پھر ۱۵۹۱ء میں ہائین رِش بُوت سر نے ایک لاطینی کتاب شایع کی جس کا نام یہ تھا: "قانون مخاصمت پر رسالہ، جس میں جنگ اور ڈوئل یعنی دست بدست لڑائی کے طریقے بیان ہوئے ہیں"۔ اور جرمنی ہی میں کرست یبن تال نے سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک لاطینی کتاب تالیف کی جس کا نام "قانون جنگ" تھا۔ یہ رسالہ جو اصل میں ان مباحثات میں سے ایک ہے جن کا مجموعہ "سیاسی دروس" کے نام سے موسوم ہے۔ بی بن تال نے ان (اسباب) کی بڑی احتیاط سے تحقیق کی ہے۔ جو جنگ کا باعث بنتے ہیں۔ اس کی رائے میں یہ سبب دوگونہ ہوتا ہے: کبھی تو عام وجہ یعنی ناگزیر ضرورت ہوتی ہے، اور کبھی خاص وجہ ہوتی ہے یعنی شخصی مدافعت، حلیف کی حفاظت، چھینی ہوئی چیزوں کی واپسی اور معاہدہ شکنی۔ شی پیو جنتی لیس نے بھی جو البیریکوس جنتی لیس کا بھائی تھا، قانون جنگ کے متعلق ایک لاطینی رسالہ لکھا تھا

جس کا نام "روحی قوم کے قانون عمومی کے مطابق مشہور مباحثات کی کتاب" تھا۔ اس کے ایک باب کا عنوان "قانون جنگ" ہے۔ اس معاملے میں وہ (۱۰۵) مقولوں میں اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔ اس کی رائے میں مدافعت سب سے زیادہ منصفانہ وجہ جنگ ہوتی ہے۔ اور یہ مدافعت یا تو ضروری ہوتی ہے یا مفید یا دیانتدارانہ۔ مدافعت اسی وقت مفید سمجھی جائے گی جب اس کا ڈر ہو کہ دشمن دست درازی کرے گا۔ دیانتدارانہ مدافعت اس وقت ہوتی ہے جب ہم اس سماج کے ارکان کی مدد کو دوڑیں جس کے ہم بھی ایک فرد ہوتے ہیں، اور اسی سماج کو جو ہم سب کو ملا کر ایک کرتا ہے مدد دیں۔ شی ہیو جنتی لیس ان خصوصی تحرکات جنگ کے خلاف آواز بلند کرتا ہے جن کا بعض جنگجو بہانہ کیا کرتے ہیں۔ مثلاً وہ مضرتیں یا جرم جو بہت پرانے ہوں یا آباواجداد کے زمانے میں ایسی زمینوں پر قبضہ ہوا ہو جن کو ان لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا۔ یہ مولف اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ شہنشاہتوں کو بھی حق قدامت حاصل ہوتا ہے۔

فرانشوا سوارینیس ان سب سے زیادہ قابل ذکر لوگوں میں سے ہے جو سولھویں صدی میں پیدا ہوئے۔ اور بلاخوف تردید لکھا جاسکتا ہے کہ وہ سب سے ممتاز یسوعی (جیسوئٹ) پادری تھا۔ اس لئے جن لاطینی تالیفوں میں ہمارے موضوع سے بحث کی وہ یہ ہیں: ایک تو "قوانین اور خدائے مقنن کے متعلق رسالہ"۔ یہ پہلی مرتبہ سنہ ۱۶۱۲ء میں کومبرا میں شایع ہوا۔ اور دوسرے "تین دینیاتی خوبیوں پر کتاب جو تین رسالوں میں منقسم ہے"۔ سوارینیس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہاں ایک ترتیب اور ایک وضاحت پائی جاتی ہے، جن کی

واقعی داد دینی پڑتی ہے۔ اسے مفتی یا ماہر قانون کہنا تو ٹھیک نہ ہوگا لیکن کسی فلسفی کے لیے جن صفات کی ضرورت ہے وہ اس میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ اسے ہمارے علم کے بانیوں کی صف اول میں جگہ دینی پڑتی ہے۔ گروٹیوس میں قابل تعریف یہ چیز تھی کہ اس کے ہر ہر صفحے میں انسانیت کی محبت بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ سواریئش کی تحریروں میں عیسائی رحم و عفو جگمگاتا دکھائی دیتا ہے۔

سواریئس نے مانوی مذہب اور وائیکلف کے ان خیالات کی تردید کی ہے کہ جنگ بذات خود کوئی برائی نہیں اور یہ کہ جنگ کے لیے رحم و عفو کے خلاف ہی ہونا ضروری نہیں۔ لیکن سواریئس کا مطالبہ ہے کہ کسی دیانتدارانہ جنگ کے لیے متعدد شرطیں بیک وقت پائی جائیں۔ اور یہ شرطیں سہ گانہ نوعیت کی ہیں یعنی ایک جائز اقتدار پایا جائے جو جنگ کر سکے؛ اور کوئی منصفانہ وجہ، اور حق موجود ہو، نیز اعتدال ملحوظ رہے۔

پہلے نکتے کے متعلق ایک امر قابل لحاظ ہے۔ سواریئس بیان کرتا ہے کہ اگرچہ پوپ کو اس کی اپنی ریاستوں کے باہر دنیاوی معاملات میں کوئی راست اقتدار بالکل حاصل نہیں ہوتا، لیکن اسے ایک بالواسطہ اقتدار ضرور حاصل ہوتا ہے، جس کے ذریعے سے وہ مسائل جنگ کو اپنے سامنے طلب کر سکتا اور جھگڑوں کو چکا سکتا ہے۔ اب فریقین کو چاہیے کہ پوپ کے فیصلے کو تسلیم کریں، بجز اس کے کہ وہ علانیہ غیر منصفانہ ہو۔ سوتو نے پہلے ہی بیان کر دیا تھا کہ اس طور سے عیسائیوں کے مابین ہونے والی جنگوں سے کم ہی جائز ہو سکیں گی۔ کیونکہ ان جھگڑوں کی مسالمانہ طور سے یکسوئی ممکن

ہوتی ہے۔ صرف ایک نکتہ ہے جس پر سواریتس زور دیتا ہے کہ اگر پوپ اپنے اقتدار کو نافذ کرنے سے اس ڈر کے باعث باز رہے کہ کہیں اس سے زیادہ بڑی برائیاں نہ پیدا ہو جائیں تو حکمرانوں کو اس کا اختیار ہوگا کہ اپنے حقوق کے جتانے کے لیے ضروری کارروائی اختیار کریں۔

سواریتس کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ ایک جائز حقیت بھی پائی جائے۔ سوال یہ ہے کہ "قدرتی معقولیت" کے مطابق جائز حقیت کسے کہیں؟ اس کا جواب بھی اس نے دیدیا ہے۔ کوئی جنگ جائز نہیں ہوسکتی جب تک اس کی "وجہ" جائز اور ضروری نہ ہو۔ اس طرح کی جائز اور کافی وجہ میں ہر وہ نازک قسم کی مضرت شامل ہوتی ہے جس کا بدلہ یا جس کی تلافی سوائے جنگ کے کسی اور طور پر نہیں ہوسکتی۔ مضرتوں کی تین قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ پہلے یہ کہ کسی حکمران نے دوسروں کا مال چھین لیا ہو اور واپس نہ کرنا چاہتا ہو؛ دوسرے یہ کہ وہ کسی معقول وجہ تحریک کے بغیر اقوام کے اجتماعی حق سے انکار کرے، جس میں بے ضرر گذرنے کا حق اور کاروبار تجارت کا حق شامل ہیں؛ تیسرے یہ کہ کوئی حکمران اپنے مخالف کی آن کو نقصان پہنچائے۔ یہ مضرتیں، کسی حکمران کو بھی پہنچ سکتی ہیں، اور اس کی رعایا کو بھی۔ ان میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ حکمران اپنی مملکت اور اپنی رعایا کا محافظ ہوتا ہے۔ یہ مضرتیں چاہے ان لوگوں کو پہنچی ہوں جن کی حکمران حفاظت کرتا ہے، یا ان کو جو اس کے دوست ہوں۔ ان میں فرق نہیں کیا سکتا۔ ہر دو صورتوں کا اثر ایک ہی ہے۔

باب ہفتم

غیر مذہب والوں اور ملحدوں کے خلاف جنگ

اس سلسلے میں بعض اہم مسائل پیدا ہوئے تھے، یعنی غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ اور بد عقیدہ ملحدوں کے خلاف جنگ۔
قرون متوسطہ میں اگرچہ کلیسا عیسائیوں کے حق میں امن و سلامتی کا پیام رکھتا تھا، لیکن ان تمام لوگوں کے لیے جو اس کے دین کو قبول نہ کریں یا اس سے ناواقف رہیں تو کلیسا ان کے خلاف کھلم کھلا مخاصمت برتتا تھا۔ یہودیوں پر یہ الزام تھا کہ وہ خدا کشی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ بے رحمانہ ظلم و ستم کے ہدف بنے۔ کلیسا کا دعویٰ تھا کہ جو کوئی بھی بپتسمہ لے چکا ہو، اس پر اسے پوری طرح اختیار سماعت حاصل ہے۔

انتزاق پسند اور ملحد اسی سے متاثر ہوئے[۱]۔ چونکہ غیر مذہب والوں
یعنی مسلمانوں نے ان مقاموں پر قبضہ کر لیا تھا جہاں دنیا
کی نجات کا خونیں ناٹک کھیلا جا چکا تھا [یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کے متعلق سولی پر چڑھائے جانے کے عیسائی عقائد کی طرف
اشارہ ہے ــــ مترجم]، اسی لیے ایسے لوگوں کے خلاف
جنگ کرنا روا بن گیا۔

مسلمانوں کے متعلق عیسائیوں کے جو کچھ جذبات تھے، ان
کا ذکر بعض تالیفوں اور بعض باضابطہ اعلانوں میں ملتا ہے[۲]۔
[کلونی کا مشہور پادری اور مسیحیت میں اصلاح پسند جو ۱۱۵۶ء
میں فوت ہوا تھا یعنی] پیٹر "قابل احترام" عربوں کے خلاف
ایک کتاب تالیف کرتا ہے جس میں لکھتا ہے کہ اسے الفاظ
نہیں ملتے جن میں وہ پیغمبر اسلام کی ......[۳] کو اجاگر کر سکے۔
اور وہ یہ بھی اضافہ کرتا ہے کہ "شیطان کے سوا کوئی اور ایسی
خونی مشورت نہیں دے سکتا تھا"۔

اس طرح مسلمانوں کے خلاف جنگ فرض ہو جاتی ہے۔

---

[۱] ۔ ترینت میں منعقد شدہ مجلس شورائے مذہبی نے اس ادعا کی توثیق کی تھی
اور طے کیا تھا کہ (لاطینی میں): "اگر کسی کو باپ، بیٹے اور روح القدس کے
نام پر کلیسائی طریقے سے اور ارادے کے ساتھ بپتسمہ دیا گیا ہو اور اس کے متعلق کوئی
ملحدانہ طور سے یہ بیان کرے کہ وہ صحیح بپتسمہ نہیں ہے، تو وہ ملعون اور جات باہر ہوگا"۔
(حصہ ۷، فصل ۴ "بپتسمہ")۔ پوپ نوین پائیس نے ۷ راگست ۱۸۷۳ء کو شہنشاہ جرمنی کے نام جو
مشہور خط لکھا تھا، اس سے سب واقف ہیں۔ اس میں کیتھلک کلیسا کے صدر یعنی پوپ نے
ادعا کیا تھا کہ "جو کوئی بپتسمہ لے چکا ہو، وہ پوپ کا ہونا سمجھا جائے گا"۔

[۲] ۔ نوراں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد (۱)، "جاگیرداری اور کلیسا" ص ۲۴۷

[۳] ۔ یہاں "بہیمانہ بے رحمی" کے الفاظ تھے ــــ مترجم!

اور مسالمانہ تبلیغ پر، جو غیر موثر ثابت ہوئی تھی، مسلح تبلیغ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ کلیسا کے لیے صلیبی جنگوں کا مقصد غیر مذہب والوں کو عیسائیت کا حلقہ بگوش بنانا تھا۔ اس الجھن کو یوں سلجھایا گیا کہ عیسائی یا تو خود مرجائیں گے یا غیر مذہب والوں کو عیسائی بنالیں گے۔ کلیسیوں کی مجلس شورائے مذہبی میں یہ اعلان کیا گیا کہ بیت المقدس کو آزاد کرانے کی مہم میں حصہ لینا ہر قسم کے گناہوں کا مکمل کفارہ ہے۔ صلیبی جنگ میں شریک ہونے والے سپاہیوں کو پوپ نے ان کے تمام گناہوں سے معافی عطا کردی اور ابدی برکت کا وعدہ کیا۔ ریموں داژیل نے جو خواب دیکھا تھا اس کی روایت ہم تک پہنچی ہے، جو یہ ہے کہ خود حضرت مسیح نے آکر اپنے ایمان والے شہامت بازوں کو یہ کہا تھا کہ جو بہادر جنگجو آپ کی راہ میں موت سے دوچار ہوں گے انھیں خدا کے داہنے ہاتھ پر جگہ ملے گی۔ ایک ڈومینیکی جنگ پرست پادری نے جو رضاکاروں کا سپہ سالار تھا، پوپ دسویں گریگری کے حکم سے ایک لاطینی تالیف بنام "تین حصوں والی کتاب" لکھی جس میں مقدس جنگوں یعنی حروب صلیبیہ کی تائید کے دلایل بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ "کسی مذہب کے قائم کرنے کے طریقے اور ہوتے ہیں، اور اس کو برقرار رکھنے کے طریقے اور۔ طاقتور ہاتھوں میں ہتیار جو کام انجام دے سکتے ہیں، کمزور ہاتھوں میں مطلق نہیں دے سکتے۔ عیسائیت کا قیام تو کراماتوں اور شہیدوں کے خون سے عمل میں آیا لیکن اب جب کہ اسے دشمن سے بچانے کا سوال ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ تلوار کام میں لائی جائے۔ نوزائیدہ کلیسا کمزور تھا۔ اسی لیے اسے

سے۔ داشری کی لاطینی کتاب "منتخبات" جلد (۲)، ص ۲۱۵۔

اس پر مجبور ہوتا پڑا کہ جبر و ستم گوارا کرتا رہے۔ لیکن جب خدا نے اسے زور عطا کردیا ہے تو اس سے فایدہ کیوں نہ اٹھایا جائے؟ اب ہمارے پاس کرامتیں باقی نہیں ہیں، لیکن ہمارے پاس طاقت موجود ہے۔ اس لیے اب ہمیں وہی ہتیار استعمال کرنے چاہئیں، جو ہمارے پاس موجود ہیں۔" عربوں کے خلاف قاتلانہ جنگ کی اجازت کے لیے حضرت موسیٰؑ کا حکم سند میں پیش کیا گیا کہ "جو کوئی موسیٰ کے قانون پر حملہ کرے گا وہ خدا کے نزدیک موت کا مستوجب ہے۔ جو لوگ "خدا کے بیٹے" کو قدموں میں روندیں وہ بدرجہ اولیٰ موت کے مستحق ہیں۔"

یہ چیز نظر انداز نہ کی جائے کہ بہت دنوں تک بحر متوسط کے ساحلوں کی عیسائی آبادی کے لیے عرب ایک مستقل خطرہ بنے رہے۔ اور جب چودھویں صدی کے آغاز میں اپنی نوبت پر ترک میدان میں آئے تو یہ یقین کیا جانے لگا کہ عیسائیت کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس زمانے کے مصنفوں کے ہاں جو درشت تعلیم نظر آتی ہے، اس کا ایک سبب یہی تھا۔ اور ان کی اس درشتی اور شدت کو کلیسا نے گھٹایا نہیں بلکہ بڑھا ہی دیا۔ مزید برآں ہم جانتے ہیں کہ عیسائیت اور اسلام کے تماس نے عیسائیت پر ایک غیر صحت بخش اثر ڈالا۔ عیسائیوں میں احساس مذہبی نے اندھے تعصب کی حیثیت اختیار کرلی جو خود مسلمانوں کے تعصب ہی کی توضیح سمجھی جاسکتی ہے۔ یہ ہم نہ بھلائیں کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ [صلی اللہ علیہ وسلم] نے ابتدا میں تو امن و سلامتی کی تعلیم دی لیکن جلد ہی یہ اعلان کردیا کہ دین کے دشمنوں پر حملہ کرنا اور ان سے لڑنا جائز ہے۔ اور قرآن مجید میں بربریت پسندانہ احکام ملتے ہیں چنانچہ "خدا کو اس کے دین کی راہ میں

بہائے ہوئے خون کے ادنیٰ قطرے سے زیادہ کوئی اور چیز عزیز نہیں[1] نیز "جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ہوں، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ وہ زندہ ہیں۔" ایک ناگزیر تحریک کے باعث عیسائیت بھی ویسی ہی بے رحم ہوگئی جیسا اسلام۔[2]

عربوں سے عیسائیوں کو جو نفرت تھی، وہ تقریباً ہر ایک مورخ اور ہر ایک شاعر کے ہاں ہویدا ہے۔[3] شہر صور کے گیوم (ولیم) نے صلیبی جنگوں کی تاریخ لکھی ہے، جس میں وہ عربوں کو ابلیس کی اولاد بتاتا ہے۔ روبیر راہب انھیں شیطانوں کی ٹولی اور ایک ناپاک قوم اور شریر کتوں کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ فلپ موس کیس کی تاریخ میں لکھا ہے کہ عربوں کے بادشاہ نے شارلیمان سے پوچھا تھا کہ اس نے کیوں اسپین کی سرزمین مسلمانوں سے چھین لی، جس پر نہ تو اسے اور نہ اس کے آباو اجداد کو کوئی ادنیٰ حق پہنچتا ہے؟ شارلیمان نے جواب دیا کہ "اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی تمام دیگر لوگوں سے بہتر ہیں اور انھیں حضرت مسیح کی وجہ سے پوری دنیا کی سرداری حاصل ہے۔" صور کے گیوم نے بیان کیا ہے کہ "عیسائی اور عربوں میں نفرت کا پایا جانا مطابق فطرت ہے۔ کیا عیسائیوں کو ان لوگوں سے نفرت نہیں کرنی چاہیے جو ان کے آقا یعنی حضرت عیسیٰ[4] سے نفرت کریں؟ بیت المقدس کے بطریرک

---

[1] ایسی کوئی آیت قرآن مجید میں نہیں ہے — مترجم

[2] مولف نے اسلام کے متعلق اس رائے زنی کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا ہے۔ مترجم

[3] وراں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد (۱)، "جاگیرداری اور کلیسا" ص ۲۶۶۔

[4] مسلمان حضرت عیسیٰ کو خدا کا ایک سچا اور برگزیدہ نبی سمجھتے ہیں اور ان کی

یعنی پادریٔ اعظم نے بیان کیا تھا کہ: "کسی غیر مذہب والے سے کسی کیے ہوئے عہد کا پورا کرنا، اس سے زیادہ بڑا گناہ ہے جتنا اس عہد کو توڑنا۔"

قرونِ متوسطہ میں عیسائیوں کے عربوں اور بت پرستوں کے متعلق جو احساسات تھے، ان کا ایک صاف اور واضح مظاہرہ اس امر میں ہوتا ہے کہ راہبوں کے فوجی سلسلے قائم ہوئے جن میں شہامت بازی اور رہبانیت، دونوں کا اجتماع عمل میں آگیا تھا؛ اور جن کے لیے اعمالِ صالحہ میں سب سے بلند مرتبہ یہ کام تھا کہ دین کے دشمنوں سے جنگ کریں۔ ٹمپلر سلسلے کے راہب اور بیت المقدس کے سینٹ جان کے ہاسپٹالر سلسلے کے راہب بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں نمودار ہو گئے۔ پوپوں نے ان کو بڑے بڑے امتیاز عطا کیے، تو بادشاہوں نے ان کو بڑے بڑے مقبوضات دے ڈالے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹمپلر سلسلے کے قواعد سینٹ برنار نے بنائے تھے۔ یہ قواعد سینٹ برنار نے ہرگز نہیں بنائے تھے، لیکن پھر بھی ان قواعد کی دستاویز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی رو سے اس سلسلے کے جنگجو راہبوں پر یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ اپنے وطن سے ہمیشہ کے لیے بے وطن ہونا اور غیر مذہب والوں کے خلاف ایک ختم نہ ہونے والی جنگ کرتے رہنا قبول کریں۔ انھیں لڑنے سے انکار کرنے کا کبھی کوئی حق نہ ہوگا حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب انھیں تگنے دشمنوں سے مقابلہ کرنا ہو۔ انھیں اس کی بھی ممانعت تھی کہ کبھی دشمن سے امن اور پناہ طلب کریں اور اپنے فدیے کے لیے انھیں بالشت بھر دیوار یا بالشت بھر علاقہ تک دینے کی اجازت

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ خود اپنے پیغمبر کے برابر عزت کرتے ہیں — مترجم۔

نہ ہوگی۔ ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ "خوش قسمتی اور اطمینان کے ساتھ کوچ کرو، اور مسیح کی صلیب کے سخت ترین دشمنوں کو نکال باہر کرو؛ اور اس کا پورا یقین رکھو کہ چاہے زندہ رہو یا مرجاؤ تم خدا کی اس محبت سے، جو اسے حضرت عیسیٰ کے متعلق تھی، باہر نہیں رہو گے؛ اور ہر خطرے کے وقت تم یہ جملہ دہرایا کرو کہ زندہ ہوں کہ مردہ، ہم اپنے آقا کے ہیں! خوش قسمت ہیں بہادر اور خوش نصیب ہیں شہید!"

جن راہبانہ فوجی جماعتوں کا ہم نے ابھی ذکر کیا، ان کے علاوہ اور بھی متعدد، نسبتہً کم اہم، فوجی سلسلے اسپین اور پرتگال میں اس غرض کے لیے پیدا ہو گئے کہ عربوں سے مقدس جنگ کریں۔ مشرقی یورپ میں ایک اور ٹولی پیدا ہو گئی۔ یہ بھی اتنی ہی مضبوط تھی۔ یعنی ٹیوٹانی سلسلہ۔

ٹمپلر اور سینٹ جان کے سلسلوں کی طرح ٹیوٹانی سلسلہ بھی صلیبی جنگوں کے باعث پیدا ہوا۔ بیت المقدس کے کلیسائے نوتردام کے یہ جرمن راہب ابتدا میں تو رضاکارانہ خدمت خلق کے کاموں کی خواہش رکھتے تھے لیکن پھر یہ مسیحی زائروں کی حفاظت کے لیے شہامت بازوں کا ایک جتھا بن گئے۔ اس میں داخلے کے وقت ان کا اقرار یہ ہوتا تھا کہ وہ فقیری اور عفّت اور اطاعت ملحوظ رکھا کریں گے۔ سنہ ۱۲۲۶ء میں جب پروشیا (شمالی جرمنی) کے بت پرست حملہ آوروں نے جرمن آبادیوں پر ہلہ بول دیا، تو اسی سلسلے کے راہبوں کو مدد کے لیے بلایا گیا۔ شہنشاہ دوسرے فریڈرک نے ان کو اجازت دی کہ پروشیا میں گھس جائیں اور جو کچھ جرمن سردار انھیں پیش کریں، یا بعد میں انھیں جو بھی چیز حاصل ہو، وہ اس کو مالکانہ طور سے قبول کر سکتے ہیں۔ پوپ نے بھی ان کو اسی طرح کا ایک حق عطا کیا، البتہ یہ قرار دیا گیا کہ

جس جس علاقے میں وہ پیش قدمی کریں گے وہ سینٹ پیٹر یعنی پوپ کا سمجھا جائے گا۔ پروشیا والوں نے اطاعت کرلی اور پھر ٹیوٹانی راہبوں نے دوسری قوموں کے خلاف اپنے کو جنگ میں الجھالیا۔ اور اگر ان راہبوں نے اپنے تاریخی فرض کے انجام دینے میں جبر و بے رحمی استعمال کی تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے تہذیب و تمدن کی بھی بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں۔

جنگ کے جائز ہونے کا مسئلہ بہت شروع ہی میں ماہرین قانون میں چھڑ گیا تھا اور عرصے تک وہ معرکۃ الآرا چیز بنا رہا۔ عربوں کے خطرے کے زمانے کی طرح یہ مسئلہ دوبارہ پندرھویں صدی کے آغاز میں پیش ہوا جب کہ مشرقی یورپ کے بت پرست قبائل کی لڑائیاں چھڑیں اور نئے سر سے اس سوال پر ان ممالک کے باشندوں کے متعلق غور ہونے لگا جو نئے دریافت ہوئے تھے [یعنی امریکہ] اور یہ دریافت بھی اسی صدی میں پرتگالیوں اور اسپینیوں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔ یہ مسئلہ اس قابل ہے کہ ہم اس پر کسی قدر غور کریں۔

اس کے متعلق دو رائیں پیش ہوئی تھیں۔ ایک کی نمایندگی سینی بالدے دے فیسکے کرتا تھا۔ یہ "احکامیہ" فرقے کا ایک ممتاز پادری تھا [جو یہ رائے رکھتا تھا کہ پوپ کو اپنے فرامین کے ذریعے سے جھگڑے چکانے کا حق حاصل ہے] اور بعد میں اس نے چوتھے انوسنٹ کے نام سے تکونی کلاہ پاپائی زیب سر کی تھی۔ دوسری رائے کی نمایندگی سوسے کا ہنری کرتا ہے۔ یہ بھی قرون متوسطہ کے قانون مذہبی کے درخشاں و تاباں ماہروں میں سے ایک تھا۔

یہ اختلاف بہت دنوں تک جاری رہا۔ اور کوئی ایسا ماہر قانون مذہبی نہیں بچ رہا جس نے اس بحث میں حصہ نہ لیا ہو۔ قانون روما کے ممتاز ماہروں نے بھی اس بارے میں اپنی قیاس آرائیاں کیں۔ لیکن مورخ کو افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ جو رائے، کم خیر اندیشی پر مبنی تھی، اسی کی طرف کثیر غلبۂ آراء ہوا۔

سینی بالدے دے فیسکے نے ایک لاطینی کتاب لکھی جس کا نام "احکام پاپائی کی پانچ کتابوں کا اشاریہ" تھا۔ اس میں اس نے غیر مذہب والوں کے متعلق ایک ہمدردانہ رائے ظاہر کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ عربوں کے خلاف جنگ اگر صرف اس لیے کی جائے کہ انھیں عیسائی بنالیں تو یہ درست نہ ہوگی۔ لیکن جنگ اس وقت جائز ہوگی جب عرب ان علاقوں پر قبضہ کرلیں جو عیسائیوں کے تھے، یا وہ عیسائیوں پر حملہ کریں، یا جب معاملہ فلسطین کی ارض مقدس کے متعلق ہو۔ اس آخری صورت میں یہ ملحوظ رکھنا ہوگا کہ جو مضرت حضرت مسیح کو پہنچائی جائے وہ جملہ عیسائیوں کو پہنچتی ہے۔ اس مولف نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ چونکہ غیر مذہب والوں کو بھی [اپنے علاقے میں] اختیار، سماعت اور حقوق ملکیت حاصل ہوتے ہیں، اس لیے ان کا علاقہ اور ان کی جائداد بھی اگر عیسائی چھین لیں تو نا انصافی ہوگی۔[1]

یہ رائے جو مقابلۃً نرمی پر مبنی تھی، سخت ترین مخالفت سے دوچار ہوئی۔ سوسے کے ہنری نے اپنی پوری قوت سے اس پر حملہ کیا اور غیر مذہب والوں کے متعلق اس بات سے

---

[1] پوپ چوتھے انوسنٹ کی لاطینی تالیف "احکام پاپائی کی پانچ کتابوں کا اشاریہ" تیسری جلد جو بپتسمہ اور اس کے اثرات کے متعلق ہے۔

انکار کیا کہ انھیں بادشاہت کرنے یا حکمرانی کرنے یا اختیار سماعت رکھنے کا قطعاً کوئی حق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی یہ رائے تھی کہ حضرت مسیح کی آمد کے باعث غیر عیسائیوں کے لیے اقتدار اعلیٰ کا ہر حق ختم ہوگیا۔ البتہ اس نے ایک فرق تسلیم کیا۔

سوسے کا ہنری یہ سوال کرتا ہے کہ عیسائیوں کو عربوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ وہ ایک فرق قائم کرتا ہے۔ چنانچہ ان عربوں پر حملہ نہیں کیا جاسکتا جو عیسائی بادشاہ کی اطاعت قبول کریں ــــ (یہاں یہ نہ بھلایا جائے کہ صقلیہ اور جنوبی اٹلی کے ساتھ ساتھ جنوبی فرانس میں بھی بہت سے عرب رہتے تھے) ــــ لیکن ایسے عربوں پر حملہ کیا جاسکتا ہے جو نہ تو عیسائی کلیسا کی اطاعت کرتے ہیں اور نہ عیسائی بادشاہت کی۔ چنانچہ اس کے (لاطینی) الفاظ ہیں "ایسے دوسرے لوگ جو کلیسائے روما کا اقتدار بھی تسلیم نہیں کرتے اور شہنشاہ روما کا اقتدار بھی نہیں قبول کرتے، ان سے جنگ کی جاسکتی ہے"۔[۱] غیر مذہب والوں کے خلاف جو جنگ کی جاتی اسے وہ "رومی جنگ" کا نام دیتا ہے۔ اور اسے جائز بتاتا ہے۔ چنانچہ اس کے (لاطینی) الفاظ ہیں "جو جنگ مذہب والوں اور غیر مذہب والوں میں ہو، اسے رومی جنگ کہتے ہیں۔ اور یہ جائز ہے۔ اس کو رومی اس لیے کہتے ہیں کہ روما ہمارے مذہب والوں کا سردار اور مادر وطن ہے۔"[۲]

اُولدرادو دے پونتے نے "مشورے" کے نام سے ایک لاطینی کتاب تالیف کی تھی اس میں وہ سوسے کے ہنری کی رائے

---

[۱] سوسے کے ہنری (ہوستی نن سیس) کی لاطینی کتاب "زرین خلاصہ" کتاب پنجم باب "عرب"

[۲] سوسے کے ہنری (ہوستی نن سیس) کی مذکورۂ بالا تالیف کتاب اول باب "صلح اور امن"

کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن وہ بظاہر اس رائے کی طرف جھکتا نظر آتا ہے کہ ان عربوں کے خلاف جنگ نہیں کی جاسکتی جو پرامن زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ ارض مقدس یعنے فلسطین کے متعلق ایک استثنائی صورت پیدا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے "ہم کو جبراً نکال باہر کیا گیا تھا"۔ مزید برآں یہ امر قابل ذکر ہے کہ وہ اس سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے کہ آیا عیسائیوں کو اس کی اجازت ہے کہ غیر مذہب والوں کے ساتھ حلیفی پیدا کریں[1]؟

ژاں دا اندریا پوری وضاحت و صراحت سے بیان کرتا ہے کہ جو غیر مذہب والے پر امن طور سے رہتے ہیں اور وہ جو ہمارے غلام ہیں ان کو زبردستی کر کے عیسائیت قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ نہ تو جنگ کر کے اور نہ ہی کوئی زبردستی کر کے بلکہ صرف وعظ و نصیحت کر کے یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر غیر مذہب والے اپنے پاس مبلغین کو آنے نہ دیں، تو پوپ انھیں سزا دے سکتا ہے۔

[قانون روما؟ بائبل؟ کے] حواشی کے مطابق بارتولے نے تسلیم کیا ہے کہ انسانیت دو حصوں پر منقسم ہے: ایک تو رومی قوم، دوسرے اجنبی اقوام۔ رومی قوم میں وہ ان تمام حکمرانوں اور حکومتوں کو شامل کرتا ہے، جو راست یا بالواسطہ اور واقعے کی حد تک یا قانونی حد تک شہنشاہت کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہوں۔ اجنبی اقوام سے اس کی مراد وہ لوگ ہیں جو شہنشاہ کو دنیا کا آقا نہیں ماننا چاہتے۔ بارتولے نے ان اجنبی اقوام کی تفصیل دی ہے۔ چنانچہ یونانی، تاتاری، یہودی

---

[1] اولدرادے دے پونتے کی لاطینی کتاب "مشورے" نمبر ۷۲

اور دیگر لوگ۔ لیکن عیسائیوں کے بالمقابل ان سب کی یکساں حیثیت نہیں ہے۔ بعض حلیف ہیں، بعض امن کی زندگی گزارتے ہیں اور بعض بالکلیہ اجنبی ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے جنگ جاری ہے چنانچہ یہ عرب اور ترک ہیں[1]۔

14 اقوام کی یہ تفصیل اور یہ بیان تقریباً لفظ بلفظ لنّانو کے ژاں نے لاطینی کتاب "متعلق بہ جنگ" میں دہرا دیا ہے۔ اس آخرالذکر مولف نے یہ ثابت کیا ہے کہ کلیسا کو اس بات کا حق ہوتا ہے کہ غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کرے، ان کے علاقے پر ہلہ بول دے اور ان عیسائیوں کو مراعات عطا کرے جو مقدس جھنڈے کے نیچے لڑنے کے لیے اپنا نام لکھواتے ہیں۔ اس کے الفاظ میں "دنیا کا صرف ایک ہی آقا ہے جو پوپ ہے۔ اور اسے غیر مذہب والوں پر بھی، واقعے کی حد تک چاہے نہ ہو قانونی استحقاق کی حد تک، ضرور اختیار سماعت حاصل ہوتا ہے۔" لنّانو کے ژاں نے اس کلیے سے ایک قاعدہ استنباط کیا ہے جو خود سوسے کے ہنری کی رائے بھی تھی یعنی وہ غیر مذہب والا جو قانون قدرت کے خلاف گناہ کا ارتکاب کرے یا جو بت پرست ہو، تو یہ ایک ایسا جرم ہے جس کے باعث اس کے خلاف جنگ کرنی جائز ہے۔ لنّانو کے ژاں نے جنگ کے اس حق کے استعمال کا اختیار پوپ کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ پوپ کو اس کا بھی اختیار ہے کہ ان غیر مذہب والوں کے خلاف مخاصمانہ کارروائیاں کی جائیں جو ارض مقدس پر قابض ہوں، یا جن کے متعلق حضرت مسیح نے چاہا تھا کہ وہ پیدا ہوں اور مرجائیں۔ ارض مقدس، رومی شہنشاہت کی تھی جسے چھین لیا گیا ہے۔ اور پوپ کو جو حکومت حاصل ہے، اس کی بنیاد پر وہ اسے واپس لینے کی کوشش

[1] ساسو فیرّاتو کے بارتولے کی لاطینی تالیف "ڈائجسٹ کی شرح نوحصوں میں" باب: گرفتاری اور دشمن سے واپس چھیننا۔

کر سکتا ہے۔ بعض اور ممالک بھی ہیں جو غیر مذہب والوں کے قبضے میں ہیں لیکن یہ علاقے کوئی تقدس نہیں رکھتے۔ اور ان کے متعلق شہنشاہت یا کلیسا کو وائنے کی حد تک کوئی اختیار سماعت بھی حاصل نہیں رہا ہے۔ پوپ حکم دے سکتا ہے کہ ان ملکوں کے آقا عیسائیوں کو نہ ستائیں۔ اور نہ ماننے کی صورت میں یہ اعلان کر سکتا ہے کہ وہ اپنے اختیارات حکمرانی سے معزول کر دیے گئے[1]۔

بالدے نے اس سے بھی وسیع تصورات قائم کیے۔ غیر مذہب والوں سے جنگ کے جواز کے مسئلے پر وہ نفی میں جواب دیتا ہے لیکن اگر خود غیر مذہب والے ہی عیسائیوں سے جنگ کریں تو عیسائی اس کا جواب مخاصمانہ کارروائیوں کے ذریعے سے دے سکتے ہیں[2]۔ اس مشہور ماہر قانون بالدے نے واقعہ یہ ہے کہ، اپنی تالیفات کی ایک اور عبارت میں خود اپنی آپ تردید کی ہے اور اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ غیر مذہب والوں اور بد عقیدہ ملحدوں سے جنگ کی جا سکتی ہے کیونکہ الحاد اور عیسائیت کو قبول نہ کرنا انھیں اختیار حکمرانی حاصل کرنے میں مانع ہے۔

کس قانون یا کس وجہ سے عربوں کے خلاف جنگ چھیڑی جا سکتی ہے؛ یہ سوال اولورے بونے کا پیش کردہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "یہ معلوم کرنا ہے کہ کس قانون کے باعث یا کس وجہ سے عربوں کے خلاف یا دیگر عیسائیت پر ایمان نہ لانے والوں کے خلاف

---

[1]۔ ہنانو کے تزان کا لاطینی "رسالہ متعلق بہ جنگ" رسائل قانون عمومی جلد (۱۶) ورق ۱، ۳۷ و مابعد۔

[2]۔ بالدے کی لاطینی تالیف "پرانی ڈائجسٹ کی شرح ایک حصے میں"۔ دیکھئے قانون (۵)۔

جنگ کی جا سکتی ہے؟ یا، یہ کوئی مناسب امر ہے کہ پوپ جنگ میں حصہ لینے والوں کے متعلق چشم پوشی اور عفو سے کام لے؟ سب سے پہلے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ کیوں عیسائیت پر ایمان نہ لانے والوں کے خلاف جنگ نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے آقا خدائے تعالیٰ نے زمین کی تمام چیزیں اچھوں کے لیے بھی اسی طرح پیدا کی ہیں جس طرح بروں کے لیے۔ اس مولف کی یہ رائے نہیں ہے کہ خدا اگر کچھ چیزیں غیر عیسائیوں کو عطا کر چکا ہو تو عیسائی وہ ان سے چھیننے کا حق رکھیں۔ اپنے اس نظریے کی تائید کے لیے وہ جو دلیلیں پیش کرتا ہے کہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی کو جبری طور سے بپتسمہ نہیں دیا جا سکتا۔ اور چونکہ بپتسمہ دینے کے لیے جبر استعمال نہیں کیا جا سکتا تو مال و دولت چھیننے کے لیے اسی جبر کا استعمال کیسے درست ہو سکتا ہے؟ پوپ کو نہیں چاہیے کہ عیسائیت پر ایمان نہ لانے والوں کے خلاف جو لوگ جنگ کرتے ہوں، ان کے متعلق چشم پوشی کرے۔ کیونکہ خود اس کا بیان ہے کہ "جو لوگ ہمارے دین سے باہر ہوں، ان سے اسے کوئی تعلق نہیں"۔ پھر بھی بونے اپنے اس قاعدے کے متعلق بعض مستثنیات کو تسلیم کرتا ہے: "اگر کوئی عرب یا کوئی یہودی قانون فطرت کی خلاف ورزی کرے تو پوپ بے شک اس مجرم کو سزا دے سکتا ہے، کیونکہ خدا نے اس کی نظیر قائم فرمائی ہے۔" یہ امر قابل ذکر ہے کہ دوسرے مولف اس آخر الذکر نظریے کو ماننے سے ہچکچاتے ہیں خاص کر فردیناند قاسکویس ہن ثاکا جو یہ بیان کرتا ہے کہ ہر گناہ فطرت کے خلاف ہی ہوگا۔ اونورے بونے اس کے بعد یہ بیان کرتا ہے "لیکن اگر یہودی یا عرب انجیلوں کے خلاف جرم کے مرتکب ہوں تو پوپ انھیں سزا نہیں دے سکتا کیونکہ دنیا دار آدمی کو دین کے قبول کرنے پر

147

مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ میں تم سے ایک اور چیز کہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ پوپ عیسائیت کو قبول نہ کرنے والوں کے خلاف [جو لوگ جنگ میں حصہ لیں' ان کے متعلق] چشم پوشی سے کام لے سکتا ہے تاکہ بیت المقدس کو واپس حاصل کیا جائے۔ کیونکہ یہ مقام ہمارے آقا حضرت یسوع مسیح کو پیش آئی ہوئی اذیتوں کے باعث فتح کے حق کے ذریعے سے عیسائیوں کا ہوگیا تھا اور اسے حضرت مسیح کو پیش آئی ہوئی مصیبتوں کے بعد روما کے حکمران نے فتح کرلیا تھا لیکن بعد میں اس پر عربوں نے قبضہ کرلیا جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مطابق استحاق تھا۔ اسی بناء پر پوپ ان سب کے متعلق چشم پوشی ملحوظ رکھے گا جو اس علاقے کو واپس حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ پوپ سے اجازت لیے بغیر عربوں کے خلاف عام جنگ کرنا ہو تو میں نہیں جانتا کہ یہ کیسے درست ہوسکتا ہے۔......

اس کے بعد میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پوپ کو کوئی وجہ نہیں کہ عیسائیت کو قبول نہ کرنے والوں کے خلاف ایسے دیگر علاقوں یا بادشاہتوں کے متعلق جو ان کے قبضے میں ہوں جنگ کا اعلان کرسکے۔ سوائے اس صورت کے کہ ایسے علاقے کلیسا' یا روما کی شہنشاہت' کے واقعی طور پر ماتحت رہ چکے ہوں' لیکن پوپ غیر مذہب والوں کو حکم دے سکتا ہے کہ "وہ عیسائیوں کو کوئی تکلیف نہ دیں" کیونکہ ایسی صورت میں پوپ ان لوگوں کو ان کی حکمرانی کے حق سے محروم کرسکتا ہے۔ اونورے بونے ایک اور استثناء کو بھی تسلیم کرتا ہے وہ یہ کہ بیت المقدس کا بادشاہ تخت کے متعلق اپنا حق جتا سکتا ہے۔[1]

---

[1]۔ اونورے بونے کی فرانسیسی تالیف "شجرۂ حروب" حصۂ چہارم باب دوم۔

کتاب "شجرہ حروب" کا مولف یعنی اونورے بونے ایک اور مماثل معاملے سے ایک اور جگہ بحث کرتا ہے۔ وہ دریافت کرتا ہے کہ "آیا کلیسا یہودیوں کے خلاف جنگ کا حکم دے سکتا ہے؟" اور وہ ان وجوہ کی تحقیق و تنقیح کرتا ہے جو اس کا جواب اثبات یا نفی میں دینے والے پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ یہ مانتا ہے کہ یہودی اپنے آپ کو عیسائیوں کے متعلق اس طور سے ظاہر کرتے ہیں کہ "وہ سب ان [عیسائیوں] کے علانیہ دشمن ہیں" لیکن وہ اس خیال کی تائید نہیں کرتا کہ ان کے خلاف جنگ کی اجازت ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اگر یہودی ہم کو بہت تکلیف دیتے ہیں تو ہم بھی ان کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کرتے"[1]

عقائد کے نقطۂ نظر سے غیر مذہب والوں سے جنگ کرنے کا مسئلہ ایک اور وسیع تر امر سے وابستہ ہے۔ جان وائیکلف نے جو جسارت آمیز خیالات پیش کیے ہیں، ان میں ایک وہ بھی ہے جو اقتدار اعلیٰ کے متعلق اس کی لاطینی کتاب "متعلق بہ اقتدار اعلیٰ" میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۶۸ء میں لکھی گئی۔ یہ ممتاز مفکر یہ بیان کرتا ہے کہ اصلی حکومت یا اقتدار اعلیٰ نہ تو کوئی حق ہے اور نہ کوئی بیرونی چیز، بلکہ وہ طبیعی معقولیت کی ایک عادت کا نام ہے جو اپنے بلند ترین مفہوم میں صرف خدا ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ اس مولف کی رائے میں یہ حکومت یا اقتدار خدا اپنی مخلوقات میں تقسیم کر دیتا ہے[2] اور گویا وہ انھیں ان کے انفرادی

---

[1] اونورے بونے کی کتاب بالا حصۂ چہارم باب (۶۳)۔

[2] ممکن ہے کہ "الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ" اور "اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء" وغیرہ قرآنی آیتیں اور مماثل حدیثیں پیش نظر رہی ہوں (مترجم)

حالات و فرائض کے مطابق یہ چیز عطیہ یا جاگیر میں دیتا ہے۔ لیکن یہ عطا صرف اس شرط پر حاصل ہو سکتی ہے کہ مخلوقات اپنے خالق کے احکام کی اطاعت کریں۔ دوسرے الفاظ میں وہ خدا کی اس عنایت کو برقرار رکھیں۔

بے شبہہ وائیکلف کے خیال میں یہ نظریہ ایک سطحی چیز پر مشتمل ہے۔ اور اس نے خود بھی فوراً بیان کر دیا ہے کہ حالات موجودہ سے یہ مطابقت نہیں رکھتا۔ اس نظریے کے نتائج بھی کچھ کم دور رس نہ تھے۔ چنانچہ اگر اپنی انتہا کو پہنچایا جائے تو اس نظریے کی رو سے بادشاہ اپنی بادشاہت سے اور پادری اپنی پادریت سے اسی لمحے محروم ہوتا ہے، جب کہ خدا کی عنایت ہم پر باقی نہ رہے۔ چنانچہ وائیکلف نے یہ تسلیم کرنا ضروری خیال کیا کہ واقعے کی حد تک جس کو اقتدار حاصل ہو اس کا احترام کرنا لازمی ہے اور وہ یہ بیان کرتا ہے کہ خدا کو اپنے ہی مسلّط کردہ شیطان کی [نعوذ باللہ] اطاعت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ جو حکومت قائم ہو اس کی اطاعت کرنی واجب ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حقیقی معنوں میں گنہگار کو اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی وہ اختیارات کا استعمال خدائی اجازت کی بنا پر کر سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ واقعے کی حد تک جسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہو اسی کی اطاعت عیسائی کے لیے واجب ہو گی۔ چنانچہ خود حضرت یسوع مسیح نے اس کی نظیر پیش کی ہے اور انھوں نے شیطان کی ترغیبوں کو مانا ہے [؟]۔

149

وائیکلف کے نظریے سے پہلا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے چونکہ اقتدار اعلیٰ کبھی صرف ایک شخص کے تفویض نہیں کیا تھا اور اقتدار اعلیٰ کے ٹکڑے ٹکڑے بطور الگ الگ جاگیروں کے

مختلف لوگوں کو عطا ہوئے تھے، اس لیے اگر کوئی چاہے تو یوں کہہ سکتا ہے کہ پوپ کے نظم ونسق کو جو دعوے ہیں وہ ساقط ہو جاتے ہیں کیونکہ پوپ کبھی حضرت مسیح کا اکیلا نائب نہ رہے گا بلکہ ہر عیسائی براہ راست خدا سے عطیہ حاصل کرے گا۔ اس نظریے کا دوسرا ناگزیر نتیجہ ایسے اثرات پیدا کرنا ہے جو بین الممالک تعلقات کے متعلق ہیں۔ یہ چیزیں خود وائیکلف نے اپنے نظریوں سے استنباط نہیں کی ہیں لیکن وہ ناگزیر ہیں۔ اور ان کے متعلق اسی کا حوالہ دیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ عنایات ربانی سے محروم ہونے کے باعث غیر مذہب والوں کو کوئی اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے عیسائی ان پر حملہ کرنے اور ان سے ان کی بادشاہتیں اور ان کا مال و دولت چھیننے میں باہم مسابقت دکھا سکتے ہیں۔ یہ نظریہ سترھویں صدی عیسوی تک گونجتا رہا۔ پندرھویں صدی کے آغاز میں شہر کانسٹنس میں منعقد شدہ مجلس شورائے مذہبی نے باضابطہ طور سے اس کو مردود ٹھیرایا اور جب اسپینیوں نے امریکیوں کے حقوق کو بے رحمی کے ساتھ اپنے قدموں میں روندنا شروع کیا تو فرانسوا دے ڈی توریا نے وہی رائے دی جو کلیسا کا واقعی نظریہ تھا کہ کسی مہلک گناہ کے باعث نہ تو کشوری اقتدار اعلیٰ زائل ہوتا ہے اور نہ اخلاقی اقتدار اعلیٰ۔ سترھویں صدی کے آغاز میں کامپانلا نے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے حق کی سہ گانہ بنیاد قرار دی، یعنی جسمانی قوت وحشی جانوروں کے لیے، عقل و فراست انسانوں اور بعض دیگر جانوروں کے لیے، اور محبت صرف انسانوں کے لیے۔ جہاں تک عقلمندوں اور علم والوں کا تعلق ہے کامپانلا کی رائے میں اوّلیت انھیں کو حاصل ہوگی اور یہی لوگ تسلط کے ذریعے سے، انتخاب کے ذریعے سے، جانشینی کے ذریعے سے، عطا کے ذریعے سے، خرید نے کے

ذریعے سے، اور حق جنگ کے ذریعے سے اقتدار اعلیٰ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف یہی چیزیں جاہلوں کے لیے خلاف فطرت ہوں گی۔ بے دین شخص خارج رہے گا؛ چاہے وہ دینداروں کے مقابلے میں کتنا ہی زیادہ عقلمند اور عالم کیوں نہ ہو، اسے دینداروں پر حکمرانی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس ڈومینیکی پادری نے بیان کیا ہے کہ "حقیقت میں فضل وعنایت کے بغیر اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ بے دینی کے باعث خدا سے دوری اور جدائی پیدا ہو جاتی ہے اور اقتدار اعلیٰ کی بنیاد تو خدا ہی کی عطا ہوتی ہے۔ سچ پوچھو تو بے دین شخص اقتدار اعلیٰ کا استعمال کر سکتا ہے اور خدا اس کی اجازت دے سکتا ہے۔ لیکن بے دین شخص کی صورت میں اس کی حیثیت ایسی ہو گی کہ گویا سزائیں دینے کے لیے کسی جلاد کو ملازم رکھا گیا ہو۔"

غیر مذہب والوں کے حقوق کا مسئلہ عیسائیت کے ان عظیم المرتبت اجلاسوں میں جن کو کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی کا نام دیا جاتا ہے، باضابطہ طور پر حل کیا گیا۔ پولینڈ اور لیتھوانیا کے باشندے عام طور پر عیسائیت قبول کر چکے تھے، لیکن آبادی کا ایک حصہ بت پرست ہی رہ گیا تھا۔ ٹیوٹانی سلسلے کے جنگجو راہبوں نے اسے بہانہ بنا کر پوری بے رحمی کے ساتھ پولینڈ کے بادشاہ لادِسلاس اور لیتھوانیا کے ڈیوک وِٹ ہولڈ سے جنگ کی۔ اس سے پہلے وہ ایک مرتبہ عیسائی دنیا کی رائے عامہ سے ایک واقعی اپیل کر چکے تھے اور لاطینی رسالہ "صلیبی جنگجوؤں کے عمومی جھگڑے" کے نام سے شایع کر چکے تھے جس کا ذکر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پیزا کی مجلس شورائے مذہبی کی تائید کا بھی حوالہ دیا تھا۔ سنہ ۱۴۱۰ء میں جنگجو راہبوں کے اس سلسلے کو ٹاننبرگ میں ایک بڑی سخت شکست اٹھانی پڑی تھی لیکن سنہ ۱۴۱۱ء کی

150

صلح کے باعث ان کو اس کا موقع مل گیا کہ اپنی قوتوں کو نئے سر سے جمع کریں اور اپنی بے رحمانہ مہموں کو پھر سے شروع کریں۔ پولینڈ اور لیتھوانیا کے نمائندے کانسٹنس کی مجلسِ شورائے مذہبی میں بھیجے گئے تھے اور وہاں ۶ جولائی ۱۴۱۵ء کے اجلاس میں برو ونزے تھو کے پاؤل و لاڈی میرنے (جو احکام مذہبی کا ڈاکٹر اور آگسٹینیوں کا باقاعدہ کیانن یا صدر پادری تھا نیز کراکاو کی جامعہ کا ریکٹر یا صدر بھی)، نہایت اعلیٰ قابلیت سے اس نظریے کی تائید کی کہ غیر مذہب والوں کو جبر کے ذریعے سے عیسائی نہیں بنایا جا سکتا اور یہ کہ ان کے علاقوں پر حملہ نہیں کیا جا سکتا نیز یہ کہ ان کا مال لوٹا نہیں جا سکتا خواہ شہنشاہ اجازت دے یا پوپ یا کوئی اور بنیاد پر۔

اس کی رایوں میں سے چند کا ذکر کرنا کافی ہوگا، جس سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قدر فیاضانہ طبیعت اور وسعتِ قلبی کے خیالات رکھتا تھا[1]۔ وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ اگر غیر مذہب والے "کلیسا کے گلّے میں" شامل نہ ہوں تو بھی انھیں حضرت مسیح کی بھیڑیں ہونے کا کچھ کم حق نہیں ہے کیونکہ حضرت مسیح کے لاطینی الفاظ "میری بھیڑوں کو چراؤ" میں غیر عیسائی بھی اسی طرح داخل ہیں جس طرح عیسائی۔ اقتدار، اعلیٰ، اختیار، سماعت اور اختیارات مالکانہ اس مولف کی رائے میں غیر عیسائیوں کو بھی حاصل ہوتے ہیں، اور وہ انسانی سماج کے ان حقوق سے مستفید ہوتے ہیں۔ ارضِ مقدس کی صورت حال کے متعلق جو اعتراض کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہتا کیونکہ اس پر حق جتایا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے رومی شہنشاہوں کی رہ چکی ہے اور اب حقیقت میں صرف اس چیز کو واپس لینے کا سوال ہے جو چھینی گئی تھی۔ پولینڈ کے اس فصیح البیان مقرر کو تسلیم ہے کہ

[1] فون ڈیر ہارٹ کی لاطینی کتاب "کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی کا بڑا اجتماع عام" جلد (۳) ص ۶۔

ملحدوں اور افتراق پسندوں کو ان کی جائداد سے محروم کیا جاسکتا ہے لیکن اس مولف کے خیال میں اس جائداد پر دینداد عیسائیوں کو قبضہ کرنے کے لیے قانون یا حاکم عدالت کی اجازت درکار ہوگی۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ پوپ کو، چاہے واقعے کی حد تک نہ ہو لیکن قانون کی حد تک، یہ استحقاق حاصل ہے کہ غیر مذہب والوں کے متعلق، جو قانون قدرت کے خلاف گناہ کرتے ہیں یا بتوں کی پرستش کرتے ہیں یا عیسائی مذہب پر ظلم و تعدی کرتے ہیں، اپنا اختیار سماعت چلائے۔ چنانچہ پاؤل ولاڈی میر تسلیم کرتا ہے کہ پوپ ایسے لوگوں کو مجبور کرسکتا ہے کہ عیسائی مبلغین کو اپنے ہاں آنے دیں۔ لیکن اس مولف کا بیان ہے کہ پوپ انھیں عیسائی مذہب پر ایمان لانے کے لیے مجبور نہیں کرسکتا کیونکہ اس بارے میں انھیں پوری آزادی ملنی چاہیئے کہ اپنے متعلق آپ ہی فیصلہ کریں۔ اور اس بارے میں صرف خدا کی عنایت ہی کا بول بالا ہوسکتا ہے۔ یاد رہے کہ سینٹ آگسٹائن کا بھی یہی نظریہ تھا۔

اس مسئلے کا اس موقعے پر فیصلہ نہیں ہوسکا۔ اور کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی نے ایک اور مرتبہ بھی اسی پر بحث کی۔

ایک ڈومینیکی راہب نے، جو ٹیوٹانی سلسلے کا تنخواہ یاب ملازم تھا، ایک تحریر میں پولستان (پولینڈ) کے بادشاہ پر شدت سے حملہ کیا تھا اور اس میں خاص کر اس نے اس خیال کی تائید کی تھی کہ پولستانیوں اور ان کے بادشاہوں کو قتل کرنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت بت پرست کافروں کو قتل کرنے کے۔ اس پادری کا نام یوحان فالکن برگ تھا۔ اس نے اس سے پہلے ہی کانسٹنس میں ظالم کشی کے نظریے کی، جو فرانسسکانی پادری ژاں پیتی نے پیش کیا تھا، تائید میں تقریر کی تھی اور اس طور سے اورلیاں کے ڈیوک کو برگنڈی کے ڈیوک نے جو قتل کردیا تھا اسے حق بجانب ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن

مجلس شورائے مذہبی نے اس نظریے کی تردید کر دی تھی اور برگنڈی کے ڈیوک کو خوش کرنے کے لیے اس تحریر کو بھی مردود قرار دینے سے انکار کیا تھا۔ ٹیوٹانی سلسلے کے شہامت بازوں کی حمایت کا جو نظریہ تھا، اسے مجلس شورائے مذہبی نے ۲۲/ اپریل ۱۴۱۸ء کو اپنے آخری اجلاس میں مسترد کر دیا تھا۔ برو وزے تو کے پاؤل و لاڈی میرکو پولینڈ اور لیتھوانیا کے نمایندے گھیرے ہوئے تھے اور عدالت مذہبی کا وکیل گاس پارڈ پے رُوز بھی مدد دے رہا تھا۔ چنانچہ اس پر اس نے پُرزور احتجاج کیا، اور اس کتاب کے مولف کو مردود قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ اور جب پوپ اور جلسے نے اس مطالبے کو قبول کرنے سے انکار کیا تو اس نے اعلان کیا کہ وہ آیندہ اجلاس میں مرافعہ پیش کرے گا۔

پیئیر دانکارانو ایک اہم مولف تھا، اور سیینے اور بولونیا میں مدرس بھی رہا تھا۔ پندرھویں صدی کے آغاز میں جو کلیسائی مسائل پیش آئے تھے، ان میں اس نے ایک بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ اسی مولف نے وضاحت کے ساتھ سوسیے کے ہنری کے خیال کی تردید کی تھی اور متعدد احمقانہ نتائج نکالے تھے۔

اس کے برخلاف آرنو آلبرتی نو نے جو صقلیہ کے شہر پاکتس کا اسقف تھا، سولھویں صدی کے آغاز میں یہ لکھا تھا کہ غیر عیسائیوں کو نہ تو حکومت کا حق ہے، نہ حکمران بننے کا، اور نہ اختیار سماعت چلانے کا؛ یہ کہ حضرت مسیح کی آمد کے باعث اب ان سے ہر قسم کا اقتدار اعلیٰ چھن چکا ہے؛ اور یہ کہ اگر عیسائی ان کے علاقوں پر ہلہ بول دیں، ان کو پکڑ کر غلام بنالیں، اور ان کا مال چھین لیں تو یہ جائز ہوگا کیونکہ ان چیزوں کا کوئی مالک ہی نہ ہوگا۔[1] اور لیال بین ژال بر و نو

[1] آرنو البرتی نو (ارنالڈس البرتی نس) کی لاطینی تالیف "ملحدوں کے قانون کا اعادہ"

قانون مذہبی کا پروفیسر تھا۔ اس نے بھی اسی زمانے میں ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو غیر عیسائیوں کے حق میں مضر تھا۔ چنانچہ وہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ان سے ہر ایسے علاقے میں جنگ کی جائے جو کسی نہ کسی وقت عیسائیوں کے قبضے میں رہ چکے ہوں۔ یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ کلیسا کو صرف متعرب ہی میں حکمرانی کے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ اس کا یوں جواب دیتا ہے کہ اگر دنیاوی "تلوار کام نہ دے تو روحانی تلوار اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ مزید برآں اس نے غیر عیسائیوں کا یہ حق تسلیم کیا کہ وہ ایسے علاقوں پر حملہ کرسکتے ہیں جن پر فی الحال عیسائی قابض ہوں لیکن جو اس سے پہلے انھیں غیر عیسائیوں کے قبضے میں رہ چکے ہوں۔ وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ پوپ کو جو حضرت مسیح کا نائب عمومی ہے، تمام عیسائیوں اور غیر عیسائیوں پر اختیار سماعت حاصل ہے اور وہ غیر عیسائیوں کو مجبور کرسکتا ہے کہ دینی مبلغین کو اپنے ہاں آنے دیں۔ آخر میں وہ یہ بیان کرتا ہے کہ وہ افسوس کے ساتھ یہ رائے بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ عیسائی اگر چاہیں تو غیر عیسائیوں سے معاہدے کرسکتے اور ان کے ساتھ حلیفی پیدا کرسکتے ہیں جب کہ وطن کی مدافعت پیش نظر ہو۔[1]

ژول فُرِتّی ان جنگوں کو قابل قدر قرار دیتا ہے جو کلیسا کے دشمنوں، غیر عیسائیوں اور ان لوگوں کے خلاف کی جائیں جو احکام پاپائی سے بغاوت کریں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ یہ لاطینی تالیف "قانون مذہبی کے اعادے پر چھے جلدیں" مطبوعہ کولون ۱۶۱۸ء میں شامل ہے۔ دیکھیے ج ۵ ص ۶۰۰۔

[1] ژاں بروِنو (یحنس برونے تس) کی لاطینی تالیف "ایک باب میں اعادہ قتل انسان" کتاب مجموعۂ احکام میں۔ دیکھیے حوالۂ بالا ج ۹ ص ۱۱۷۔

جو لوگ ایسی جنگ میں مارے جائیں، انھیں ابدی نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ اور جو لوگ خدا کے لیے اور کلیسا کے لیے[1]..... لڑتے ہیں وہ مقدس ترین فریضہ انجام دیتے ہیں۔"

آمرندیوں کے مسئلے سے وہ بنیادی مسئلہ خود بخود چھڑ گیا کہ غیر عیسائیوں کے خلاف جنگ کا کیا اثر ہے؟ نئی دنیا یعنی امریکہ کی فتح کے آغاز ہی سے کرسٹوفر کولمبس نے مختلف سمتوں میں اسپینی بستیاں قائم کردی تھیں۔ مختلف اراضی نو آباد کاروں میں تقسیم کردی گئی تھیں۔ اور ان لوگوں کے سپرد بظاہر امانتی طور پر امرندیوں کی ایک تعداد کردی جاتی تھی تاکہ وہ انھیں عیسائی مذہب کی تعلیم و تلقین کریں۔ جاگیروں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ مفتوح باشندے بالآخر بانٹ لیے گئے اور ان کی تقسیم کئی کئی سو خاندانوں کے قبائل میں اس طور سے کی گئی کہ ان پر مرکزی حکومت کی طرف سے آقا نامزد کیے جاتے تھے اور ان آقاؤں کا انتخاب فاتحوں میں سے ممتاز خدمات انجام دینے والوں اور شاہی عہدہ داروں میں سے عمل میں آتا تھا۔ اس تقسیم کا اثر یہ ہوا کہ امریکہ کے بدقسمت اصلی باشندے زمینوں سے وابستہ ہو گئے [اور ان زمینوں کا آقا تبدیل ہوتا تو یہ بیگار غلام بھی اس زمین کے ساتھ نئے آقا کی ملکیت میں داخل ہو جاتے۔ اور اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہ تھی] اب ایک بدترین غلامی نے ترقی شروع کی اور جلدی ہی تلخ شکایتیں سنائی دینے لگیں۔ مبلغ پادری ان خیالات کی پرزور ترجمانی کرتے تھے۔ اور ان میں سب سے زیادہ حصہ ڈومینکی

---

[1] یہاں اصل میں یہ الفاظ تھے "کلیسا کے لیے جو خدا کی زوجۂ عذرا و بے عیب ہے" (مترجم)

پادریوں نے لیا، جو برابر اس بات پر احتجاج کرتے رہے کہ امرندیوں پر مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ اس کے بر خلاف فرانسکانی پادری ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی زبان اور اپنے قلم سے ان ظلم کرنے والوں کی تائید کر چکے تھے۔

ملکہ ایزابیلا نے اسپینیوں کے طرز عمل کو ناپسند کیا۔ بادشاہ فردیناند نے ۱۵۰۸ء میں یہ اہم مسئلہ ماہرین قانون اور ماہرین دینیات کے ایک کمیشن کے سپرد کیا۔ لیکن یہ بے رحمانہ ادارہ باقی رکھا گیا۔ اور ۱۵۰۹ء میں اس کے متعلق جو قواعد بنائے گئے تو ان کی تک تعمیل نہیں ہوئی۔ اس کے نتائج ہولناک ہوئے۔ چنانچہ پادری لاس کازاس کے بیان کے مطابق (۳۸) سال کے عرصے میں ایک کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ امرندی اس کے بھینٹ چڑھے۔

بارتیلمی دے لاس کازاس کو اس بات کی عزت حاصل ہے کہ اس نے اس ہولناک برائی کو رکوانے کے لیے تمام ممکنہ کوشش کر ڈالی۔ اس نے قانون اور دینیات کی تعلیم پائی تھی اور ۱۵۱۰ء میں اس کو پادری کے طور پر قبول کر لیا گیا تھا۔ اس نے ڈومینیکی سلسلے سے تعلق پیدا کر لیا اور اُسے کیاپا کی اسقفی کے مرکز پر بلا لیا گیا۔ اس کی عمر بڑی ہوئی۔ چنانچہ ۱۵۶۶ء میں (۹۲) سال کی عمر میں وہ فوت ہوا۔ یہ پوری عمر اس نے امریکہ کے اصلی باشندوں یعنی امرندیوں کی آزادی کی حمایت میں صرف کر دی۔ توجہ دہانی، سفر، وعظ، تحریر، بحث — غرض اس شریف مقابلہ کنندہ نے کوئی چیز بھی نظر انداز نہیں کی۔ دو مباحثے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۵۱۶ء میں نو عمر بادشاہ کارل (شارل) کے، جو نیا نیا تخت شہنشاہی پر بیٹھا تھا، سامنے لاس کازاس نے امرندیوں کے مسئلے پر طویل بحث کی۔ اس کا حریف داریان کا اسقف (بشپ) ژواں دے کوے ڤے دو تھا جس کا دعویٰ یہ تھا کہ

امرندی غلام بننے ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ لاس کازاس نے احتجاج کرتے ہوئے خود "مذہب مساوات" کا واسطہ دیا کہ وہ مذہب کسی قوم سے نہ تو اس کی آزادی کو چھینتا ہے، نہ اس کے سرداروں کو۔ اور یہ بہانہ نہیں کرتا کہ قدرت ہی نے اس کو اس حالت کے لیے بنایا ہے۔

لاس کازاس نے پُر زور فیصلوں کا مشورہ دیا لیکن جرمنی کی صورت حال کے باعث بادشاہ شارل کو اس کا موقع نہ ملا کہ اس پر عمل کرتا۔

۱۵۴۲ء میں نو آباد کاروں کے مظالم امرندیوں پر کچھ اتنے زیادہ ہو گئے کہ لاس کازاس نے نئے سر سے شارل کیں کو توجہ دلائی۔ اس نے یہ بیان کیا کہ اگر پوپ عیسائی حکمرانوں کو غیر عیسائی علاقے بانٹ سکتا ہے تو وہ صرف اس غرض سے ہو سکتا ہے کہ انجیل کی تبلیغ کی جائے۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ غیر عیسائی حکمرانوں کو اپنی مملکتوں میں حکمرانی کا حق ہے اور ان کا یہ حق قانون بین الممالک یا قانون الٰہی کے خلاف کسی جرم کے ارتکاب کے بغیر ان سے چھینا نہیں جا سکتا۔

چنانچہ اس نوبت پر سے پُل تے دا کے ژاں خینیس نے اپنا ظالمانہ لاطینی رسالہ "عمومیت پسند کی رائے کے مطابق"[1] تحریر کیا۔ اور اسی زمانے میں ملکیور کانو میدان عمل میں آتا ہے۔ یہ سالامانکا میں پروفیسر تھا اور فرانسوا دے وی توریا اور انتوان رامی ریتس کا شاگرد تھا اور سے گوٹیا کا اسقف۔ اور یہ بہادری کے ساتھ یہ کہہ کر لڑتا رہا کہ امریکہ کے بیچارے اصلی باشندوں کے حقوق کسی قانون سازی کے ذریعے سے چھینے نہیں جا سکتے۔

---

[1] جس کا ذکر اوپر ص 127 پر آیا ہے (مترجم)

بارتیلمی دے لاس کازاس نے اپنی کتاب "کیا پاپ کے اسقف کے خیالات کی تائیدی دلیلیں" ماہرین قانون و ماہرین دینیات کی ایک مجلس کے سامنے پیش کی۔ یہ مجلس فالا ڈولد میں طلب کی گئی تھی۔ امرندیوں کا شریف حامی یعنی لاس کازاس اور سے پل ثے داکاثراں خینیس دونوں اس مجلس میں آکر اپنے خیالات کی مدافعت کرنے لگے۔ ژاں خینیس نے تقریر پہلے کی اس کے بعد لاس کازاس نے مسلسل پانچ نشستوں میں اپنے خیالات کی توضیح کی۔ ڈومینیک سوتو نے ان دونوں حریفوں کے دلائل کی تحلیل کی۔ لیورانتے کے بیان کے مطابق مجلس کا فیصلہ لاس کازاس کی رائے کے مطابق ہوا۔ لیکن امرندیوں کی بدقسمتی تھی کہ امرندیوں کے متعلق دیے ہوئے مشورے کی کبھی تعمیل نہیں کی گئی۔ فرانسوادے ڈی توریا نے اپنی لاطینی تالیف "دروس دینیات" میں بیان کیا ہے کہ محض اختلاف مذہب، جنگ کرنے کی جائز وجہ تحریک ہونی نہیں خیال کی جاسکتی۔ اسی طرح کسی بے دین قوم کا عیسائیت کو قبول کرنے سے انکار بھی یہی حیثیت رکھتا ہے۔ پوپ کو عیسائیوں کے متعلق دنیاوی معاملات میں صرف اتنا اختیار حاصل ہوتا ہے جتنا روحانی معاملات کے انصرام کے لیے درکار ہو۔ اور چونکہ اسے غیر مذہب والوں کے متعلق دنیاوی اقتدار بالکل حاصل نہیں، اس لیے اگر یہ غیر مذہب والے اس کے کسی بھی اقتدار کو ماننے سے انکار کردیں تو پوپ نہ تو ان کے خلاف جنگ کا اعلان کرسکتا ہے اور نہ ان کے مال پر قبضہ۔ اس مولف کی رائے میں اگر پوپ نے اسپینیوں کو نئی دنیا میں انجیل کی تبلیغ کا کام سپرد کیا ہے، تو دیگر اقوام کے مقابلے میں ان کو یہ کام سپرد کرنا زیادہ بہتر تھا۔ بے شبہہ ناواقفوں کو دین کے متعلق تعلیم دینے کا فریضہ تمام عیسائیوں پر

عائد ہوتا ہے، لیکن کلیسا کے صدر ہی کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ مذہب کے مفاد کا لحاظ کرے اور پھر دین کے پھیلانے کا کام سب قوموں کو چھوڑ کر کسی ایک معین قوم کے سپرد کرے۔

فرانسوا دے ڈی توریا کی لاطینی کتاب "دروس دینیات" میں کلیسائی اقتدار کے متعلق درس سب سے اول ہے۔ اور اس درس میں مولف نے پوپ کی حیثیت سے بحث کی ہے اور کشوری [یعنی غیر مذہبی] اقتدار کے حقوق کی حمایت کی ہے۔ اس نے ماہرین قانون اور ماہرین مذہب کے اس خیال کو غلط کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ پوپ دنیاوی معاملات میں بھی دنیا کا آقا ہو اور یہ کہ اسے تمام بادشاہوں کے متعلق اقتدار اور حق سماعت حاصل ہو۔ ڈی توریا نے بیان کیا ہے کہ یہ محض ذلیل خوشامد ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "پوپ بادشاہوں کو کوئی اقتدار نہیں عطا کرتا کیونکہ کوئی شخص کوئی ایسی چیز دے نہیں سکتا جو خود اسے حاصل نہ ہو۔ پوپ آقا نہیں ہے۔ دنیاوی اقتدار کلیسائی افسروں کے وجود میں آنے کے پہلے سے پایا جاتا ہے اور حضرت مسیحؑ کی آمد سے قبل بھی بادشاہ پائے جاتے تھے۔ حاشیہ نویسوں نے بتایا ہے کہ اسی کے مماثل اختیار پوپ کو ہوتا ہے حالانکہ وہ خود دولت اور علم میں غریب اور فرومایہ تھے۔" اس نے مزید برآں یہ بھی بیان کیا ہے کہ "بادشاہوں کا کشوری اقتدار کسی طرح بھی پوپوں کے دنیاوی اقتدار کے تابع نہیں ہے۔"

اس کے کوئی ساٹھ سال بعد توماس کامپانلا نے نیپلز کے قید خانے میں "حضرت مسیحؑ کی بادشاہت" کے نام سے ایک لاطینی کتاب تالیف کی جس میں اس نے تلخ لہجے میں ڈومینیک سوتو کی (جو سالامانکا کے بے مثل استاد یعنی ڈی توریا کا شاگرد تھا) تنقید کی ہے۔ اس نے بھی پوپ کے لیے سوائے روحانی معاملات کے

کوئی اور اقتدار کا ہونا تسلیم نہیں کیا ہے۔ کامپانلاؔ کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ پوپ کو اولیت اور برتری حاصل ہو اور اس کی رائے میں یہ اولیت موجود بھی ہے۔ کیونکہ حضرت مسیحؑ کی آمد اس دنیا میں سنہرا دور قائم کرنے کے لیے ہوئی تھی اور آپ نے اپنا ابدی قانون وضع کردیا ہے، نیز آپ نے ایک واحد اقتدار قائم فرما دیا ہے۔ اور تمام حکمران قانونِ الٰہی اور قانونِ انسانی ہر دو کے باعث دنیاوی اور روحانی سب معاملات میں اسی واحد اقتدار کے ماتحت ہیں۔[1]

ڈومینیک سوتو کا ابھی ہم نے ذکر کیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کرنے کے قانون پر ایک خصوصی تالیف کرے گا جس کا (لاطینی) نام "انجیل سے ماخوذ وجوہ" ہوگا۔ اس نے اپنے خیالات کی جو توضیح اپنی لاطینی تالیف "انصاف اور حق" میں کردی ہے اس کے باعث ہم مذکورہ کتاب کو بالکلیہ نظر انداز کرسکتے ہیں۔

اس نے غیر مذہب والوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ اولاً وہ غیر مذہب والے ہیں جو فی الواقعہ بھی اور بالاستحقاق بھی عیسائی حکمرانوں کے تسلط میں زندگی گزارتے ہیں۔ چنانچہ اسپین میں عربوں اور یہودیوں کی یہی حالت تھی۔ اور جرمنی اور اٹلی میں یہودیوں کی اب بھی یہی حالت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بادشاہوں کو ان کے متعلق کارروائی کا حق

---

[1] توماس کامپانلا کی لاطینی کتاب "حضرت مسیحؑ کی بادشاہت" مطبوعہ ۱۶۳۳ء اس بالکل غیر معروف کتاب میں اس ممتاز شہید نے اپنے خیال کی مکمل توضیح کی ہے۔ اس بارے میں ہمارا مضمون جو "فرانسیسی رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی" جلد (۲۱) میں ہے دیکھیے ص ۲۶۱۔

حاصل ہوتا ہے اور وہ انھیں ان کے مال سے محروم بھی کر سکتے ہیں۔
غیر مذہب والوں کی دوسری قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو،
چاہے واقعے کی حد تک نہ ہوں لیکن، قانونی حد تک عیسائی حکمرانوں
کے ماتحت ہیں۔ سوتو اس سے ایسے لوگ مراد لیتا ہے جو
ان علاقوں پر قابض ہوں جو سابق میں عیسائیوں کے تھے۔ اور
وہ کہتا ہے کہ "یہ ظاہر ہے کہ ہم ان کے خلاف جنگ کا اعلان
کر سکتے ہیں اور ان کے مقبوضات چھین سکتے" ہیں۔ لیکن بہر حال
کسی انفرادی طور سے سفر کرنے والے عیسائی کو جو ان کے
ملک میں جائے، "یہ اختیار نہ ہوگا کہ ان کی چیزیں چھین سکے"۔
تیسری قسم ان غیر مذہب والوں کی ہے جو عیسائی حکمرانوں کی
اطاعت نہ تو واقعے کی حد تک کرتے ہیں اور نہ استحقاق کی
حد تک۔ اور یہ عیسائیت کے دشمن نہیں ہیں۔ اور یا تو عیسائیوں
کو جانتے ہی نہیں یا ان کا نام تک بھول چکے ہیں۔ کیا ایسوں
سے جنگ کی جا سکتی ہے؟ سوتو بیان کرتا ہے کہ سوال یہ
نہیں ہے کہ آیا بت پرستی پر سزائے موت دی جانی چاہیے۔
بلکہ اصل میں سوال یہ ہے کہ جو شخص بت پرستوں کے خلاف
جنگ کرنے کا دعویٰ کر رہا ہو، آیا اس کو اس بات کی اجازت
مل چکی ہے؟ واضح ہو کہ ایسی کوئی اجازت پائی نہیں جاتی۔[1]
آوگس بورگ کا تعصب سے اندھا کیا نن یعنی صدر پادری
گونارد براؤن رحم و کرم سے یکسر عاری نظر آتا ہے۔ اور اس
کی رائے میں دین کے دشمنوں کے خلاف جو بھی جنگ کی جائے
وہ جائز ہے۔[2]

---

[1] ۔ دوحی نیک سوتو کی لاطینی تالیف "انصاف اور حق" کتاب ۵ مسئلہ ۳ بحث ۵۔

[2] ۔ (لاطینی) میں "جو جنگ عیسائی اپنے دین کے دشمنوں سے کریں وہ حقیقت میں

گُفارُ و ثیاس نے بھی وہی رائے ظاہر کی ہے جو سوتو نے۔ اور وہ زور و شور سے سوسے کے ہنری کی اس رائے کی مخالفت کرتا ہے کہ محض غیر مذہب کا ہونا جنگ کی جائز وجہ ہو؛ اور یہ کہ خدا نے غیر عیسائیوں سے شاہانہ اقتدار چھین لیا ہے اور وہ اقتدار عیسائیوں پر منتقل کر دیا ہے۔ اور گُفار و ثیاس بیان کرتا ہے کہ نہ تو پوپ اور نہ ہی شہنشاہ اس بات کے مجاز ہیں کہ کسی حکمران کے خلاف محض اس بنا پر جنگ کریں کہ وہ غیر عیسائی ہے۔ گراتیان کے حکنامے کی رو سے عربوں کے خلاف اس صورت میں جنگ جائز ہے جب کہ وہ عیسائیوں پر ستم ڈھائیں یا ان کو نکال باہر کریں۔ لیکن محض غیر عیسائی ہونے سے وہ حق چھن نہیں جاتا جو قانون انسانی پر مبنی ہے، اور قانون انجیل کے بھی پہلے سے چلا آتا ہے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی نے بہر حال وائیکلف اور ہسوس کی اس رائے کو مردود ٹھیرادیا ہے کہ مالک ہونے کے متعلق اگر کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہوا ہو تو ملکیت ہی کا حق ختم ہو جائے گا۔ بے شبہہ گُفارُ و ثیاس نے غیر مذہب والوں سے اس صورت میں جنگ کو جائز قرار دیا ہے جب وہ عیسائیوں کے قدیم صوبوں پر قابض ہوں یا عیسائیوں پر ستم ڈھائیں یا اس حکمران کی اطاعت سے انکار کریں جس کے وہ ماتحت ہوں یا اپنے ملحدانہ بیانات کے باعث انجیل کے پرچار میں روڑے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ حق بجانب ہوتی ہے۔ مزید برآں وہ عیسائیوں کے لیے مفید بھی ہے کیونکہ اس طرح جو جنگ مذہب اور دین کی حمایت اور خدا کا بول بالا کرنے کے لیے کی جائے گی اس کے تحت ان تمام علاقوں اور ملکوں پر حملہ کیا جاسکے گا جو غیر عیسائیوں کے ناجائز قبضے میں ہوں اور جنگ کے زور سے وہ اپنے حقیقی مالکوں یعنی عیسائیوں کو واپس دلائے جاسکیں گے۔"

اٹکا رہے ہوں۔

غیر مذہب والوں سے حلیفی کا مسئلہ ۱۵۶۶ء میں بحث میں آیا جب سلطان سلیمان دوم نے عمانوئیل فلی بیر کو اس شرط سے قبرص کی بادشاہت کا پیشکش کیا کہ وینیس کے خلاف وہ حلیف بن جائے۔

ساؤائے کے ڈیوک کی مجلس مشورت میں جو قانون داں رکن تھے ان میں پیئیری نوبلی اور اکتاثیاں کاشراں بھی شامل تھے۔ بلی نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ غیر مذہب والوں سے حلیفی اس صورت میں جائز ہوگی جب بعض اور غیر عیسائیوں سے لڑنا مقصود ہو۔ کاشراں نے ایک لاطینی رسالہ لکھا جس کا نام یہ ہے: "مقالہ اس امر کے متعلق کہ آیا مسیحی اصول کے تحت یہ امر جائز ہے کہ اپنی اور اپنے متعلقین کی جائداد کی حفاظت کے لیے غیر مذہب والوں سے حلیفی پیدا کریں اور ان کے دوست بنیں اور دیگر حکمرانوں سے لڑنے کے لیے ان سے مدد لیں؟" اس نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ عیسائی حکمران نہ تو ترکوں سے حلیفی کا معاہدہ کرسکتا ہے اور نہ ہی عیسائیوں کے خلاف ان سے مدد مانگ سکتا ہے، چاہے اپنی ذاتی مدافعت ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔

بالتازار دے آیالا نے غیر عیسائیوں کے متعلق کفارؔ و قیاس کا جو نظریہ تھا، اسی سے اتفاق کیا ہے۔ جہاں تک ملحدوں کا تعلق ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ان سے جنگ جائز ہے۔ اور وہ اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ غیر مذہب والوں سے جو جنگ کی جائے وہ منصفانہ سمجھی جائے گی جب کہ یہ لوگ انجیل کے پرچار میں آڑے آرہے ہوں۔[۱] جنتی لیس کی رائے ہیں کہ

[۱] آیالا کی لاطینی تالیف "جنگ کے قواعد و قوانین اور فوجی ضبط"، کتاب ۱

محض مذہب کی بنا پر جنگ کرنا درست وجہ سمجھی جا سکے۔ یہ خود عدم رواداری کا شکار ہو چکا تھا اور اپنے عقائد کی بنا پر اسے مصیبتیں بھگتنی پڑی تھیں۔ اسی لیے اس نے اپنی کتاب کے ایک نہایت ہی عمدہ صفحے میں بڑے شریفانہ خیالات کا پرچار کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ مذہب انسان اور خدا کے رشتے کا نام ہے اور مذہب کو اس کے سوا کسی اور بات کا حق نہیں کہ حقوق انسانی ادا کرے[1]۔

بدقسمتی سے جنٹی لیس اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اپنے یہ جذبات ہر جگہ برقرار رکھ سکے۔ چنانچہ اپنی اسی کتاب کی ایک اور جگہ اس نے یہ تسلیم کیا ہے کہ عیسائیوں اور ترکوں میں ایک غیر مصالحت پذیر جنگ پائی جاتی ہے۔ ذرا تکلف سے کام لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس عبارت سے ایک واقعے کا اظہار کرنا مقصود ہے، ایک نظام کی تشریح اتنا زیادہ مقصود نہیں، جسے دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ترکوں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ باب ۲، ۲۹ و مابعد۔

[1] چنانچہ (لاطینی میں) "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کوئی شخص محض مذہبی وجوہ سے جنگ کا اعلان کر سکتا ہے؟ مجھے اس سے انکار ہے۔ اور اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ مذہب کا فریضہ اور رشتہ انسان اور انسان کے مابین نہیں ہوتا [بلکہ انسان اور خدا کے]۔ اسی لیے مذہب کی خاطر اعلان جنگ جائز نہیں۔ مذہب کا تعلق خدا سے ہے۔ وہ ایک ربانی حق ہے۔ وہ انسان اور خدا کے مابین ہوتا ہے۔ وہ کوئی انسانی حق نہیں جو انسان اور انسان کے مابین رہو۔ اسی لیے مذہب میں اختلاف رکھنا کسی انسانی حق کی خلاف ورزی نہیں سمجھی جا سکتی" (البیریکس جنٹی لیس کی تالیف "قانون جنگ" کتاب اول باب (۹) آیا مذہب کی بنا پر جنگ جائز ہے؟)

سے عیسائی ایک جائز جنگ لڑ رہے ہیں کیونکہ ترک معاندانہ برتاؤ کر رہے ہیں[1]۔ لیکن اور آگے بڑھیں تو شبہہ بالکل باقی نہیں رہتا جب کہ جنتی لیس نے اس سوال سے بحث کی ہے کہ آیا دوسرے مذہب والوں سے معاہدے کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اس سوال کا تعلق جزءِ دینیات سے ہے اور دینیات کے نقطۂ نظر سے عیسائی مملکتوں اور غیر عیسائی مملکتوں میں تجارتی کاروبار جائز ہے۔ جس چیز کی ممانعت ہے وہ ایسی حلیفی ہے جو عیسائی اور غیر عیسائیوں میں اس غرض کے لیے عمل میں لائی جائے کہ غیر عیسائیوں سے جنگ کی جائے، اور اس سے بھی زیادہ اس غرض سے کہ اس حلیفی کے ذریعے سے خود عیسائیوں سے جنگ کی جائے[2]۔

ولیم فل بک ایک انگریز تھا۔ وہ اس نظریے کی مخالفت کرتا رہا کہ غیر عیسائیوں سے صرف ان کے غیر عیسائی ہونے کی بنا پر جنگ کرنی جائز سمجھی جائے۔ بلجیم کے مشہور مولف زوست لپ سے بھی اسی نظریے کی تائید کرتا ہے۔ اس زمانے میں دنیائے علم و تصنیف کے مثلث کے تین زاویے زوست لپ سے اور نیوزہ ٹ اسکالی گر

---

[1] ۔۔ (لاطینی میں) "ترک ہمارے دشمن ہیں اور ہماری تاک میں لگے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے سخت خطرہ ہیں۔ جب کبھی ان کو موقع ملتا ہے تو وہ ہمیشہ ہماری چیزیں ہر ناجائز وسیلے سے ہم سے لوٹ لیتے ہیں۔ اسی لیے ترکوں سے لڑنے کی ہمیشہ ایک جائز وجہ موجود ہے۔ کیا ان سے عہد شکنی نہیں کی جاسکتی؟ —— نہیں۔ کیا ان لوگوں کے خلاف جنگ نہیں کی جاسکتی جو خاموش اور پر امن ہوں اور جو ہمیں بالکل نہیں ستاتے؟ —— نہیں۔ لیکن ترک ہمارے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں تو؟" ایضاً، کتاب اول، باب ۱۲،

[2] ۔ جنتی لیس کی لاطینی تالیف "قانون جنگ"، کتاب ۳، باب ۱۹۔

اور کاسوبوں سمجھے جاتے تھے۔ فُل بک نے اول الذکر کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ اس کے جنگجویانہ اور اُبلنے والے مذاق سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ سیاست دانی سے بے بہرہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہ تو سانپ کے جیسا ہوشیار تھا اور نہ کبوتر کی طرح سادہ اور مسکین۔

سُوارِیتس یہ بیان کرتا ہے کہ عیسائی نہ ہونا جنگ کرنے کی کوئی جائز وجہ نہیں ہوسکتا۔ اور وہ لکھتا ہے کہ "خدا نے آدمیوں کو نہ تو اس کا فریضہ سپرد کیا ہے اور نہ اختیار کہ خود خدا کے اپنے خلاف جن جرائم کا ارتکاب ہوا ہو، ان کا انتقام یہ لوگ لیں۔ بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بربریت پسندوں میں حکمرانی کرنے کی صلاحیت کم پائی جاتی ہے۔ اور یہ دلیل ارسطو سے اڑائی گئی ہے لیکن اس دلیل کا استعمال اس کی عمومی نوعیت میں کرنا خطرناک ہوگا[1]۔"

فرانسس بیکن اس بات میں کامیابی حاصل کرسکتا تھا کہ قانون بین الممالک کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دے۔ جان سیلڈن اور ٹامس ہابس کی طرح وہ قانون بین الممالک کی بہت ہی کم مدد کرسکا۔ وہ اپنی تالیفوں کے بعض صفحوں میں جنگ اور اس کے جواز کے مسئلے سے بحث کرتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ "جنگیں قانون کی اعلیٰ ترین آزمائشیں ہیں اور جو حکمران اور مملکتیں زمین پر اپنے سے برتر کسی اقتدار کو تسلیم نہیں کرتیں وہ جنگ کے ذریعے سے اپنا معاملہ خدا کے انصاف کے بیچ پیش کرتی ہیں تاکہ قادر مطلق کو جس فریق کے حق میں مناسب

---

[1] سوارِیتس کی لاطینی تالیف "سہ گانہ دینیاتی خوبی یعنی ایمان، امید اور عفو پر کتاب" حصہ سوم "عفو"، بحث ۱۳ "جنگ"، فصل ۵۔

معلوم ہو فیصلہ صادر کرے اور اِن کے جھگڑوں کو چکائے۔" مقدس جنگ سے بحث کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ مذہب کی خاطر اقدامی جنگ شاذ ہی صورتوں میں درست قرار دی جاسکتی ہے۔ بلکہ شاید کبھی بھی درست نہ قرار دی جائے۔ بجز اس کے کہ اس کے ساتھ دنیاوی لحوظات بھی خلط ملط ہو جائیں۔ لیکن ایک عجیب سے مکالمے میں، جو ناتمام ہی رہا، یہ نظر آتا ہے کہ بیکن اس نظریے کی طرف جھک گیا ہے کہ غیر مذہب والوں سے جنگ کرنی جائز ہے۔ گو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنا صحیح خیال اس ڈر سے ظاہر نہ کیا ہو کہ کہیں بادشاہ جیمس اول ناراض نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس مکالمے میں جیمس اول اور اسپین کی حلیفی کی تجویزوں کو خوب سراہا گیا ہے[1]۔ اس تالیف میں غالباً بیکن نے اس رسالے سے مدد لی ہے جو ۱۶۲۵ء میں شایع ہوا تھا اور جو بادشاہ چارلس اول کی طرف منسوب ہے جس کا انگریزی نام یہ ہے: "جنگ کے متعلق آزاد خیالی کا مکتب یا اس امر سے بحث کا رسالہ کہ آیا کسی دوسرے مذہب والے حکمران کی خدمت کے لیے ہتیار اُٹھانا جائز ہے"

اس اہم مسئلے کے متعلق مولفین کے جذبات یہی رہے یہانتک کہ گروتیوس نے اپنی لاطینی کتاب "قانون جنگ و صلح" تالیف کی۔ جیساکہ اس کے متعلق ٹھیک کہا گیا ہے، اس نے اس خیال کی تائید کی کہ مذہب کے اختلاف کو جنگ کی جائز وجہ تسلیم کیا جائے تو حقیقت میں یہ قانون بین الممالک ہی کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اس مشہور مولف کے پیشروؤں ہی میں متعدد ایسے لوگ گزر چکے تھے جو اس رائے کے قطعاً مخالف تھے۔

---

[1] بیکن کی انگریزی تالیف "ایک مقدس جنگ کا اشتہار"۔

یہ بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ خود گروتیوس اس معاملے میں اتنا زیادہ آگے بڑھا ہوا نہیں ہے جتنا متعدد دیگر مولف جن کا ہم اب ذکر کریں گے۔ چنانچہ ایک مشہور جلے میں گروتیوس اپنے اس رجحان کی کم پردہ داری کرتا نظر آتا ہے کہ عیسائیوں کو باہم ان لوگوں کے خلاف عام حلیفی کرلینی چاہیے جن کو گروتیوس نے "مذہب کے دشمنوں" کا نام دیا ہے[1]۔

واقعات سبق آموز ہیں۔ ساتویں سے دسویں صدی عیسوی تک عربوں کی حملہ آوری کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور وہ شمالی افریقہ کے پورے ساحل پر چھا جاتے ہیں۔ کورسیکا، سارڈینیا، صقلیہ اور جزائر بالیار پر قبضہ کرلیتے ہیں اور اسپین اور اٹلی میں گھس کر خود فرانس کو دھمکانے لگتے ہیں جہاں کہ شارل مارتل نے ان کی پیشقدمی کو روکا تھا۔ عرب عیسائیت کے ساتھ ایک مکمل مخاصمت کی حالت میں ہوتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں عیسائیت کو غلبہ حاصل ہونے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ عیسائی ان علاقوں کو دوبارہ فتح کرلیتے ہیں جن پر ان کے دین کے دشمنوں نے قبضہ کرلیا تھا اور مسلمانوں کے خلاف مہمیں روانہ کی جانے لگتی ہیں۔ نارمنوں نے صقلیہ کو فتح کرلیا تو حقیقت میں یہ صلیبی جنگوں کا آغاز تھا۔

اس زمانے میں عیسائیوں اور عربوں کے بعض تعلقات پہلی نظر میں ہمیں حیرت زدہ کردیتے ہیں۔ شمالی افریقہ کے سلطانوں اور پوپوں میں بے خرخشہ اور دوستانہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مثال کے طور پر پوپ گریگری نے مراکش کے

---

[1] ۔ گروتیوس کی تالیف "قانون جنگ و صلح" کا فرانسیسی ترجمہ از باربیراک کتاب ۲ باب ۱۵ ف ۱۲۔

بادشاہ کے پاس شہر فاس کے اسقف کے لیے سفارش کی تھی۔ چوتھا انوسنٹ، تونس اور بوجی (الجزائر) کے حکمرانوں سے پرزور التجاؤں کے ذریعے سے اپنے ان قلیل ہم مذہبوں یعنی عیسائیوں کی حفاظت کی خواہش کرتا ہے جو ان ممالک میں جنگی قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے یا عیسائی گرجاؤں میں خدمت کرنے کے لیے رہتے تھے۔ اسی چوتھے انوسنٹ نے سنہ ۱۲۴۶ء اور سنہ ۱۲۵۱ء میں مراکش کے بادشاہ سے یہانتک خواہش کی تھی کہ ساحلی شہروں کو محفوظ قرار دیا جائے جہاں اس کے افریقی مقبوضات کی عیسائی آبادی امن سے رہ سکے۔ سنہ ۱۲۹۰ء میں پوپ نکولاس نے ان عیسائیوں کے نام ایک فرمان جاری کیا جو مراکش، تونس، اور تلمسان کے سلاطین کی فوجوں میں بطور سپاہی ملازم تھے۔ ان عیسائیوں سے پوپ نے پرزور خواہش کی کہ اجنبیوں میں گھرے ہوئے رہ کر وہ عیسائی اخلاق و آداب کو کبھی مجروح نہ کریں۔[۱] آیندہ ہم ان تجارتی معاہدوں سے بحث کریں گے جو عیسائیوں اور مسلمانوں میں طے ہوئے تھے۔ یہاں صرف اس چیز کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جب ضرورت پیش آئی تو عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کی امداد کی ضرورت کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ تیسرے فردیناند کے بارہ ہزار قسطیلہ کے سواروں سے مدد لے کر خلیفہ مامون[۲]، افریقیہ میں داخل ہوتا ہے اور سنہ ۱۲۲۸ء میں

---

[۱] ۔ اسس لاتری کی فرانسیسی تالیف "امن اور تجارت کے لیے معاہدے اور دیگر مختلف دستاویزیں جو قرون متوسط میں شمالی افریقہ میں عیسائیوں اور عربوں کے تعلقات سے متعلق ہیں"۔

[۲] ۔ اس سے خانوادہ موحدین کا حکمران مراکش مراد ہے۔

(مترجم)

مراکش پر قبضہ کرلیتا ہے۔ یہ اسپینی سپاہی اس کے بیٹے کے ہاں بھی تنخواہ یاب ملازم رہے اور انھیں کے متعلق پوپ چو تھے انوسنٹ نے سفارش کی تھی۔ عرب مولف ابن خلدون نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مغرب جس میں طرابلس سے مراکش تک کا شمالی افریقہ کا ساحلی علاقہ داخل ہوتا ہے، یہاں کے حکمران "حملہ کرو اور واپس چلے جاؤ" کے اصول پر کار بند رہے۔ انھیں ایک ایسے امدادی سلسلے کی ضرورت تھی کہ مشاق لوگوں کی مدد سے وہ اپنا قبضہ مستحکم رکھ سکیں۔ چنانچہ وہ ان فوجوں میں یورپ والوں کو بھرتی کرتے تھے۔ بلکہ اس حفاظتی دستے کا بھی یہی حال تھا جو کسی لڑائی کے دوران میں ان کو گھیرے رہتا۔ ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ "بے شبہہ اس کے معنے یہ ہیں کہ کافروں سے مدد لی جائے۔ لیکن یہ سلاطین اس کو ذرا بھی برا نہیں سمجھتے تھے وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ مزید برآں وہ فرنگیوں کو صرف ان عربوں اور بربروں کے خلاف استعمال کرتے تھے جن کو مطیع بنانا مقصود تھا اور وہ ان یورپیوں کو ان لڑائیوں میں استعمال نہیں کرتے تھے جو عیسائیوں کے خلاف لڑی جاتی تھیں کیونکہ ایسی صورت میں ان امدادی فوجوں کا ساز باز کرلینا ممکن ہوگا۔"
دوسرے فرڈرک کو اس کے ہمعصر زمانے میں اس لیے بڑی فضیحت ہوئی تھی کہ اس نے مراکش، تونس اور قاہرہ کے حکمرانوں سے مسلسل اور باضابطہ تعلقات رکھے تھے۔ اس نے افریقہ کے ساحلی علاقوں سے ایسے جہات بندوں کو بھرتی کرکے اپنی ان فوجوں کی تکمیل کی جو اس نے اٹلی کے صوبہ کاپی تانات کے شہر لوچیرا میں تیار کی تھیں؛ اور صقلیہ کی بچی کھچی عرب آبادی کو اس نے اسی مقام پر لا منتقل کردیا تھا۔ جب یہ بادشاہ بیت المقدس گیا تو مسلمان سپاہی بھی اس کے ساتھ رہے

161

اور نماز وغیرہ عبادتیں اپنے مذہب کے مطابق انجام دیتے رہے[1]۔
تیرھویں صدی کے اواخر سے عثمانی ترکوں کی قوت کا آغاز ہوتا ہے اور عیسائی شام میں اپنا آخری مقبوضہ یعنی عکہ بھی کھو دیتے ہیں، اور یونانی بھی بحیرۂ بوس فور کے پرے ان کا جو آخری مقبوضہ تھا اس سے محروم ہو جاتے ہیں۔ سلجوقی سلطنت ترک یا ترکمان حکمرانوں میں بٹ گئی تھی لیکن سلطان عثمان نے جلدی ہی ان سب کی قوت کو گھن لگا دیا اور عثمانلیوں نے اپنے فتوحات وسیع کرنے شروع کر دیے[2]۔ ڈیڑھ صدی بعد مغربی یورپ نے یونانی شہنشاہت کو تباہ ہو جانے دیا۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ پوپ آخری لمحے تک یہی اعلان کرتا رہا کہ وہ قسطنطنیہ کی مدد کے لیے اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک کہ وہ روما کی روحانی برتری کو تسلیم نہ کرے۔ کوئی چالیس سال بعد ایک اور پوپ یعنی چھٹے الگزانڈر نے سلطان کے پاس ایک سفیر روانہ کیا تاکہ مشرقی شہنشاہت کے خلاف آٹھواں شارل جو منصوبے سوچ رہا تھا انھیں بے نقاب کرے۔ اور اس نے سلطان سے رقمی مدد طلب کی تاکہ فرانسیسیوں سے لڑ سکے اور ساتھ ہی اس نے یہ توقع ظاہر کی کہ ان مشکل زمانوں میں سلطان اسے اپنی دوستی کا یقین دلائے گا۔ پوپ چوتھے نکولاس نے عیسائی قوموں کو غیر مذہب والوں سے معاہدے تک کرنے سے روک دیا تھا اور ایسے معاہدوں کو کالعدم قرار دیا تھا۔

---

[1] ہوئیار برے اول کی لاطینی تالیف "دوسرے فریڈرک کے سفارتی کارنامے" دیباچہ ص ۳۷۳۔

[2] ڈپنگ کی فرانسیسی تالیف "تاریخ تجارت مابین مشرق و یوروپ از حروب صلیبیہ تا قیام نو آبادی ہائے امریکہ" جلد دوم صفحہ ۲۰۵۔

ان دونوں پوپوں کی راہوں میں کیا کچھ نہ انقلاب ہوگیا تھا!۔
فرانسوا اول نے شارل کین سے جو جنگ کی تو اس وقت بین الممالک عمومی سیاسیات میں غیر مذہب والوں سے حلیفی کرنے کا مسئلہ پیش ہوکر آخری طور سے تسویہ پاگیا۔

۲۴ فبروری ۱۵۲۵ء کو فرانس کا بادشاہ پاڤیا کے مقام پر قید کرلیا گیا تھا۔ دسمبر میں مجریط (میڈرڈ) کے اس قیدی کا ترکی سلطان کے نام ایک خط پہنچا جس میں اس نے "اس سلطان اعظم اور مالک زمانہ سے التجا کی کہ ایک مغرور کو ڈھکیلنے کے لیے مدد دے"۔ سافاہیے کے لوئیس کا بیٹا جب شارل کین کے ہاتھوں قید ہوگیا تو اس نے بھی اسی طرح ایک کوشش سلطان سلیمان ثانی کے ہاں کی تھی۔ اس کا جواب سلطان نے ایک اثر انداز پیام کے ذریعے سے دیا تھا جس میں اس نے لوئیس کو تسلی دی تھی مگر سلطان جلدی ہی ہنگری، شام اور آسٹریا کے آرک ڈیوک کے علاقوں میں منہمک ہوگیا۔ ۱۵۳۵ء میں فرانس کے بادشاہ اور "امیرالمومنین" میں ایک معاہدہ طے پایا۔ ۱۵۴۳ء میں یہ بھی دیکھا گیا کہ بار بروسہ کی کپتانی میں ترکی بیڑا آیا اور فرانسوا اول کے بیڑے کے ساتھ مل کر بندرگاہ نیس کا محاصرہ کرلیا۔

اس نہایت راسخ العقیدہ عیسائی حکمران کے طرز عمل کی تائید کرنے والے بھی متعدد پیدا ہوگئے۔ بلیز ڈ مونت لوک جو پاڤیا کی جنگ میں بھی موجود تھا اور مذہبی لڑائیوں کے سلسلے میں ہیوگنو فرقے والوں سے ہولناک شدت کے ساتھ جنگ کرچکا تھا، اب وہ اپنے بادشاہ کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے ہر قسم کی لکڑی کے تیر بنائے جاسکتے ہیں۔ رہا میں، اگر میں دوزخ کی تمام پلید روحوں کو بھی بلاسکوں تاکہ میرے دشمن کا

ہر کچلیں جو میرا سر کچلنے کے لیے آیا ہو، تو میں ان کو بھی بڑی
خوشی سے بلاؤں گا۔ خدا مجھ کو یہ چیز معاف کردے۔" اس کے
بھائی کا نام ژاں ڈمونت لوک تھا۔ یہ بلنیہ اور دِیپے کا اسقف تھا
سچ پوچھو تو یہ ملحدانہ خیالات کی طرف مائل تھا۔ تے بیس کی سینیٹ
میں اس نے فرانسوا اول کی حمایت کی اور شارل کیں کے طرفداروں
کے متعلق، جو اس بادشاہ کے خلاف تنقیدیں کر رہے تھے، اس
نے یہ بیان کیا کہ "ان لوگوں کو پتا نہیں کہ اس بادشاہ کو ملامت
کرتے ہوئے یہ حضرت داؤدؑ پر بھی الزام عائد کردیتے ہیں حالانکہ
حضرت داؤدؑ ایک قابل قدر بادشاہ اور مقدس نبی تھے لیکن جب
ان کا طالوت ساؤل نے، جو ایک بت پرست بادشاہ تھا، پیچھا کیا
تو حضرت داؤدؑ بھاگ گئے تھے۔" اس نے پوپ تیسرے پاؤل کے
نام جو معذرتی و تائیدی بیان بھیجا تھا، اس میں اس نے بادشاہ
فرانسوا اول کے متعلق نہایت اہم امور ملحوظ رکھنے کی ضرورت جتائی ہے
چنانچہ اس نے یہ لکھا تھا کہ "ترک انسانی سماج سے اتنا باہر نہیں ہیں
کہ ہم وحشی جانوروں سے تو تعلقات رکھ سکیں اور ان غیر مذہب والوں
سے نہ رکھ سکیں۔ اگر ایسا ہو تو ہم ان رشتوں کو ماننے سے قاصر
رہیں گے، جو خود قدرت نے انسانوں میں قائم کیے ہیں۔ سب
انسان ایک ہی آدمؑ و حواؑ سے پیدا ہوئے ہیں۔ انسانوں میں
باہم پوری مشابہت ہے۔ اور ایک انسان میں جو چیزیں ہوتی ہیں
وہی دوسرے میں ہوتی ہیں۔ کچھ فرق نہیں ہوتا۔ اگر قوموں میں
تقسیمیں عمل میں آگئی ہیں، تو اس کا باعث یہ نہیں ہے کہ قدرت
نے ان کو جدا کیا ہے؛ بلکہ مختلف اخلاق و عادات نے۔ اس کا
نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی قوم کے افراد میں ناگزیر طور پر زیادہ
قریبی تعلقات پیدا ہوجاتے ہیں، اور دیگر مملکتوں سے وہ روابط
نہیں ہوسکتے۔ لیکن یہ فرق اس حد تک نہیں پہنچتا کہ خود اس اتحاد کو

توڑ دیا جائے جو ہم جدّی کے باعث بنی نوع انسان کے مختلف افراد میں پایا جاتا ہے۔ اگر خون اور وطن کے تعلقات سے نوع انسانی کے عمومی سماج اور خصوصی سماجوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے، تو یہ بھلائی کی جگہ ایک برائی ہوگی۔ انسانوں کی غلطیاں اور ان کی خامیاں اِن کے اس بات میں مانع آتی ہیں کہ ایک ہی مذہب اختیار کر کے اتحاد پیدا کریں۔ لیکن جس طرح رسم و رواج کے اختلاف سے انسانوں کا قدرتی معاشرہ تباہ نہیں ہو جاتا، اسی طرح اختلافِ مذہب کا بھی حال ہے[ٰ]"۔ یہ بڑے شاندار الفاظ ہیں جو دورِ جدید کے آغاز کے شایانِ شان ہیں۔ بے شبہہ ان الفاظ کے کہلوانے کا باعث ایک خاص مفاد تھا، لیکن وہ مفاد ایک نامعلوم طور پر حق اور انصاف کا آلۂ کار بن گیا۔ سولھویں صدی کے نصفِ اول سے یہ عظیم صداقت مسلمہ طور پر مضمر سمجھی جانے لگی کہ قانون بین الممالک کا دائرہ ایک معینہ مذہب کے حدود سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ اس طرح سے مملکتوں کے تعلقات کے دائرے میں مذہبی رواداری کا اصول متحقق ہوگیا اور قانون بین الممالک نے ملک کے قانون عمومی سے زیادہ ترقی حاصل کرلی۔

یہ ارتقاء صرف مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات ہی کی حد تک نہیں عمل میں آیا۔ قرونِ متوسط کے ابتدائی زمانے میں الحاد اور بدعقیدگی کم پائی جاتی تھی۔ اسی لیے ملحدوں کے خلاف دنیاوی قوانین نہیں پائے جاتے تھے۔ اور جب شہنشاہت ختم ہوگئی تو

ٰ۔ لیبلا کی لاطینی تالیف "شہر ٹرنٹ کی عظیم الشان و ممتاز مجلس شورائے مذہبی کی تاریخ کے متعلق یادگاروں کا مکمل مجموعہ" جلد ۳ صفحہ ۱۵۹ تا ۱۹۴ — ریال دگوربان کی فرانسیسی تالیف "علم حکمرانی" جلد ۵ صفحہ ۶۷۷۔

شہنشاہوں کے دستور بھی ختم ہو گئے۔ تقریباً ۱۱۰۰ء میں کتھاریت[1] کی تحریک مغرب میں آموجود ہوئی اور قسم قسم کی صورتیں اختیار کرنے لگی۔ اس کے خلاف بڑی شدید تدابیریں اختیار کی گئیں۔ کلیسا نے بد عقیدہ لوگوں کے خلاف بڑی ہی سخت کارروائی جاری کی اور ان کو غیر عیسائیوں میں شامل قرار دیا گیا۔ اور پوپ کے احکام مذہبی میں یہ کہدیا گیا کہ جو لوگ بد عقیدہ لوگوں کی تباہی کی کوشش کریں گے تو انھیں صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والوں کے برابر درگزر اور امتیازات حاصل ہوں گے۔ چنانچہ وہ حکمنامہ (جو لاطینی میں تھا) یہ ہے: "بہر حال وہ کیتھولک عیسائی جو صلیب کے جھنڈے تلے الحاد کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں مصروف ہوں انھیں بھی وہی رعایتیں اور امتیازات حاصل ہوں گے جو ارض مقدس کی بہبودی میں حصہ لینے والوں کے لیے ہیں[2]۔" خود مرتکبین بد عقیدگی کے خلاف موت کی سزا مقرر کی گئی۔ اور رواج یہ ہو گیا کہ انھیں زندہ جلا دیا جائے۔

اختساب اور سزا کا کام صرف کلیسا ہی نہیں انجام دیتا رہا۔ قرون متوسطہ میں ایک غیر معمولی شخصیت پیدا ہوئی۔ یہ شہنشاہ فریڈرک دوم کی ہے۔ اس کے ہمعصر اس پر عیسائیت سے پھر جانے کا الزام لگاتے تھے۔ ایک پوپ نے یہاں تک لکھا تھا کہ یہ بادشاہ یہ کہتا ہے کہ دنیا کو تین جھوٹوں نے دھوکا دیا ہے جن میں وہ حضرت یسوع مسیح،[ع] حضرت موسیٰ[ع] اور حضرت محمد[صلعم] کا نام لیتا ہے۔ یہ ایک روشن خیال شہنشاہ تھا۔ اس کی پرورش پلرمو میں ہوئی جہاں عربی - یونانی تمدن کے ماحول نے صقلیہ کے

۱۔ ژردلیاں آشتے کی فرانسیسی تالیف "الحاد اور کشوری ہاتھ: قرون متوسطہ میں"

۲۔ لاطینی تالیف "نویں گریگری کے احکام" کتاب ۵، عنوان ۷، باب ۱۳

نارمن بادشاہوں کے دربار کو گھیر رکھا تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے اس ذہنی و دماغی تہذیب کی ترقی کے لیے کوششیں کیں اسی نے میشل اِسکاٹ کی سرپرستی کی جس نے ابن رُشد کی شرحوں کا ترجمہ کیا تھا۔ اسی نے اٹلی کی جامعات کو منطق اور طبیعیات پر ارسطو کی نیز دیگر یونانی اور عربی مولفوں کی مختلف تالیفوں کے ترجمے بھیجے تھے۔ اسی نے اس اولین نشأۃ ثانیہ کے پھلنے پھولنے میں مدد دی جس کے باعث اس کے دور کو خصوصیت حاصل ہوگئی اور اسی کے باعث وہ زمین تیار ہوئی اور وہ موقع فراہم ہوا جس کی وجہ سے سولھویں صدی عیسوی کی درخشندگی ممکن ہوسکی، جیسا کہ موسیو ہوئیار برے اُول نے اس قدر عمدگی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ اور دوسرے فریڈرک نے ایک مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے کتھاریت اور پتاریت اور دیگر تمام ثنویت پسند فرقوں کو ممنوع قرار دے دیا۔ ان فرقوں کے مخالفوں کے الفاظ میں یہ فرقے یہ کہتے تھے کہ ہماری یہ نظر آنے والی دنیا ایک بُرے خدا کی پیدا کی ہوئی ہے [اور نظر نہ آنے والی دنیا ایک دوسرے اور اچھے خدا کی پیدا کردہ ہے]۔ اسی لیے ان کا پرچار یہ تھا کہ زمین کی ہر ایک چیز سے پوری بے تعلقی برتی جائے۔ اور وہ شادی بیاہ کو بھی ملعون ٹھیراتے تھے کیونکہ اسی کے باعث بُری چیزوں کی بقا کا سامان پیدا ہوتا ہے۔ شہنشاہ نے ان کے خلاف نہایت سخت قوانین نافذ کیے، جن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دنیاوی قوت کے ذریعے سے بدعقیدگی کو دبا دیا جائے اور چتا کے شعلوں کے ذریعے سے اس کا خاتمہ کیا جائے۔[1]

---

[1] ہوئیار برے اُول کی لاطینی تالیف "دوسرے فریڈرک کے سفارتی کارنامے" دیباچہ صفحہ ۴۸۵۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ملکوں میں ہولناک احتساب وسزا کا دور شروع ہوا۔ اور جب سولھویں صدی میں کیتھولک مذہب کے خلاف سب سے بڑی اور خطرناک ترین بدعقیدگیوں میں سے ایک ظاہر ہوئی، تو مذہبی تعصب کے باعث ہولناک جنگیں شروع ہوئیں۔ جلدی ہی ترقی پسندوں کو کامیابی ہوئی اور کلیسا کے بس میں یہ بات نہ رہی کہ اپنے اصول وقواعد کا اطلاق بین الممالک تعلقات میں بھی کر سکے۔ جن حکمرانوں نے بدعقیدگی کے الزام میں اپنی رعایا کا احتساب کر کے ان کو سزا دینی شروع کی تھی، انھیں بھی اب اس میں ہچکچاہٹ نہیں رہی کہ پروٹسٹنٹ مملکتوں سے حلیفی پیدا کریں۔ مذہبی تعصبات کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی پیچیدگیوں میں انہماک تھا اور یورپ میں توازنِ قوت قایم رکھنے کی خواہش تھی۔ اور یہ ایک ستم ظریفی تھی کہ خود پاپائی روما نے ان قواعد کو توڑنا شروع کیا، جن کو خود اسی نے وضع کیا تھا۔

[مولف نے اس بیان کو یہیں ختم کردیا ہے ورنہ یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ قانونِ بین الممالک کی ضرورتوں کے لیے جب عیسائی مذہب کو بالکل چھوڑ دیا گیا تو پھر قدیم رومی قانون کی طرف رجوع کیا جانے لگا تاکہ دنیا کی مختلف مملکتوں کو اپنی باہمی احتیاجوں کے پورا کرنے میں عیسائیت کے باعث کوئی دشواری نہ رہے۔ اس کے بعد سے یورپی ارباب اقتدار کو غیر عیسائی اشخاص اور ممالک سے شدید نفرت تو باقی رہ گئی لیکن خود ان یورپی ارباب اقتدار نے قانونِ بین الممالک کی حدتک عیسائی مذہب کو پوری طرح اور قطعی طور پر بالائے طاق رکھ دیا۔ اور منفعت پرستی واحد رہنما رہ گئی — مترجم]۔

باب ہشتم

یورپی توازنِ قوت

مختلف سلطنتوں میں توازنِ قوت قائم رکھنے کے نظریے کو جب ترقی ہوئی تو یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ آیا وہ جنگیں ناجائز سمجھی جائیں گی جو اس غرض کے لیے کی جائیں کہ اگر کوئی طاقت عمومی امن اور دیگر قوموں کی خود مختاری کو دھمکی دے تو اس کی کوشش کا سدباب کیا جائے؟

سلطنتوں میں توازنِ قوت رکھنے کا نظریہ خود ایک دلچسپ چیز ہے۔ اس کے متعلق خیال یکساں نہیں رہا۔ گزشتہ چند صدیوں کی تاریخ میں کبھی تو وہ اس صورت میں نظر آتا ہے کہ کمزوروں نے طاقتور کے خلاف بہت ہی معمولی قسم کا اتحاد کیا اور کبھی خود قوتوں میں یکساں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس خیال کی تائید نہیں کی جاسکتی کہ قدیم زمانے کے لوگوں کو اس معاملے میں باضابطہ طور سے انتظام کرنے کا احساس نہیں

پیدا ہوا تھا۔ فلسفی مورخ ڈاؤِڈ ہیوم نے بتایا ہے کہ اگر یونانیوں کو سلطنتوں میں توازنِ قوت کا کوئی مکمل اور صحیح تصور نہ بھی تھا، تو وہ بہر حال اسی پر عامل ضرور تھے۔ چنانچہ یہ یاد دلایا جا سکتا ہے کہ ایتھنا والوں نے اسپارٹا والوں کے خلاف تھیبہ والوں کی طرفداری کی تھی تا آنکہ اے پامی نونڈاس کو لیوک ٹریس میں فتح نہ حاصل ہوگئی۔ اور پھر وہ فاتحین کی طرف ہو گئے۔ یہ بھی یاد دلایا جا سکتا ہے کہ ڈیماس تھینس نے میگاپولِس کے رہنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اصول پیش کیا تھا کہ ایتھنا کے مفاد کا تقاضا ہے کہ اسپارٹا اور تھیبہ دونوں یکساں طور سے کمزور رہیں۔ اسی طرح یہ بھی یاد دلایا جا سکتا ہے کہ پولی بیس مورخ نے سیراقوسا کے بادشاہ ہیرون دوم کی اس لیے تعریف کی تھی کہ اس نے یہ بات ذہن نشین کر لی تھی کہ ایک خاص چیز کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ یہ کہ قوت ایک ہی جمہوریت کے ہاتھوں میں رہے، اس طور پر کہ ہمسایہ جمہوریتیں اس کے مقابل اپنے حقوق کی مدافعت میں اپنے کو بے بس پائیں[1]۔ سلطنتوں کے صحیح توازنِ قوت کا نظریہ، اپنے حقیقی مفہوم میں پندرھویں صدی میں پیدا ہوا۔

166

اس زمانے میں جاگیرداری نظام جو کہیں کم اور کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا، مغربی یورپ کے مختلف ملکوں میں ترمیم کیا جانے لگا۔ اور اس کا رجحان اس مقصد کی طرف تھا کہ بادشاہت کو قوت حاصل ہو اور ملک میں وحدت و یکجہتی کار فرما رہے۔ اسی سادگی پسند تصور کے سامنے مختلف طبقات کے ایک دوسرے کے اوپر پائے جانے کے نظام کا خاتمہ ہو گیا۔

---

[1]۔ ہیوم کی فرانسیسی تالیف "سیاسی مقالے" مطبوعہ ایمسٹرڈام ۱۷۵۲ء، مقالہ ۷ "توازنِ قوت"۔ وے ٹن کی "تاریخ ارتقائے قانون بین الممالک" جلد ۱ صفحہ ۱۰۔

اٹلی میں ایک نئی قسم کی حکومت وجود میں آئی جسے "استاتو" یعنی "مملکت"، کہنے لگے۔ مملکت کی اصطلاح سے اولاً ارباب اقتدار اور ان کے طرفدار مراد ہوتے تھے۔ بعد میں اس سے یہ مفہوم لیا جانے لگا کہ ایک مستقل سرزمین پائی جاتی ہے۔ تیرھویں صدی کے وسط سے دوسرے فریڈرک نے نارمنوں اور عربوں کے قائم کردہ اداروں پر ایک ایسے نئے نظام کی تعمیر کی جو اس وقت تک نامعلوم تھا۔ شاہی سرپرستی نے اب اسقفوں، بلدیوں، اور جاگیرداروں کی جگہ رہنمائی کے فرائض اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اختیاراتِ سماعت کی ہوشیاری کے ساتھ اس طور سے تنظیم کی گئی کہ پوری قوم کو ایک ایسی جماعت میں مبدل کردیا جائے، جسے نہ تو کوئی کام اپنی صوابدید پر کرنے کا اختیار ہو اور نہ جسے کوئی مخالفت کی قوت۔ مالیات کے ایک فرزانہ نظام نے حکومت کو اسی بات کا موقع دیا کہ آمدنی کی زیادہ سے زیادہ توفیر ہوسکے[1]۔ برک ہارٹ نے لکھا ہے کہ مغرب میں اس وقت تک اس کے مماثل کوئی چیز دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ دوسرے فریڈرک نے عدل گستری اور نظم ونسق کے اختیارات کچھ اس طور سے ایک مرکز پر جمع کر لیے تھے کہ اس سے پہلے کبھی سننے میں نہیں آیا تھا۔ کسی بھی معاملے کو صوابدید و انتخاب پر نہیں چھوڑا گیا تھا، اور اگر کوئی علاقہ ایسا کرتا تو اس علاقے کو تباہ کردیا جاتا اور وہاں کے باشندوں کو بیگار قرار دیا جاتا۔ مالگزاری ایک رجسٹر داخلۂ حقوق اور مسلمانوں کے قائم کردہ ایک طریقے پر مبنی تھی اور اس کو اسی بے رحمی سے وصول کیا جاتا تھا جو مشرق والوں کی طرف منسوب ہے۔ قوم کا کوئی وجود باقی نہیں رکھا گیا، اور صرف رعیت یعنی ماتحتوں کی ایک جماعت رہ گئی۔ اندرونی امن کے لیے

---

[1]۔ برک ہارٹ کی جرمن تالیف "اٹلی کے دورِ نشاۃ ثانیہ کی تہذیب" صفحہ ۲۔

کوتوالی اور بیرونی حفاظت کے لیے فوج قائمہ کی ایک بنیاد رکھی گئی جس میں عربوں کو ملازم رکھا گیا اور باشندوں کو ہتیار رکھنے کی کوئی اجازت نہ رہی[1]۔"

مذکورہ بالا تصورات میں سے متعدد باقی و برقرار رہے اور اٹلی میں جو مختلف سیاسی وحدتیں یا مملکتیں قائم ہوتی گئیں ان میں وہ سرایت کرتے چلے گئے۔ ساتھ ہی یہ وحدتیں باہمی تعلقات پیدا کرنے لگیں۔ جیسا کہ برک ہارٹ نے خاصی عمدگی کے ساتھ دکھایا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی ہی میں اٹلی میں شہنشاہوں کی حیثیت حکمرانوں کی نہیں رہی تھی بلکہ وہ مختلف جمہوریتوں کے ایک ممکنہ پشت پناہ بن گئے تھے۔ پوپوں کو اپنی حد تک اتنی قوت حاصل تھی کہ دوسروں کو اتحاد پیدا کرنے سے روک سکیں؛ لیکن ان پوپوں میں یہ قوت نہ تھی کہ اپنے شخصی فائدے کے لیے ملک میں وحدت پیدا کر سکیں۔ شہنشاہوں اور پوپوں کے بیچ میں سیاسی اجسام کا ایک سلسلہ پیدا ہو گیا اور مختلف بلدیے اور مطلق العنان علاقے وجود میں آگئے جن میں باہم ہوسناکیوں اور حوصلہ مندیوں کے باعث بہت سے اتحادات اور بکثرت مظاہرات عمل میں آنے لگے۔ آخر کار پانچ بڑی مملکتوں یعنی فلارنس، نیپلز، میلان سینٹ پیٹر کی ذات جاگیر اور وینس نے سیاسی توازن قوت کا ایک نظام قائم کر دیا۔

اس وقت کی صورت حال کا ذکر فران چیس کو گچار دینی نے اپنی کتاب "اٹلی کی تاریخ ۱۴۹۲ء سے ۱۵۳۲ء تک" کے ابتدائی نفیس صفحے میں یوں کیا ہے کہ: "جب اٹلی خوش بختی اور سکون میں مگن تھا تو جنگ نے آکر اس کے آرام میں خلل ڈالا۔

167

[1] برک ہارٹ کی جرمن تالیف "اٹلی کے دور نشاۃ ثانیہ کی تہذیب" صفحہ ۲۔

اس وقت اس کی لطیف صورت حال نے اسے ان مصائب کا زیادہ شدت سے احساس کرا دیا جو اسے ابتداءً برداشت کرنے پڑے تھے۔ حقیقت میں، ایک ہزار سال سے (جب سے کہ رومی شہنشاہت اس بلند مرتبے سے زوال پذیر ہونے لگی تھی جہاں ہیروئی خصال اور بخت و اتفاق نے اسے پہنچا دیا تھا) اٹلی کو وہ سرسبزی اور امن چین کبھی حاصل ہی نہیں ہوئے تھے جن سے وہ ۱۴۹۰ء میں بہرہ ور تھا۔ اس کے تمام صوبوں میں ایک گہرے امن کا دور دورہ تھا۔ اس کے پہاڑ اور اس کے میدان دونوں ہی زرخیز تھے۔ وہ دولتمند اور خوب آباد ہو گیا تھا اور کسی اجنبی تسلط کی اطاعت پر وہ مجبور نہ تھا۔ اس کے طمطراق میں مزید اضافہ یوں ہو گیا تھا کہ اس کے علاقوں میں سے متعدد حکمران خاص امتیازات کے مالک تھے۔ اس کے شہروں میں سے بہ کثرت شہرت اور حسن سے مالا مال تھے؛ اور اس کے مذہب کے مرکز کو خاص جاہ و جلال حاصل تھا۔ علوم و فنون اس کی گود میں پھل پھول رہے تھے۔ بڑے بڑے مدبّر اس کے ہاں تھے۔ اور اس زمانے کے متعدد بہترین سپہ سالار بھی وہیں تھے۔ وہ اصلی خوش بختی اسے حاصل تھی۔ خارجی امور کی حد تک اجنبی اس کی تعریف اور قدر کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہاں جو امن پایا جاتا تھا، اس کے اسباب مختلف تھے۔ اس سلسلے میں خاص کر (فلارنس کے حکمران) لورنزو دی میدیچی کی قابلیت کا ذکر کیا جانا چاہیے۔ اسی کو اس امن چین کا سب سے مضبوط مددگار خیال کیا جاتا تھا۔ فلارنس کا یہ مشہور باشندہ محض اپنی قابلیت کے باعث، معمولی حالت سے ترقی کرتا ہے، اور اس جمہوریت کا حکمران بن جاتا ہے۔ اس کی قوت کا دارومدار اس کے علاقے کی وسعت سے زیادہ اس کے محل وقوع، اور اس کے باشندوں کی

دولت و صلاحیت پر تھا۔ کچھ ہی عرصہ قبل اس نے سیاست دانی سے اپنے خاندان کو آٹھویں انوسنٹ (پوپ) سے حلیفی پیدا کرکے متحد کرلیا تھا۔ اس پوپ کو مے دی سیس پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اسی کے مشوروں سے حکمرانی کرنے لگا تھا، جس کے باعث مے دی سی کا نام پورے اٹلی میں عزت سے لیا جانے لگا اور عمومی قسم کے مسائل میں جب غور و خوض ہوتا تو اس کی رائے کو بڑی وقعت دی جانے لگی۔ مے دی سیس اور باشندگان فلارنس نے سمجھ لیا تھا کہ اٹلی کی اہم سلطنتوں کو مزید پھیلاؤ سے روکنا چاہیے اور ان کے مابین ایک ٹھیک توازن قوت قائم رکھنا چاہیے —

مولف کے اپنے (اطالوی) الفاظ میں: «تمام وسائل اختیار کرکے اٹلی کی چیزوں میں ایک اس طرح کا توازن قوت برقرار رکھنا کہ آیندہ ایک چیز کسی دوسری چیز سے وابستہ نہ ہوجائے »— یہ چیز فلارنس کی حفاظت کے لیے اتنی ہی ضروری تھی، جتنی اس کے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے۔ اس مساوات کو جاری رکھنے کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ امن کو برقرار رکھا جائے اور ہر اس چیز کو دور رکھا جائے جس سے اس امن میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔"

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں اٹلی میں چھوٹے پیمانے پر وہی تنظیم پائی جاتی تھی جو بعد میں یورپ میں بڑے پیمانے پر وجود میں آئی[1]۔ فرانسیسی مورخ آں سیوں نے اس کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ جالب نظر ہے کہ: "وہاں بکثرت ایسی مملکتیں ایک دوسرے کی ہمسایہ تھیں، جو اپنی بے انتہا عدم مساوات کے باعث ایک دوسرے سے ڈرے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں لیکن ساتھ ہی ان میں اتنی مساوات

[1] شتاری ایر کی فرانسیسی تالیف "فرانس کی گفت و شنید مشرق قریبہ سے" جلد ۱ صفحہ ۳۸۔

تھی کہ ہر ایک، دوسرے کے حملے کی مدافعت کر سکتی تھی۔ اور اس امر نے یہ بات سمجھا دی تھی کہ شروع ہی سے احتیاط کے اصول پر کار بند رہیں، جس سے حقوق کا تحفظ ہوتا ہے۔ اور یہ اصول بعد میں اس چھوٹے دائرے سے نکل کر ایک زیادہ وسیع دائرے میں جاری ہو گئے۔ قدیم یونانی سلطنتوں کے نمونے پر اٹلی کی سلطنتیں ایک دوسرے پر چوکسی اور رشک سے نگاہ رکھتی تھیں۔ اور چاہے اپنے مفادات اور اپنی قوتوں کو متحد کریں یا منقسم، ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اپنا استقلال اور خود مختاری باقی رکھیں۔ چنانچہ، جب جنوبی مملکتوں نے (میلان کے ڈیوک) لوڈوِک لے مورے کے خلاف جتھا بندی کی تو اس کو توقع تھی کہ اسے بھی شمالی مملکتوں کی حلیفی حاصل ہو جائے گی اور وینیس، فیرّارے، بولونیا، موڈانیا اور مانتوا کی ریاستوں کے اتحاد نے نیپلز، فلارنس اور کلیسائی ریاست کی مجموعی قوت کو ترازو کے پلڑے میں اپنے ساتھ متوازن کر دیا[1]۔

سولھویں صدی کے آغاز میں توازنِ قوت کے اصول کا مغربی یورپ پر اطلاق کیا گیا۔ فرانسس بیکن نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ: "آٹھویں ہنری اور پہلے فرانسوا اور شارل کین کے مثلث کا مقصد یہ تھا کہ ان حکمرانوں میں سے کوئی بھی کسی مٹھی بھر زمین پر قبضہ کرلے تو باقی دونوں حکمران یورپ میں توازن کی بحالی کے لیے کوشش کریں[2]۔ اس بڑے انگریز نے اپنی نادر تہ بینی سے اس سہ گانہ سیاست کو اس سیاست کے قائل ٹھیرایا ہے جس کی

169

[1] - آں سیئوں کی فرانسیسی کتاب "یورپ کے سیاسی نظام کے انقلابوں کی جدول" جلد ۲ صفحہ ۲۶۲۔
[2] - فرانسس بیکن کی انگریزی کتاب "اسپین سے جنگ ہونے کے متعلق ملحوظات" جلد ۳ صفحہ ۳۰۴۔
(حوالہ اس کے مجموعۂ تالیفات کا دیا گیا ہے۔ یہ ۱۸۲۴ء میں لندن میں چھپا تھا)۔

ستایش گچار دینی نے کی تھی۔

جلدی ہی شارل کین پر زور و شور سے یہ الزام لگایا جانے لگا کہ وہ ایک عالمگیر بادشاہت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک اس کا ذکر کرنے لگے۔ اصلاح پسند تسوِنگلی نے اس بادشاہ کے ہوسناک ارادوں کو مردود ٹھیرایا، اور [جرمن ریاست] ہیسے کے حکمران کا ہمنوا بن گیا۔ یہ حکمران بادشاہوں کو بھڑکانے لگا۔ اور تسوِنگلی نے جمہوریتوں کو بھڑکانے کا فریضہ اپنے ذمے لیا۔ ۱۵۲۹ء میں فرانسیسی سفیر روما نے لکھا تھا کہ: "پوپ اور روما کا پورا دربار اس امر کا بڑا شبہہ رکھتے ہیں کہ شہنشاہ ایک مطلق العنان بادشاہت کی طرف میلان رکھتا ہے۔" خود شارل کین کے حاشیہ نشین اس خواب کے مزے لے رہے تھے۔ اور ہر نانڈو دے آکوں آنے جو سپاہی بھی تھا شاعر بھی، (اسپینی میں) یہ گیت گانا شروع کیا کہ آسمان نے زمین سے وعدہ کیا ہے کہ:-

"ایک بادشاہ، ایک حکومت اور ایک تلوار"

کسی ایک کے سب پر چھا جانے میں جو خطرہ تھا اس کے باعث ہر قسم کے اتحاد اور ہر قسم کی حلیفیاں مناسب خیال کی گئیں۔ ساتھ ہی ایک نیا واقعہ یعنی مذہبی اصلاح کی تحریک وجود میں آئی، جس کے باعث بکثرت رجحانات حرکت میں آنے لگے۔ جیسا کہ شِلر نے بتایا ہے، کیا مذہبی تصورات نے مختلف ملکوں کے لوگوں اور مختلف حکومتوں کی رعایا میں ربط نہیں پیدا کر دیا حالانکہ وہ اس سے پہلے ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی تھے؟ یہ جھگڑا دو بڑی سلطنتوں میں مستقل طور پر قائم ہو گیا یعنی فرانس کا گھرانا اور آسٹریا کا گھرانا۔ جب شارل کین معزول ہو گیا تو آسٹریا کا گھرانا دو شاخوں میں بٹ گیا۔ ایک اسپینی شاخ تھی جو اسپین، نیپلز، صقلیہ، نشیبستان یعنی ہالینڈ، آزاد کونٹی، شرق الہند اور غرب الہند پر حکمران تھی۔ دوسری

آسٹروی شاخ جو موروثی علاقوں، بوہیمیا، ہنگری اور الزاس پر حکومت کرتی تھی، اور تاج شہنشاہی بھی اسی کے پاس محفوظ تھا۔ فرانس ان دونوں شاخوں سے لڑتا رہا اور اگرچہ چوتھے ہنری کے زمانے میں وہ اسپینی شاخ پر غالب آگیا تو، رشلیو کی وزارت کے زمانے میں اسے آسٹروی شاخ پر تفوق حاصل ہوگیا اور مازارین (مازارینی) کی وزارت کے زمانے میں فرانس نے اسپینی اور آسٹروی شاخ ہر دو پر بیک وقت حملہ کردیا۔

اس پورے زمانے میں توازن قوت کو برقرار رکھنا سیاسی دنیا کے مسلسل پیش نظر رہا۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر مملکت اپنا اپنا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ انگلستان کا جو فریضہ تھا، اس کا مظاہرہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب گی نے کے مقام پر آٹھویں ہنری اور پہلے فرانسوا نے باہم ملاقات کی اور ایک انگریز تیر انداز اور کتبۂ ذیل نے اس کی نمایندگی کی:—

"جو عہد کو وفا کرتا ہے، وہ سردار بنتا ہے"

170 جرمنی کے پروٹسٹنٹ حکمران اپنی حد تک کچھ اور ہی فرایض انجام دینے لگے۔ اور صوبہ جات متحدہ نے اپنے برتاؤ کے لیے ایک معقول اصول طے کرلیا تھا۔ مشرق میں تین مملکتیں تھیں جن کو سد مشرقی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس کی مدد سے فرانس نے آسٹریا کو دو طرف سے گھیر لیا تھا جب کہ وہ خود آسٹریا اور اسپین میں گھرا ہوا تھا۔ اس سے مراد ایک تو سویڈن ہے جو شمال میں واقع ہے دوسرے ترکی جو جنوب میں اور تیسرے پولینڈ جو وسط میں[۱]۔

دوسروں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ بھی خصوصیت کے

---

[۱]۔ فرانسیسی کتاب "ان ہدایات کا مجموعہ جو فرانس کے سفیروں اور منتظمین سفارت کو صلحنامہ ہائے ویسٹ فالیا سے انقلاب فرانس تک دیے جاتے رہے"، حصۂ روس مع تمہید و حواشی از راں بو جلد (۱)، صفحہ ۱۱۔

حال اور سبق آموز ہیں۔ انگریز مورخ ولیم کام ڈن نے جو تصویر کھینچی ہے اس سے اس حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ فرانس اور اسپین یورپی ترازو کے دو پلڑے ہیں اور انگلستان اس کا کانٹا یا وزن نما۔

۱۶۶۳ء میں جنیوا میں ایک فرانسیسی کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام "مملکت کا پارہ (سیماب) یا مملکت کے متعلق مختلف مقالات کا مجموعہ" تھا۔ اس میں بیان کیا گیا تھا کہ "وہ دو بڑی سلطنتیں جو اپنے آپس کے توازن کے لیے عیسائی دنیا کے لیے دیگر حکمرانوں سے کام لے رہی ہیں، وہ فرانس اور آسٹریا کے گھرانے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ تنہا ممالک ہیں جو دوسروں کی مدد کے بغیر جنگ کر سکتے ہیں، اور جتنا چاہیں اس کو جاری رکھ سکتے ہیں اور جس کے لیے ان کو آدمیوں یا روپیوں کی کوئی کمی نہیں" اس زمانے میں ژوآں کے ڈیوک آں ری نے جو کالفی نیوں کا سابق میں سردار تھا اور جس نے ژوشیل پر قبضے کے بعد ڈنیس میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور آخر میں تیرھویں لوئی کی طرف سے سوئٹزرلینڈ میں اور علاقہ گیری ژوں میں سفیر مقرر ہوا تھا، اس نے فرانسیسی میں ایک کتاب تالیف کی جس کا نام "عالم عیسائیت کے حکمرانوں اور مملکتوں کا مفاد" تھا۔ اس کتاب میں لکھا ہے: یہ امر بطور بنیاد پیش کیا جانا چاہیے کہ عالم عیسائیت میں دو سلطنتیں ہیں جن کو دو قطب قرار دیا جا سکتا ہے اور انھیں سے باقی تمام مملکتوں پر امن یا جنگ کے اثرات نازل ہوتے ہیں یعنی فرانس اور اسپین کے شاہی گھرانے۔ اسپین کا خانوادہ چونکہ یک بیک بام عروج پر پہنچ گیا ہے اس لیے وہ اپنے اس منصوبے کو چھپا نہ سکا کہ وہ اپنے کو آقا بنانا اور مغرب میں ایک نئی بادشاہت کا آفتاب طلوع کروانا چاہتا ہے۔ فرانس کا گھرانہ بے اعتدالی کے ساتھ اس کا ردعمل کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ باقی دوسرے حکمران اپنے اپنے مفاد کے مطابق انھیں دونوں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں۔"

قانون بین الممالک کے مولفوں نے فوراً ہی توازن قوت کے مسئلے سے بحث شروع کردی۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ وہ سیدھا سادہ سوال تھا کہ اگر کوئی مملکت حد سے زیادہ ترقی کرنے لگے تو اس کا مقابلہ جائز ہے۔

171

جنتی لیس نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ اس کی رائے میں چونکہ ترک اور اسپینی عالمگیر تسلط کی دھن میں ہیں، اس لیے اگر دوسری قومیں ان پر حملہ کریں تو وہ بالکل حق بجانب ہوں گی چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ میں "ایک طرف ترک، اور دوسری طرف اسپینی اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہر جگہ انھیں کا تسلط چھا جائے اور اس کے لیے سخت جدو جہد کر رہے ہیں۔ کیا ان کا مقابلہ کرنا سراسر جائز نہ ہوگا؟... علاوہ بر آں یہ بہتر ہے کہ لوگوں کو بے انتہا طاقتور ہونے ہی نہ دیا جائے بجائے اس کے کہ بعد میں کسی طاقتور شدہ قوم کے خلاف تدارک کی کارروائی عمل میں لائی جائے۔[1]" لہذا یہ امر قابل ترجیح ہے کہ کسی کے حد سے زیادہ قوت حاصل کرنے کا پیشگی ہی سد باب کردیا جائے نہ یہ کہ بعد از وقت اس کا علاج سوچیں۔ اس رائے کا انگلستان میں بڑا غلغلہ رہا۔ اور اسی سے وہ اپنی سیاست میں کام لیتا رہا۔ فرینسِس بیکن جیسی قابل شخصیت نے، جو دینیات کی بھی ماہر تھی اور قانون کی بھی، اس بات کی تائید کی کہ حکمرانوں کو اس بات کا حق ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بڑھنے کو تاکتے رہیں۔ اس سلسلے میں وہ گیارھویں لوئی کی اور میدی سیس کے لوراں کی مثال دیتا ہے "جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اٹلی کی تمام مملکتوں میں توازن قائم کردیا تھا۔" اور اس مولف نے اس طرز عمل کو حق بجانب قرار دیا ہے جو نشیبستان (ہالینڈ) کے متعلق اِلزابتھ نے اختیار کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "اب

---

[1] جنتی لیس کی لاطینی تالیف "قانون جنگ" کتاب اول باب (۱۴)۔

وقت ہے کہ عیسائی حکمران بیدار ہوں ۔ اسپین میں جو غصب اور لوٹ مار ہو رہی ہے، اس کا مقابلہ کرنا بالکل حق بجانب ہے کیونکہ اسپین رومن کیتھولک مذہب کو بہانہ بنا کر اپنے ہمسایوں کو اپنے غصب اور لوٹ مار کا شکار بنا رہا ہے، تا آنکہ وہ اسپینی قوم کے ہوسناک ظلم کے نہ بھرنے والے پیٹ میں سما نہ جائیں"۔[1]

یہی نظریہ فرانسس بیکن کی تالیف میں نظر آتا ہے جو اسپین کے خلاف جنگ کے جائز ہونے کے متعلق لکھی گئی تھی ۔ یہ تالیف سنہ ۱۶۲۴ء میں بادشاہ چارلس کو مخاطب کر کے لکھی گئی تھی ۔ بیکن نے اس تالیف میں اس بات کا خلاصہ دیا ہے کہ اسپینی سلطنت کس طرح جزیرہ نمائے اندلس، نیپلز، میلان، اور شرق الہند و غرب الہند پر پھیل گئی اور اس بات کے منصوبے پکانے لگی کہ پیکاردی، بریٹنی، پی اے موں، ڈالٹ لین اور پالاٹینا کو فتح کرلے ۔ بیکن اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ جنگ کا واجبی خطرہ ہو تو وہ جنگ کی جائز وجہ بن سکتا ہے ۔ اور انسدادی جنگ، حقیقت میں دفاعی جنگ ہوتی ہے ۔

گروتیوس نے سنہ ۱۶۲۴ء میں جو کتاب لکھی اس میں اس نے توازن قوت کو تسلیم نہیں کیا ہے، یا کم از کم اس نے یہ امر بالکل تسلیم نہیں کیا ہے کہ اگر کوئی سلطنت ترقی کر رہی ہو اور وہ زیادہ پھیل جائے اور اس کے ضرر رساں بن جانے کا اندیشہ ہو تو اس سلطنت کا خاتمہ کر دینے کے لیے ہتھیار اٹھانا جائز ہو سکے ۔ اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ: "محض ہم پر حملے کا امکان ہمیں اقدام کرنے کا

---

[1] ۔ ماتھیوسٹ کلفٹ کی انگریزی کتاب "ہتھیاروں کا چلانا اور استعمال کرنا اور ہتھیاروں کے قوانین جو نہایت بہادر اور ماہر کپتانوں کے طرز عمل سے ماخوذ ہیں اور جن کی قدیم اور جدید ہر دو قسم کی مثالوں اور نظریوں سے توثیق ہوتی ہے" مطبوعہ لندن ۱۵۹۳ء ۔

حق دیدے تو یہ ہر اصول انصاف کے خلاف ہوگا۔ انسانی وجود کچھ اس طور سے ہے کہ ہم کبھی بھی اپنے آپ کو مکمل طور سے محفوظ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صرف خدا کا فضل اور غیر اقدامی پیش بندیاں ہیں نہ کہ قوت کا استعمال جس کے ذریعے سے غیر یقینی خطرات کے خلاف اپنی حفاظت کی کوشش کی جانی چاہیے"۔

سترھویں صدی کے آخری حصے میں سائموبل پوفنڈورف نے یہ لکھا تھا کہ: "کسی ہمسایے کی طاقت یا ترقی سے جو خطرہ لاحق ہوتا ہے، وہ جنگ کا اس وقت تک جائز موضوع نہیں بن سکتا جب تک کہ اس بات کا اخلاقی طور سے یقین نہ حاصل ہو جائے کہ وہ ہمسایہ ہمارے خلاف مخفی طور سے برے منصوبے گانٹھ رہا ہے۔" اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مضرت ابھی پہنچائی ہی نہیں گئی ہے اس سے بھی بعض وقت ہتیار اٹھانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے جس طرح کہ اس مضرت کی صورت میں جو پہنچائی جا چکی ہو۔ محض شبہہ بھی پیدا ہو جائے تو ہمیں احتیاطی تدبیریں اختیار کرنے کا حق پیدا ہو جاتا ہے"۔[1]

---

[1] پوفنڈورف کی کتاب "قانون قدرت اور قانون بین الممالک" کا فرانسیسی ترجمہ از باربیراک کتاب ہشتم، باب (۶)، فصل (۵)۔

باب نہم

جائز جنگ

جو جنگ، جائز وجوہ کی بنا پر کی جائے وہ جائز جنگ ہے۔ اور صرف جائز جنگ ہی سے حقوق حربیت حاصل ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے: کیا جنگ ہر دو فریق کے لیے جائز ہوسکتی ہے؟ دوسرے الفاظ میں باہم مقابلہ کرنے والے فریق کیا یکساں طور سے حقوق حربیت کا استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ عام طور پر مولفوں نے اس کا جواب نفی میں دیا ہے البتہ رافائل فل گوسے اور آندرے آلسیا نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ جنتی لیس ہر دو فریق کو حقوق حربیت حاصل نہ ہونے کا خیال ظاہر کرتا ہے۔ آیالا کو اس میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ فل گوسے اور آلسیا کا ہمنوا ہو جائے۔ آیالا نے اس مسئلے کے صحیح صحیح حدود معین کر دیے ہیں اور اس نے واضح کیا ہے کہ لفظ "جواز" کے دو معنے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جو چیز باضابطہ طور سے کی جائے۔[1] اسی خیال کی تائید دو صدیوں بعد ڈاتل نے

---

[1] آیالا کی لاطینی کتاب "حقوق و واجبات جنگ اور فوجی ضبط و نظم" کتاب اول، باب دوم ص ۳۵-

بھی کی اور بیان کیا کہ اگر دونوں فریقوں کے لیے جنگ جائز نہ ہو تو بھی بیرونی اثرات کی حد تک، جنگ کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے، اور اس وقت تک کہ جنگ کی اصل وجہ کا تصفیہ نہ ہو جائے۔

مذہبی قانون نے یہ اصول مقرر کیا تھا کہ جو ناجائز جنگ کا بانی ہو گا، اسے ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ لاطینی قاعدہ یہ ہے: "جو ناجائز جنگ کا محرک ہو گا، اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس چیز کو واپس کر دے جس پر اس نے جبر کے ذریعے سے قبضہ کیا ہو۔ اور یہ ان لوگوں کو دلا دی جائے جن سے وہ، قانونی حقیت کے بغیر، جبراً لے لی گئی تھی۔"[1] چنانچہ مفتوح [؟ فاتح] اور فوج میں بھرتی ہونے والے سپاہی ہر دو کے متعلق ایک فریضہ یا ذمہ داری عائد ہو گئی۔ چنانچہ ان میں سے ایک کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ اپنی فتح کے ذریعے سے اس نے جو چیز پیدا کی ہو، وہ واپس کر دے۔ اور دوسرے کے لیے ضروری ہو گیا کہ اس نے جو وفاداری کا حلف اٹھایا تھا، اس سے وہ بری قرار پا جائے۔ قانون مذہبی کے ماہروں میں سے سب ہی یہ قاعدہ بیان کرتے ہیں۔ سوسے کے ہنری نے ناجائز جنگ کے بانی کو اس تمام مضرت کا ذمہ دار قرار دیا ہے جو فریق ثانی یا اس کے اپنے آدمیوں کو خود اس بانیٔ جنگ یا اس کے آدمیوں نے پہنچائی ہو۔ اس مولف نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ خود اس کے اپنے آدمیوں کو دشمن سے جو مضرت پہنچے اس کا بھی اسی سے مواخذہ ہو گا۔ فرانسوا آریا یہ بیان کرتا ہے کہ ناجائز جنگ کا بانی اس تمام مضرت کا ذمہ دار ہو گا جو اس نے خود اپنے فعل یا اپنی مدد یا اپنے مشورے سے پہنچائی ہو۔[2]

174

---

[1] ۔ "نویں گریگری کے احکام" جلد (۲) عنوان (۱۳) "حلف اٹھانے والے" باب (۲۹)۔

[2] ۔ فرانسوا آریا کی لاطینی تالیف "در جنگ اور اس کے جواز کے متعلق رسالہ"۔ دیکھیے

اسی قسم کے خیالات ہی میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ مختلف مولف اس امر کی بھی تحقیق کرتے ہیں کہ جنگ کے جواز کے متعلق کس درجے کا یقین ان لوگوں کے دلوں میں پایا جائے جو اس جنگ میں کوئی نہ کوئی حصہ لیتے ہوں۔ سولھویں صدی عیسوی کے، جواز و عدم جواز کی بحثیں کرنے والے مولفوں نے اس نکتے پر طرفدارانہ طور سے بحث کی ہے۔ کلوڈ ڈرولی ایک فرانسیسی مولف تھا جو پاریس کے کلیسائے نوتردام کا کیانن یا صدر پادری تھا۔ اس نے سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں فرانسیسی میں "بڑوں کی طرف سے مقبوضہ اشیاء کی واپسی کے متعلق رسالہ" تالیف کیا تھا۔ کلوڈ ڈرولی نے ہمیں بتایا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق جواز و عدم جواز کی بحثیں کرنے والے علماء کا عام خیال کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ جو اجنبی سپاہی تنخواہ دے کر نوکر رکھنے کے لیے کوئی حکمران بلائے تو ان کو اس کی اجازت نہیں کہ جنگ کے جائز یا ناجائز ہونے کی تحقیق کیے بغیر اس کی وفاداری کا حلف اٹھائیں۔ ماتحت حکمران اور رعایا کو اس کی پابندی نہیں ہے کہ وہ اس طرح کی تحقیق کریں بلکہ انھیں صرف یہ چاہیے کہ اپنے آقا کی اطاعت کریں[1]۔ فرانسوا دے ڈی توریا نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ کوئی جنگ ہمیشہ صرف اس بنا پر جائز نہیں ہو جاتی کہ فریق جنگ اس کو جائز خیال کرتا ہے۔ ڈی توریا کے نزدیک یہ مناسب ہے کہ ہر ہر صورت کے متعلق احتیاط کے ساتھ جنگ کے منصفانہ یا غیر منصفانہ ہونے کی تحقیق کی جائے۔ اس مقصد کے لیے اس کی تجویز تھی کہ ایسے لوگوں کی رائے لی جائے جو عقلمند اور تجربہ کار ہوں اور کسی نفرت، کسی غصے اور کسی لالچ کے بغیر آزادی کے ساتھ بول سکتے ہوں۔ ڈی توریا کا خیال ہے کہ اگر کسی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ [*] "رسائل حقوق عمومی" جلد (۱۶) ورق (۳۲۵)۔

[1] کلوڈ ڈرولی کی فرانسیسی "تالیف" بڑوں کی طرف سے مقبوضہ اشیا کی واپسی کے متعلق رسالہ" ص ۱۱۷۔

جنگ کا غیر منصفانہ ہونا علانیہ طور پر ظاہر ہو تو رعایا اس کے لیے ہتیار اُٹھانے کی مجاز نہیں۔ بادشاہ کو چاہیے کہ ملک کے ممتاز لوگوں کی رائے لے۔ اور جب یہ لوگ اپنا فیصلہ صادر کردیں تو پھر ملک کے وہ چھوٹے افراد جنھیں مقتدر اعلیٰ کے ہاں بار حاصل نہ ہوسکتا ہو، ان معززین کے فیصلے کو جنگ کے جواز کے متعلق تسلیم کریں۔ اور اس بارے میں انھیں ضمیر کی کوئی خلش باقی نہ رہے۔

175

سُواریتس نے بھی اسی نظریے کی تائید کی ہے اور وہ تنخواہ یاب اجنبی سپاہیوں پر یہ سخت فیصلہ عاید کرتا ہے کہ وہ جنگ کے منصفانہ ہونے کی اپنے طور پر تحقیق کرلیں۔

جاگیرداریت کے حامی اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ ماتحت حکمران کے فوجی واجبات کیا کیا ہیں۔ لاطینی تالیف "جاگیرداروں کی کتاب" نے یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ: "جو ماتحت حکمران یہ جانتا ہو کہ اس کا آقا جائز جنگ کررہا ہے یا اُسے اس جنگ کے متعلق محض ایک شک ہی شک ہو، تو اسے مدد دینی واجب ہے۔ لیکن جب یہ امر ظاہر ہو کہ اس کا آقا بے وجہ جنگ کررہا ہے تو ماتحت حکمران اس کی حفاظت و مدافعت تو کرسکتا ہے، لیکن دوسروں پر حملہ کرنے کے لیے اس کی مدد نہیں کرسکتا۔[1]"

مولفوں نے عام طور پر یہی رائے تسلیم کی ہے۔ اس طرح ماتحت حکمران پر اپنے مقتدر اعلیٰ کی مدد کا جو فریضہ عائد ہوتا ہے وہ صرف اس صورت میں باقی نہیں رہتا جب کہ جنگ کا غیر منصفانہ ہونا علانیہ طور پر ظاہر ہو۔ گوُدیلِس نامی ایک بلجیمی مولف نے لاطینی میں لکھا ہے کہ "اگر کسی کو اس میں شبہہ ہو تو دوسری بات ہوگی: ماتحت کو حجت کرنے کا حق نہیں۔ شبہے کی صورت میں یہ تصور کرلینا چاہیے کہ

---

[1] ۔ لاطینی کتاب "جاگیرداروں کے رواج" جلد (۲)، عنوان (۲۸)۔

آقا نے جس جنگ کا اعلان کیا ہے، وہ جائز ہے[1]۔ اونورے بونے کا نظریہ کسی قدر مختلف تھا، لیکن اس کے خیال میں کسی اقدامی جنگ میں، خواہ وہ کتنی ہی جائز کیوں نہ ہو، بادشاہ اپنی رعایا سے اس کا مطالبہ نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے مصارف آپ برداشت کرکے اس کی مدد کرے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "اگر بادشاہ یہ چاہتا ہے کہ کسی کے خلاف اقدام کرے یا کسی حکمران کے خلاف جنگ کرے، تو چاہے وہ کتنی ہی منصفانہ کیوں نہ ہو اس کے لوگوں پر یہ فریضہ عاید نہیں ہوگا کہ اس کی مدد اپنے مصارف پر کریں۔ کیونکہ اقدام کا محض منصفانہ ہونا کوئی ایسا بڑا حق نہیں پیدا کرتا کہ مصارف کا بار بھی انھیں پر ڈالا جائے[2]"۔ ان الفاظ کے سلسلے میں یہ واقعہ ملحوظ رہے کہ تقریباً ایک صدی پہلے "خوبصورت فلپ" نے اپنی اس رعایا کے ہرجے کی تلافی کی تھی جن کی جائداد فلانڈرس اور ایسے صوبوں میں واقع تھی جن پر فلانڈریوں نے ہلہ بول دیا تھا۔ اور وہ تلافی یہ تھی کہ شہامت بازوں کو آمدنی کا نصف اور دیگر جاگیرداروں کو تہائی معاوضہ دلایا جائے۔ چند عام شہری بھی ان معاوضوں سے مستفید کیے گئے۔ یہ معاوضے گرفتار شدہ مال غنیمت اور فلانڈریوں کی ضبط شدہ جائداد سے دلائے جانے طے ہوئے۔ لیکن انھیں عارضی طور سے سرکاری خزانے ہی سے ادا کر دیا گیا تھا[3]۔

---

[1]۔ پنیر گودیلیس کا لاطینی رسالہ "جاگیرداروں کے حقوق کی تشریح" حصۂ چہارم باب (۶)۔

[2]۔ اونورے بونے کی فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" حصۂ چہارم باب (۲)۔

[3]۔ بوتارک کا فرانسیسی رسالہ "فرانس، خوبصورت فلپ کے زمانے" ص ۳۷۶۔

176

باب دہم

جنگ کا اعلان

رومی نظریے کے مطابق جنگ سے پہلے اس کا مطالبہ ہو چکنا چاہیے کہ تلافی عمل میں لائی جائے۔ نیز جنگ کا اعلان بھی کیا جائے۔ ان دو شرطوں کی موجوگی ہی میں جنگ جائز ہوتی۔

باضابطگی کا یہ تصور، قرون متوسطہ کے تمدن میں بحیثیت مجموعی تو سرایت نہیں کر سکا البتہ اس زمانے میں اس کا ایک جزء قبول کیا گیا۔ چنانچہ مولفوں کی اکثریت یہ رائے رکھتی نظر آتی ہے کہ جنگ کا اعلان کرنا ضروری ہے۔ سسیرو نے رومی نظریے کی اپنے لاطینی رسالے "متعلق بہ واجبات" اور اپنے رسالے "متعلق بہ جمہوریت" میں توضیح و تدوین کی ہے۔ اسی آخر الذکر کتاب کے حوالے سے یہ چیز قرون متوسطہ کے ماہرین قانون کے ہاں چل پڑی، براہ راست نہیں ـــــ رسالہ "متعلق بہ جمہوریت" بارھویں صدی عیسوی کے بعد بالکل ناپید ہو جاتا نظر آتا ہے ـــــ بلکہ اِشبیلیا کے اِسی دور کی

لاطینی کتاب "فقہ اللغہ" کے ذریعے سے[1]۔ جنگ کا اعلان کرنے کی ضرورت ایک ایسا قاعدہ تھا جسے ماہرین قانون نے اس لیے بھی رغبت کے ساتھ قبول کیا کہ وہی چیز خانگی جنگوں کے متعلق شہنشاہی احکام میں بھی ضروری قرار دی گئی تھی۔ اِتمام حجت کر لینے کو مملکتوں کے مابین ہونے والی جنگوں کی حد تک بھی وسیع کر دیا گیا۔

بالدے کی رائے میں یہ ایک قسم کی غداری ہے کہ دشمن کو پیشگی اطلاع دیے بغیر ہتھیار اٹھائے جائیں۔

کونارد براؤن کو اس امر پر اصرار ہے کہ اطلاع پیشگی طور سے دی جانی چاہیے اور یہ اطلاع اس طلبنامے سے مشابہ ہوتی ہے جو دیوانی مقدمے میں بھیجا جاتا ہے[2]۔

بیئیر بلی اس بارے میں صراحت سے رائے ظاہر کرتا ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں یونانیوں اور رومیوں کا نیز [معاملات خارجہ کے ذمہ دار] فیتیالی پجاریوں اور سسیرو کے قطعی بیان کا حوالہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جنگ کا اعلان صاف و صریح طور سے کیا جانا چاہیے۔ اس مولف نے یہ سوال کیا ہے کہ جنگ کا اعلان کرنے اور مخاصمانہ کارروائیوں کے شروع ہونے میں کتنا وقفہ گزرنا چاہیے؟۔ وہ کسی معین مدت کا حامی نہیں ہے، لیکن اس کی رائے ہے کہ فطری معقولیت کا تقاضا ہے کہ اعلان جنگ اور استعمال قوت کے درمیان ایک وقفہ پایا جائے[3]۔ مزید برآں بلی نے گوہی ڈلاپاپ کی رائے بھی نقل کی ہے جو تین دن کی مدت کا طرفدار ہے۔ ہمارا یہ منشا نہیں کہ

---

[1] ۔ دیکھیے اوپر اصل کتاب کا ص ۹۹

[2] ۔ کونارد براؤن (کونارڈوس برُونس) کی لاطینی کتاب "سفیروں کے متعلق" کتاب سوم باب (۸)۔

[3] ۔ بلی کی لاطینی کتاب "فوجی چیزوں اور جنگ کے متعلق رسالہ" حصہ دوم عنوان ۸۔

اس قاعدے میں کوئی استثنا تسلیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس صورت میں اعلان جنگ کی کوئی حاجت نہیں جب یا تو بحری قزاقوں سے سابقہ ہو (جن کو ہمیشہ کے لیے مطرود سمجھا جانا چاہیے) یا ایسے لوگوں سے جن کے متعلق شہنشاہ یا پوپ نے باضابطہ طور سے اعلان کر دیا ہو کہ وہ دشمن عمومی ہیں یا ایسے ماتحت لوگوں یا حلیفوں سے سابقہ ہو جو کسی ایسے شخص کو مدد دے رہے ہوں جس کے خلاف اعلان کیا جا چکا ہو۔

البیرکیس جنٹی لیس نے بلّی سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ رائے ظاہر کی ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک تیس دن کی مدت گزرنی چاہیے۔ جنگ کا اعلان کرنے کا رواج عملدر آمد سے خارج ہو گیا۔ براگون نے اس کا پہلے ہی اعتراف کر لیا تھا۔ جنٹی لیس نے زور و شور سے اس پر احتجاج کیا اور اس بات کی تائید کی کہ جس چیز کو قانون بین الممالک نے قائم کیا تھا اور جس چیز کا خدا نے حکم دیا تھا وہ منسوخ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ لاطینی میں وہ کہتا ہے کہ "اور یہ حق منسوخ نہیں ہوئے ہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی ہم ان کا لحاظ ہوتا دیکھتے ہیں جیسا کہ ہم تاریخ میں اکثر پڑھ سکتے ہیں۔ پھر وہ حق جو قانون ربانی کے تحت حاصل ہوں کیسے منسوخ ہو سکتے ہیں"[1] جن وجوہ سے جنٹی لیس اعلان جنگ کے کیے جانے کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہوا، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس میں یہ امر مضمر ہوتا ہے کہ تلافی کرنے کے لیے ایک مہلت دی جائے اور اس طرح باہمی صفائی اور مصالحت کا ایک آخری اور انتہائی ذریعہ مہیا کیا جائے۔ ماتھیو سٹکلف کی یہ رائے ہے کہ جو اعلان جنگ کسی چھنے ہوئے اسباب کی واپسی یا تلافی کے مطالبے کی شرط میں مضمر ہو، تو اس کی ضرورت اس صورت میں

[1] جنٹی لیس کی لاطینی کتاب "قانون جنگ"، کتاب دوم باب اول۔

باقی نہیں رہتی جب کسی پر خود حملہ کر دیا گیا ہو۔ اس زمانے میں اس
کے وطن انگلستان کی حالت یہ تھی کہ دوسرے فلپ سے کسی جنگ کا
اعلان ہوئے بغیر حالت مخاصمت قائم تھی۔ اور یہی مثال اس کے
پیش نظر ہوتی ہے، اور وطن پرستانہ نیز پروٹسٹنٹانہ جوش میں وہ 178
اس پر آمادہ ہوجاتا ہے کہ اسپین کی کارروائیوں کے خلاف پرزور
تنقید کرے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اس نے جنگ کا اعلان نہیں کیا
تھا۔ اور ایسا کیوں ہوا؟ یہ اس لیے کہ انگریز ملحد ہیں اور یہ کہ پوپ
نے ان کو جات باہر کرنے کا جو حکم دیا وہ دوسرے فلپ کی نظروں
میں ایک کافی اعلان جنگ ہے۔" وہ طنز سے پوچھتا ہے کہ "کیا اس
کو الفونسو دے کاسترو کی اجازت حاصل نہیں کہ ملحدوں کے خلاف
جنگ کرنی درست ہے؟ کیا بلتازار دے آیالا کی، جو اسپینیوں میں ایک
بڑا شخص تھا، اور نیز کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی کی تائید حاصل
نہیں جس نے یہ اعلان کیا تھا کہ ملحدوں سے وعدہ وفائی ہرگز نہیں
کرنی چاہیے؟"

جہاں تک عمل کا تعلق ہے بارھویں صدی عیسوی سے جنگ
کا اعلان کرنا عام ہوگیا اور یہ یا تو سفیروں کے ذریعے سے عمل میں
آتا تھا یا خطوط کے ذریعے سے۔

یہ چیز دیکھنے میں آئی تھی فریڈرک باربروسہ نے سلطان صلاح الدین
سے تلافی کا مطالبہ کیا تھا، اور یہ دھمکی دی تھی کہ اگر وہ تلافی کرنی نہ
چاہے تو وہ جنگ کے لیے تیار ہوجائے۔ چنانچہ مورخ نے لاطینی میں
لکھا ہے "چونکہ شہنشاہ اپنی طرف سے کمزوری دکھانا گوارا نہیں کرتا
تھا بلکہ ہمیشہ اپنی فوجوں کو جنگ کرنے کا اشارہ کرتا رہتا تھا اس لیے
شہنشاہ نے صلاح الدین کے ہاں ایک پیام رساں بھیجا کہ یا تو وہ ان
مضرتوں کی پوری تلافی عمل میں لائے جو عیسائیوں کو عام طور پر پہنچائی
گئی ہیں یا اگر وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہو تو جنگ کے لیے تیار ہوجائے"۔

بہر حال فریڈرک باربروسہ نے ۱۱۸۷ء میں نورنبرگ کی مجلس شورائے قومی میں "جو شہنشاہت کا امن" قایم کیا تھا، اسی سے وہ تصور پیدا ہوا جو ہمیں بعض مولفوں کے ہاں نظر آتا ہے، اور جس کے مطابق دشمن کو تین دن کی مہلت دی جانی چاہیے۔ خانگی جنگ کے متعلق احکام دیتے ہوئے شہنشاہ نے ہر ایک کے لیے یہ حق محفوظ کر دیا تھا کہ اپنا انصاف آپ کرے بشرطیکہ تین دن پہلے اس کی اطلاع کردی گئی ہو۔

"ایمن بوک" بروسیل کے کتب خانۂ شاہی کے نفیس ترین مخطوطات میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں گل رے نے ہتیاروں کا ذکر کیا ہے اور گلدر کے ڈیوکوں کے ہتیاروں کا اسے نقیب کہا جاسکتا ہے۔ ("گل رے یا گلدرے کا نقیب" کی اصطلاح اسی طرح برتی جاتی تھی جس طرح "صقلیہ کا نقیب" اور "نوار کا نقیب" کی اصطلاحیں)۔ اس کتاب میں خاص کر وہ دلکش نظمیں بھی پائی جاتی ہیں جو "نیچی جرمن بولی" میں لکھی گئی ہیں اور جو پورا علاقہ گل رے اپنی شریف گڑھیوں میں گایا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک نظم میں اس اتہام حجت کا ذکر ہے جو ۱۳۳۲ء میں برابان کے ڈیوک تیسرے ژاں سے ان جاگیرداروں نے کرلیا تھا جنھوں نے فالوا کے فلپ کو خوش کرنے کے لیے اس (ژاں) کے خلاف حلیفی قائم کرلی تھی۔

آرتوا کے تیسرے روبیر نے، جو بومُوں کا کونٹ بھی تھا، اپنی چچی ماتلدا سے آرتوا کی ایک کونٹی (جاگیر) کے متعلق جھگڑا مول لیا تھا۔ وہ اپنے مقدمے میں ہار گیا تھا۔ چند سال کے گزرنے کے بعد اس نے ایک نئی کارروائی کا ارادہ کیا۔ اور اس مرتبہ اس نے اپنی تائید میں بعض اہم دستاویزیں بھی فراہم کرلی تھیں۔ ان کو جعلی قرار دیدیا گیا تھا، اور جن اصل لوگوں نے اسے مرتب کیا تھا ان کا پیچھا کیا گیا اور ان کو مطعون قرار دیا گیا تھا۔ روبیر کو عدالت امراء میں

طلب کیا گیا وہ برابان کے ڈیوک کے علاقے میں جا پناہ گزین ہو گیا اور اس نے یہ استدعا کی کہ اس معاملے کو ختم کر دیا جائے۔ آخر کار قصور کے باعث اسے جلاوطنی اور اس کی تمام جائداد اور دیگر حقیتوں کی قرقی اور ضبطی کی سزا دی گئی۔ فرانس کے بادشاہ نے تیسرے ژان سے جو برابان کا ڈیوک تھا، یہ مطالبہ کیا کہ وہ رُوبیر کو اپنے علاقے سے نکال باہر کرے۔ لیکن اس نے اس استدعا کا سختی کے ساتھ انکار میں جواب دیا تھا۔ اس پر ڤالوا کے فلپ نے اس بات میں کامیابی حاصل کی تھی کہ برابان کے ڈیوک کے خلاف ایک وسیع جتھا بندی قائم کرے جس میں شریک ہونے والوں نے تیسرے ژان کو دھمکی دے کر اتمام حجت کیا۔ کتاب "واپن بوک" کا مولف یکے بعد دیگرے ان حلیفوں کو منظر پر لایا ہے۔ کولون کے اسقف نے کہا کہ: اے آقا، اے جنگلی سور! تو اس میدان میں ہار جائے گا کیونکہ تیرے دشمنوں کے دانت بڑے تیز ہیں"۔ اس کے بعد سولہ مرتبہ اور اتمام حجت کی کارروائی کی گئی۔ صرف ایک جاگیردار نے بہادر ڈیوک کی تائید کی اور یہ بار کا کونٹ تھا اس نے تیسرے ژان کے مخالفوں کو نصیحت کی کہ "جنگلی سور کی راہ پر نہ چلیں"۔ پھر ڈیوک منظر پر آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ "میں برابان کا ڈیوک ہوں لوگ مجھے جنگلی سور کے خطاب سرداری سے مخاطب کرتے ہیں۔ دوست اور رشتہ دار مجھے چھوڑ دیتے ہیں سوائے ایک بار کے شریف کونٹ کے۔ لیکن میرا جواب سنو: یہ دھمکیاں اور یہ غرور نہ تو دیانتداری پر مبنی ہیں اور نہ عقلمندی پر۔ لیکن اگر تم اس پر تلے ہوئے ہو کہ میری ڈھال پھاڑ ہی ڈالو تو اسی میدان جنگ میں کسی معینہ دن تم سب جمع ہو جاؤ اور جنگ کا جوا کھیل دیکھو"۔[1]

---

[1] "واپن بوک" (ہتیاروں کی کتاب)، یا سنہ ۱۳۳۴ء تا سنہ ۱۳۷۲ء کی ڈھالوں پر کے

پانچویں شارل نے تیسرے ایڈورڈ کے خلاف جنگ کا جو اعلان کیا تھا، اور جو خط کے ذریعے سے عمل میں آیا تھا، اس کا فرواسار نے نہایت تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ: "جو جوان اتمام حجت کا خط لے گیا تھا وہ اس کمرے میں داخل ہوا جہاں بادشاہ اور اس کی مجلس شوریٰ موجود تھی۔ اور اس نے بیان کیا کہ وہ فرانس کے بادشاہ کے محل کا ایک جوان ہے۔ اور اسے بادشاہ ہی نے وہاں بھیجا ہے۔ اور وہ انگلستان کے بادشاہ کے نام ایک خط لایا ہے۔ لیکن اس خط میں کیا بیان ہوا ہے، یہ اسے نہیں معلوم، اور نہ ہی اسے اس سے تعلق ہے کہ اس پر گفتگو کرے یا اس کو جانچے۔ اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر وہ خط بادشاہ کو پیش کیا۔ بادشاہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ وہ اس خط کو کھلواتا اور پڑھواتا ہے۔ جب اس میں لکھی ہوئی چیز کو پڑھکر سنایا گیا تو بادشاہ اور وہ سب لوگ جو وہاں تھے حیران ہو گئے، کیونکہ اس میں اتمام حجت اور دھمکی درج تھی"۔ فرواسار نے اس کے بعد یہ بیان کیا ہے کہ: "تمھیں جاننا چاہیے کہ اس وقت انگلستان کے بادشاہ اور اس کی مجلس شوریٰ نے ان دھمکیوں کو بہت برا مانا اور ناراض ہوئے جو ایک لونڈے کے ہاتھ بھیجی گئی تھیں۔ اور انھوں نے کہا کہ یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی کہ فرانس اور انگلستان میں بادشاہوں جیسے بڑے سرداروں کی جنگ کی اطلاع اور خبر رسانی ایک لونڈے کے ذریعے سے عمل میں آئے۔ بلکہ چاہیے یہ تھا کہ یہ کام کوئی صدر پادری یا کوئی بہادر شخص، کوئی جاگیردار یا کوئی شہامت باز انجام دیتا۔ لیکن پھر بھی ایسا نہ ہوا"[1]۔

180

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ نقش ونگار مولفہ گلرے ڈھال والانقیب، شایع کردہ موسیو لکلو ربوتوں۔

[1] فرواسار کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" کتاب اول حصہ دوم ص ۲۶۲۔

چوتھے ایڈورڈ نے گیارھویں لوئی کے خلاف جو اعلان جنگ کیا تھا، اس میں تمام ضوابط و قواعد ملحوظ رکھے گئے تھے۔ چنانچہ مورخ کومین لکھتا ہے کہ "بادشاہ ایڈورڈ نے ڈوور سے چلنے سے پہلے فرانس کے بادشاہ کے پاس ایک اکیلا نقیب روانہ کیا۔ وہ انگلستان کے بادشاہ کی طرف سے اتمام حجت اور نہائیے کا ایک خط بادشاہ کے نام لایا جو بڑی اچھی زبان اور خوبصورت اسلوب میں لکھا ہوا تھا۔ اور اس یقین کا اظہار کیا گیا تھا کہ انگریز نے کبھی اس کے متعلق ہاتھ نہیں ڈالا ہوگا۔ اس نے [فرانس کے] بادشاہ سے خواہش کی کہ وہ اس کو فرانس کی بادشاہت جو اسے حاصل تھی واپس کردے تاکہ وہ کلیسا اور جاگیرداروں اور قوم کو ان کی قدیم آزادی واپس دے سکے اور ان پر سے عظیم خدمات مالی وجسمی کا بار ہٹا سکے جو ان پر عائد تھا۔ اور اگر اس سے انکار کیا جائے تو اس سے جو برے نتائج نکلیں گے ان سے اس نے اپنی براءت کا اظہار کیا۔ اور یہ چیز اس طور اور اس طریقے سے عمل میں آئی جن کا ایسی صورتوں کے متعلق وہ یعنی بادشاہ انگلستان عادی ہے۔"[۱]

نقیبوں کے ذریعے سے باضابطہ اعلان کروانے کا جو رواج تھا، اس میں شہامت بازی کی ایک جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نقیبوں کے سردار اور نقیب ایک طور سے ان فرائض کو انجام دیتے تھے جو رومیوں میں [مجلس خارجہ کے] فیتیالی پجاری۔[۲]

کامبرے کا معاہدۂ حلیفی طے ہونے کے بعد بارھویں لوئی نے وینیس کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ "اس نے مون ژوا کو جو اس کا پہلا صدر نقیب تھا، وینیس روانہ کیا تاکہ فرانس کے رواج

۱۔ فلیپ دکومین کی فرانسیسی تالیف "یادداشتیں" کتاب چہارم باب پنجم۔
۲۔ ریال دکوریاں کی فرانسیسی کتاب "علم حکمرانی" جلد (۵)، ص ۲۹۳۔

کے مطابق تھے نیس والوں کے خلاف اعلان جنگ کرے۔ چنانچہ اس نے سینیٹ کے بھرے اجلاس میں اور ڈوجے [یعنے صدر جمہوریہ تھے نیس] اور ارکان سینیٹ کی موجودگی میں ان کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور بادشاہ کی طرف سے انھیں آگ اور خون کی دھمکی سنائی۔ یہ ایک مذہبی رسم تھی جو اس زمانے میں ملحوظ رکھی جاتی تھی، جس کے مطابق جنگ اچانک نہیں کی جاسکتی تھی۔ اور صاف صاف ہونے کے باعث اس میں زیادہ نامردی بھی سمجھی جاتی تھی"۔ یہ الفاظ ہم نے پیئل بُودیے سے مستعار لیے ہیں۔ یہ شخص تیرھویں لوئی کے زمانے میں فرانس کا تاریخ نگار تھا۔

شہامت بازی کی اس روح کے باعث خود لڑائیوں کا تک پیشگی تعین کردیا جاتا اور مقابلے کا دِن اور مقام مقرر کردیے جاتے اس ہیں، اور دو آدمیوں کے تنہا مقابلے میں، محض ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ اگرچہ ایسے ڈوئل یا مبارزت کی صورتیں بہت زیادہ پیش نہیں آتی تھیں، لیکن قرون متوسطہ کی آخری صدیوں میں فوجوں کے پیہ سالار اس طرح باہم لڑتے تھے؛ جیسا کہ تاریخ میں محفوظ ہے اور قانون جنگ سے متعلقہ تالیفوں میں اس مبارزت کو ایک اہم جگہ حاصل ہے۔ مثال کے طور پر پاریس دِل پُوت سو نے مبارزت کے قواعد کے متعلق ایک رسالہ بھی لاطینی میں تالیف کیا ہے جس کا نام "فوجی چیزوں کے متعلق رسالہ" ہے اس تالیف کی ساتویں کتاب کے ایک حصے میں ان مسائل سے بحث ہے جو دو دو آدمیوں کی تنہا مبارزت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولف نے یکے بعد دیگرے مسائل ذیل سے بحث کی ہے: چنانچہ اس کے لاطینی عنوانات یہ ہیں "کیا دو اہل خصومت کے لیے اس کی اجازت ہے کہ جنگ کریں"، "کیا بادشاہ کے لیے یہ روا ہے کہ بادشاہت کے لیے شہنشاہ سے جنگ کرے"، "کیا متخاصم بادشاہوں کے لیے اس کی اجازت ہے کہ جنگی مہم روانہ کریں"،

181

"کیا کسی غیر تاجدار بادشاہ کو تاجدار بادشاہ سے جنگ کرنی جائز ہے؟"[1] پیئیر بلّی نے بھی یہ سوال کیا ہے کہ (لاطینی میں) "کیا ڈیوکوں (قائدوں) کے لیے یہ جائز ہے کہ تنہا مقابلہ کریں[2]۔"

تیسرے ایڈورڈ نے ڤالوا کے فلپ کے پاس جو تجویز پیش کی تھی کہ یہ اپنے جھگڑے کا فیصلہ یا تو مبارزت کے ذریعے سے کرلے یا اس طور سے کہ ہر فریق کی طرف سے ایک ایک سو سوار مقابلہ کریں ـــــ اس تجویز سے سب لوگ واقف ہیں۔ اس میں فرانس کے تخت کی بازی لگی ہوئی تھی[3]۔ اسی کا ایک مماثل واقعہ اس سے پہلے پیش آیا تھا۔ اس کا ذکر قرون متوسطہ کے مولفوں کے مقالات میں عام طور سے آتا ہے۔ چنانچہ ۱۲۸۳ء میں آراگوں کے بادشاہ نے آن ژو کے شارل کے پاس یہ تجویز پیش کی تھی کہ صقلیہ کے متعلق اپنا جھگڑا ایک ایسے مقابلے کے ذریعے سے طے کرلے جس میں ہر حریف سو سو سواروں کی ایک جماعت ساتھ لائے اور یہ مقابلہ بورڈو میں انگلستان کے بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے ہوجائے۔ یہ پیشکش قبول کرلیا گیا۔ اور نمایندوں کے ذریعے سے مقابلے کی شرطیں بھی طے ہوگئیں اور یکم جون ۱۲۸۳ء کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔ بوریس نے لکھا ہے کہ "مقابلے کے لیے جو دن مقرر ہوا تھا اس دن آن ژو کا شارل ایک سو سواروں کے ساتھ میدان جنگ میں حاضر ہوگیا اور آفتاب

---

[1] پاریس دل پوت سو (پاریس آپو تے او) کی لاطینی تالیف "فوجی چیزوں کے متعلق نفیس اور جسوطار رسالہ" رسائل حقوق عمومی جلد (۱۶) ورق ۴۰۶ و مابعد۔

[2] پیئیر بلّی کی لاطینی کتاب "فوجی اور جنگی چیزوں کے متعلق رسالہ" حصہ دوم عنوان ۱۵۔

[3] وارڈ کی انگریزی کتاب "یورپ میں قانون بین الممالک کی بنیاد و تاریخ کے متعلق تحقیقات" جلد (۲) ص ۲۱۳۔

ڈوبنے کے بعد تک انتظار کرتا رہا لیکن آراگوں کا بادشاہ نہیں آیا۔ اور وہ پنچوں کو یہ بتا کر کہ وہ خود تو حاضر ہوگیا لیکن آراگوں کے بادشاہ پییر (پیٹر) نے ملنے کے وعدے میں قصور کیا، وہاں سے رخصت ہوگیا۔ آراگوں والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اصل میں ان کے حکمران کو معقول وجوہ کی بنا پر یہ ڈر تھا کہ فرانس کے بادشاہ نے اس کے خلاف کمین گاہیں تیار نہ کردی ہوں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آراگوں کا بادشاہ پییر صرف یہ چاہتا تھا کہ اس بہانے کچھ مہلت حاصل کرے اور اپنے حریف کو چکمہ دیدے[1]۔

182 جنگ کے اعلان کا قاعدہ رفتہ رفتہ غائب ہوگیا۔ انگلستان میں یہ ایک اور مرتبہ ۱۵۵۷ء میں ملحوظ رکھا گیا۔ چنانچہ جب ملکہ ماری نے اپنے شوہر دوسرے فلپ کی ترغیب سے وہ مہلک جنگ شروع کی جس میں گوئیز کے ڈیوک نے بندرگاہ کالے پر قبضہ کرلیا تھا تو اس ملکہ نے دوسرے ہنری کے ہاں اپنے نقیب کلاران سیو کو بھیجا اور اسی دن دوسرے نقیبوں نے شہر میں جنگی کارروائیوں کے شروع ہو جانے کا ڈھنڈورہ پیٹ دیا۔ اس کا مقابلہ اس رواج سے کیا جاسکتا ہے جس کا ذکر گروتیوس نے کیا ہے اور جس کے مطابق فریق ثانی کے نام ایک اعلان شایع کرنا ضروری ہوتا ہے[2]۔ قوم کے نام جنگی کارروائیوں کے شروع ہونے کی اطلاع شایع کرنی اصل میں اس نظریے کے باعث تھی کہ جنگ کا اعلان کیا جائے۔ اس قسم کی ایک نظیر ۱۶۳۵ء میں ملتی ہے۔ چنانچہ تیرھویں لوئی نے ایک نقیب کو بروسیل روانہ کیا تاکہ وہاں اسپین کے بادشاہ کے خلاف

---

[1] بوریس یی کی فرانسیسی کتاب "صقلیہ کی تاریخ عمومی" جلد (۲) ص ۲۰۴

[2] گروتیوس کی کتاب "قانون جنگ و صلح" کا فرانسیسی ترجمہ از باربیراک کتاب سوم باب اول فصل (۵)

جنگ کا اعلان کرے۔ یہ اعلان کارڈینل شہزادے کے پاس کیا گیا جو اسپین کے حکمران کی فوجوں کی نشیبستان (ہالینڈ) میں سپہ سالاری کر رہا تھا۔ فرانس کا نقیب جس کا نام آلاسون تھا، بروسیل پہنچا۔ اس کے ساتھ ایک نقارہ تھا۔ اس نے کارڈینل شہزادے کے ہاں باریابی کی خواہش کی۔ اور جب اس کا موقع اسے نہ دیا گیا تو اس نے اس اعلان کا ایک نسخہ جو شہزادے کو پیش کیا جانا چاہیئے تھا، جمع شدہ لوگوں میں پھینک دیا۔ مورخ ریال لکھتا ہے کہ: "پھر وہ شہر سے چلا گیا۔ اور جب سرحد پر ایک گاؤں میں پہنچا تو اس نے عین شاہراہ کے بیچ میں ایک کھونٹا گرجا سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر گاڑ دیا اور اس پر وہی اعلان اٹکا دیا جو اس نے بروسیل میں کیا تھا۔ اور اس گاؤں کے صدر افسر اور لوگوں کو اس سے آگاہ کر دیا۔ اس اثناء میں بادشاہ کا ڈھنڈورہ پیٹنے والا وہ فرائض انجام دیتا رہا جو اس کے لیے مقرر تھے۔ نقیب نے واپس آکر اپنی کارگزاری کا ماجرا بادشاہ کو سنایا اور بادشاہ نے حکم دیا کہ اس جنگ کے وجوہ کی اطلاع اس کے تمام صوبوں میں شایع کی جائے اور اس کے ہاں کی تمام پارلیمانوں میں اس کا داخلہ لیا جائے"[شہ]

باضابطہ طور سے اعلان کرنے کی آخری مثال ہم کو سویڈن کی تاریخ میں ملتی ہے۔ اور یہ اس وقت ہوا تھا جب سویڈن نے سنہ ۱۶۵۷ء میں ڈنمارک کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا۔

نقیبوں کے ذریعے یا حکمران کے نام خطوط کے ذریعے سے باضابطہ اعلان جنگ کی جگہ اب اس بات نے لے لی کہ ایک اعلان شایع کر کے حالت جنگ کے پائے جانے کی اطلاع دی جائے۔ بہت سی صورتوں میں تو فریق ثانی کو کوئی اطلاع دیے بغیر جنگ

شہ۔ ریال فرکھیاں کی فرانسسی کتاب "علم حکمرانی" جلد (۵)، ص ۲۹۶

شروع ہوتی۔ اگر اسے ترقی سمجھنے میں کسی کو شبہہ ہو تو یقیناً وہ اس شبہے میں حق بجانب ہوگا۔

183

بعض وقت عجیب عجیب صورتیں پیش آئیں۔ ۱۵۲۸ء میں آٹھویں ہنری اور شارل کیں میں جو جنگ ہوئی، اس کے متعلق یہ نہیں معلوم کہ آیا اس کا اعلان کیا گیا تھا یا نہیں۔ حقیقت میں جب فرانس کا ایک نقیب شہنشاہ کے پاس اعلان جنگ کرنے گیا تو انگلستان کا نقیب جو اس کے ہمراہ تھا، اس نے بھی اول الذکر کے اتمام حجت اور نہایتے پر یہ اضافہ کیا کہ اگر فرانس کے واجبی مطالبے قبول نہ کیے گئے تو انگلستان کا بادشاہ بھی فرانس کے بادشاہ کا حلیف بن جائے گا۔ شارل کیں نے فرانس کے نقیب کو تو حیرت کے ساتھ جواب دیا لیکن انگریزی نقیب سے یہ توقع ظاہر کی کہ ان دونوں ملکوں میں امن برقرار رہے گا۔ فریقین میں سے کسی کو بھی معلوم نہ ہوسکا کہ ان میں سے کس پر اعتماد کریں۔ ابتدائی تدبیریں اختیار کی گئیں، سفیروں پر نگرانی قائم کردی گئی، تاجروں کو گرفتار کرلیا گیا اور آخر کار لندن کے حلقۂ تجارت کے مطالبات کی تکمیل کے لیے آٹھویں ہنری نے نشیبستان (ہالینڈ) کی حکومت سے ایک عارضی صلح کرلی۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے دوسرے فلپ اور الزابتھ میں جو طویل جنگ جاری رہی، اس کا کبھی بھی باضابطہ طور سے اعلان نہیں ہوا تھا۔ نازک قسم کے جھگڑے پیدا ہوگئے تھے۔ چنانچہ الزابتھ نے اگر باغی نشیبستان کی مدد اور اعانت کی تھی تو دوسرے فلپ نے آئرلینڈ کے کیتھولکوں کی تائید کی تھی اور ان سب کے باوجود ان کے تعلقات میں کوئی علانیہ طور سے انقطاع نہیں ہوا تھا۔ ڈریک اور دیگر مشہور امیرالبحروں نے اسپینی بیڑے کے خلاف جو مہمیں اختیار کی تھیں، ان سے بے تعلقی کا اظہار کردیا گیا تھا۔ اور خود اس وقت جب ملکہ نے صوبجات متحدہ کو

یہ ضمانت دی تھی کہ وہ ان کو اسپین کے خلاف مسلّح مدد دے گی، تو اس وقت بھی جنگ کا قطعاً کوئی اعلان نہیں ہوا، بلکہ ایک بحث مباحثے کے بعد یہی طے کیا گیا کہ اس کا اعلان نہ کیا جائے[1]۔

دشمن کے خلاف جو برتاؤ کیا جانا چاہیئے اس کے تعیّن کے لیے بھی خصوصی احکام نافذ ہوتے رہے۔ چنانچہ کبھی تو دشمن کے ساتھ ایسے تجارتی تعلقات رکھنے کی ممانعت کی جاتی رہی جن سے اسے جنگ میں مدد ملے —— یہ حکمِ امتناعِ خارجی ہے۔ اور کبھی ہر قسم کے تعلقات کی ممانعت کی جاتی رہی بجز اس کے کہ صراحت سے اجازت دی جائے —— یہ حکمِ تعطل ہے۔ اور کبھی اپنی رعایا کے ان افراد کو جو دشمن کے ملازم ہوں، بلکہ خود ان کو جو کسی تیسری سلطنت کے ملازم ہوں، انھیں بھی اپنے وطن کی خدمت کے لیے طلب کرلیا جاتا تھا —— یہ حکمِ طلبانہ ہے[2]۔

ایک خصوصی قسم کے طلبناموں میں یہ امر مضمر ہوتا تھا کہ جنگ کا اعلان ہو چکا ہے۔ اس قسم کے طلبنامے ان طویل سیاسی جھگڑوں کے زمانے میں نمودار ہوئے جو پوپوں اور اٹلی کے حکمرانوں اور جمہوریتوں کے مابین پیش آئے تھے۔ ان میں سے چند نظائر اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں پانچویں کلیمان (پوپ) نے یہ دعویٰ کیا کہ شہر فرارے پر مقامِ مقدس یعنی پوپ کو حقوقِ ملکیت حاصل ہیں اور وینیس والوں نے اس پر قبضہ کر رکھا تھا۔ پوپ نے وینیس کو ایک مذہبی سفیر روانہ کیا تاکہ اپنے مطالبوں کی

---

[1] وارڈ کی انگریزی کتاب "جس طور پر یورپ میں گذشتہ دو صدیوں میں مختلف جنگیں شروع ہوئیں اس کے متعلق تحقیقات" ص ۸۔

[2] ہیکلوبر کی فرانسیسی تالیف "یورپ کا جدید قانون بین الممالک" ف ۲۴۱۔

توضیح کرے لیکن یہ سفیر اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اور اب کلیسا کے مقتدر اعلیٰ نے اپنا یہ فریضہ باور کیا کہ روحانی ہتیاروں سے مدد لی جائے۔ چنانچہ ۲۷ مارچ ۱۳۰۹ء کو ایک فرمان پاپائی صادر ہوا جس میں وینیس والوں کو حکم دیا گیا تھا کہ فرارے کا ایک مہینے کی مدت میں تخلیہ کردیں۔ ورنہ وینیس کے ڈوجے (صدر جمہوریہ) اور گورنر کو جات باہر کیے جانے کی دھمکی دی گئی۔ اور خود جمہوریت کو یہ دھمکی دی گئی کہ اس کی سرزمین میں پادریوں کو فرائض کلیسائی کے انجام دینے سے روک دیا جائے گا۔ اور یہی دھمکیاں ان تمام قوموں کو دی گئیں جو وینیس کے ساتھ کسی قسم کا بھی کاروبار کریں چنانچہ کوئی تجارتی سامان یا کسی بھی قسم کا کھانے پینے کا سامان نہ تو ان سے خریدا جاسکتا تھا اور نہ ان کو بیچا جاسکتا تھا۔ ڈوجے اور جمہوریت کو ان تمام مراعات اور جاگیروں سے محروم کردینے کی بھی دھمکی دی گئی جو مقام مقدس کی طرف سے ان کو عطا ہوئی تھیں۔ ان کی تمام رعایا کو حلف وفاداری سے بری بھی کردیا جانے والا تھا۔ وینیس والوں کے متعلق یہ بھی اعلان کیا جانے والا تھا کہ ان کے نام کو بٹہ لگ چکا ہے، وہ اس قابل بھی نہیں ہیں کہ خود اپنے گھر میں کوئی سرکاری خدمت انجام دے سکیں یا عدالت میں حاضر ہوسکیں یا گواہی دے سکیں یا کسی کی وراثت میں حصہ پاسکیں۔ اور چار نسلوں تک ان کی اولاد ہر قسم کے کلیسائی اور کشوری اعزازات سے خارج رہے گی —— یہ سب وہ سزائیں تھیں جو ایک ماہ بعد بھی اطاعت نہ کرنے پر دی جانے والی تھیں۔ اگر وہ ایک اور ماہ بعد بھی اپنے اصرار پر قائم رہیں تو پوپ وہاں کے ڈوجے اور دیگر عہدہ داران جمہوریت کو ان کے عہدوں سے معزول کردے گا، ان کے مقروضوں کو قرضوں سے بری قرار دیدے گا، تمام معاہدوں کو فسخ شدہ قرار دے گا، تمام وینیس والوں کی منقولہ وغیر منقولہ جائداد ضبط کرنے کا حکم دے گا

اور تمام سلطنتوں کو ہدایت دے گا کہ ان پر چڑھ دوڑیں اور وہاں کے لوگوں کو غلام بنا ڈالیں۔[1]

حقیقت میں پادریوں نے جمہوریۂ وینس کے تمام علاقوں میں نماز پڑھانے کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ تمام راسخ العقیدہ لوگ اس بات سے محروم کر دیے گئے کہ اپنے لیے مراسم تقدیس (مثلاً نکاح وغیرہ) انجام دلا سکیں بلکہ خود نوزائیدہ بچوں کو بپتسمہ دینے کی بھی بڑی مشکل سے اجازت ملنے لگی۔ ایک صلیبی جنگ کا پرچار کیا جانے لگا اور صلیبی جنگجوؤں کی سرداری کے لیے ایک کارڈینل مامور ہوا۔ تقریباً پورے یورپ میں پوپ کے احکام کی تعمیل ہوئی۔ انگلستان میں وینس والوں کی تجارتی ایجنسیاں لوٹ لی گئیں۔ فرانس میں ان کی جائداد قرق کر لی گئی۔ اٹلی کے ساحلوں پر تو قتل عام بھی عمل میں آئے اور ان میں سے بہت سے غلام بنا کر عربوں کے ہاتھ بیچ دیے گئے۔[2]

۱۳۰۹ء کے فرمان پاپائی کی ایک اور مماثل دستاویز سنہ ۱۴۸۳ء کا فرمان پاپائی ہے جس کی رو سے پوپ چوتھے سکست نے وینس کی حکومت کو حکم دیا کہ پندرہ دن کے اندر وہ تمام علاقہ واپس کر دے جو اس نے فرارے کے ڈیوک سے فتح کیا تھا ورنہ دوجے معزز زین، ان کی رعایا اور پوری جمہوریت کو جات باہر کر دیا جائے گا اور ان تمام علاقوں میں جو وینس کے تحت تھے، حتیٰ کہ سمندر پار مقبوضات میں بھی پادریوں کو ممانعت کی گئی کہ فرائض کلیسائی جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ یہ حکم دیا گیا کہ ان علاقوں میں پادری نہ تو نمازیں پڑھائیں نہ مراسم تقدیس انجام دیں حتیٰ کہ حالت نزع کی

---

[1] ۔ دالمشہ کی فرانسیسی تالیف دو وینس کی تاریخ ”کتاب ہفتم

[2] ۔ ایضاً۔

تلقین تک نہ کریں۔ تمام پادریوں کو یہ حکم دیدیا گیا تھا کہ وہ حکومت ثےنیس سے نکل کھڑے ہوں۔ تمام ثےنیس والوں کی جائدادیں ضبط کرلی گئیں ان کے تمام مقروض اپنے قرضوں سے آزاد ہو گئے اور ان کو جات باہر کیا جائے لگا اگر وہ ان قرضوں کا کل یا جزو ادا کردیں۔ جو ثےنیس والے فرار ہے کے خلاف ہتیار اٹھائیں تو ان پر چڑھ دوڑنے کی ہر کسی کو اجازت دیدی گئی۔ اور جو کوئی کسی مستحق کا گلا کاٹے تو اس کارگزاری کے صلے میں وہ اس کے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ دوجے اور تمام حکام عدالت اپنے عہدوں سے برطرف کردیے گئے۔ حکومت ثےنیس کو ان تمام حقوق سے محروم قرار دیا گیا جو اسے اپنے مقبوضہ ممالک میں حاصل تھے! تمام ثےنیس والوں کے متعلق یہ اعلان کردیا گیا کہ ان کے نام کو بٹہ لگ چکا ہے، وہ اس بات کے ناقابل ہو چکے ہیں کہ عدالت میں آسکیں یا گواہی دے سکیں یا کسی کے وارث بن سکیں۔ ان کے بیٹے بھتیجے اور ان کی اولاد چار پشت تک کلیسائی عہدوں، منفعتوں اور اعزازوں سے ممنوع قرار دی گئی۔ تمام اجنبیوں کو حکم دیا گیا کہ کسی توقف کے بغیر فوراً اپنا تجارتی سامان لے کر ثےنیس کی سرزمین سے چلے جائیں۔ اور انھیں یہ بھی حکم دیا گیا کہ جمہوریہ ثےنیس کی رعایا سے نہ تو کوئی کاروبار کریں اور نہ معاہدہ۔ اور ان کے ہاتھ نہ تو کوئی غلہ فروخت کریں اور نہ کوئی کھانے پینے کی دوسری چیزیں، ورنہ جات باہر کردیا جائے گا۔ اور معاہدے کالعدم قرار دیدیے جائیں گے۔ تمام سپاہی پیشہ لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ ثےنیس والوں کی طرف سے ہتیار نہ اٹھائیں حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ وہ بھرتی کرلیے جاچکے ہوں۔ اور فرمان پاپائی نے ان کو اس حلف اطاعت سے بری قرار دیدیا۔ تمام بادشاہوں اور حکمرانوں کو اس کی ممانعت کردی گئی کہ جمہوریہ ثےنیس کے ساتھ کسی حلیفی کا معاہدہ کرسکیں اور خود جو معاہدے موجود ہوں وہ

بھی باطل و کالعدم قرار دیدیے گئے۔ آخر میں انھیں یہ بھی حکم دیا گیا کہ جمہوریۂ ؔوینیس کے لوگوں، تجارتی سامانوں اور رعایا کا تعاقب کریں اور انھیں گرفتار کرلیں۔[۱]

؁۱۵۰۹ء میں پوپ ؔیولیوس نے ایک گھن گرج فرمان ؔوینیس والوں کے لیے صادر کیا۔ اس میں اس نے وہ تمام جرائم شمار کرائے جن کا کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے "مقام مقدس" کے خلاف ارتکاب کیا تھا۔ اور اس نے ان سے مطالبہ کیا کہ چوبیس دن کے اندر وہ اپنے تمام مغصوبہ علاقے واپس کردیں اور وہ آمدنی بھی جو ان سے حاصل ہوئی ہو، ورنہ ان کے خلاف احکام صادر کیے جائیں گے چنانچہ اگر وہ نہ مانیں تو وہ ان کے متعلق یہ اعلان کرے گا کہ انھوں نے خدائی اقتدار کے حامل کے قتل کا ارتکاب کیا ہے۔ اور نہ صرف شہر ؔوینیس کے پادریوں کو فرائض کلیسائی کے انجام دینے سے منع کردے گا، بلکہ ان تمام شہروں میں بھی جو ان کے قبضے میں رہوں۔ اور وہ اجنبی مملکتیں جو کسی ؔوینیس والے کو پناہ دیں، تو ان کے شہروں کو بھی اسی سزا کا مستوجب قرار دیا جائے گا۔ پوپ نے تمام عیسائیوں کو اس کا بھی مجاز قرار دیا کہ ؔوینیس والوں کے ساتھ دشمنانِ عمومی کا سا برتاؤ کریں اور ان کا مال لوٹ لیں اور ان کو غلام بنا ڈالیں۔[۲]

؁۱۴۸۳ء اور ؁۱۵۰۹ء کے فرامین پاپائی کے متعلق یہ خیال کرنے میں احتیاط کرنی چاہیے کہ ان کے وہی معنے ہیں جو ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتے ہیں اور جیسا کہ ؔدارو نے بیان کیا ہے یہ تمام

۱؎ فی تور یوسان دی کی اطالوی تالیف "ؔوینیس کی کشوری تاریخ" کتاب ۸ باب ۱۰ مقالہ (۲) ؔدارو کی فرانسیسی تالیف "ؔوینیس کی تاریخ" کتاب ۱۸

۳؎ فرانچسکو گچاردینی کی فرانسیسی تالیف "ؔاٹلی کی تاریخ" کتاب (۸) باب (۲)۔

دھمکیاں محض گیدڑ بھبکیاں تھیں جن کا خود پادری مضحکہ اڑاتے تھے۔
۱۴۸۳ء میں وینیس کی حکومت نے پادریوں پر اپنا اقتدار قائم کردیا۔ شاذ ہی کسی راہب نے اس کی تائید کی کہ غیر منصفانہ طور سے جات باہر کرنے کا کوئی اثر ہوسکتا ہے۔ اسقف جمع ہوئے، ماہرین قانون سے مشورہ ہوا اور بالاخر فرمان پاپائی کے خلاف آیندہ ہونے والی مجلس شورائے مذہبی کے ہاں مرافعہ دائر کردیا گیا اور اس مرافعے کی نقل خود شہر روما کے کلیساؤں کے دروازے پر چسپاں کردی گئی[1]۔

۱۵۰۹ء میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔ دستاویز کی اشاعت کے چند دن بعد جمہوریۂ وینیس نے روما کو ایک تحریر بھجوائی جس میں پوپ اور بادشاہ فرانس پر خوب لعن طعن کی گئی تھی۔ آیندہ ہونے والی مجلس شورائے مذہبی کے ہاں مرافعہ دائر کردیا گیا اور اگر انسانی انصاف حاصل نہ ہوسکے تو خود حضرت یسوع مسیح سے اپیل کی گئی جو "برائی سے مبرا ج اور ہر دو فریقوں کے مقتدر کل آقا" ہیں[2]۔

۱۵۱۰ء میں پوپ دوسرے یولیوس نے وینیس والوں سے صلح کرلی۔ ان کے سفیر روما آئے تاکہ وہ اپنی جمہوریت کے حق میں براءت اور معافی حاصل کریں۔ اس کے چار مختلف طریقے تھے۔ پوپ کے ہاں کے افسر مراسم پاریس دے گراسس نے اپنی لاطینی کتاب "روزنامچہ" میں سابقہ نظائر کی توضیح کی ہے کہ تمام صورتوں میں ملزموں کو ڈنڈے لگائے گئے، چند کو ننگا کر کے اور چند کو کپڑوں کے اوپر ہی سے اور بعض کو تو خوب اچھی طرح سے، چنانچہ

---

[1] دارو کی فرانسیسی تالیف "وینیس کی تاریخ" کتاب (۱۸)

[2] فران چس گوگچار دینی کی فرانسیسی تالیف "اٹلی کی تاریخ" کتاب (۸) باب (۲)

اتنی دیر کہ بائبل کے تین رکوع کی پوری طرح تلاوت کر لی جائے۔ جب پوپ نے مشورہ کیا تو گراسیس نے اسے یہ رائے دی کہ ٹے نیس والوں کو چند بہت ہلکی ضربیں لگائی جائیں لیکن پوپ دوسرے یولیوس نے ان کو معافی کی اس توہین آمیز رسم سے بالکل معاف کر دیا اور ان کے لیے کفارہ یہ مقرر کیا کہ ساتوں گرجوں کی زیارت کریں۔

اسی ۱۵۱۰ء میں فرانس میں ایک واقعہ پیش آیا جو کسی قدر اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام مقدس پاپائی کے اقتدار کی نسبت یہ کہنا بہت بعید از حقیقت ہے کہ اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ پوپ دوسرے یولیوس نے ان تمام فرانسیسی جنرلوں کو جات باہر قرار دیا جو اٹلی سے جنگ کر رہے تھے۔ اس پر تمام پادری شہر طور واقع فرانس میں اکھٹے کیے گئے اور بارھویں لوئی کے حکم سے ان سے متعدد سوالات کیے گئے۔ چند جواب بڑے زور دار ہیں۔ چنانچہ یہ کہا گیا کہ "پوپ کو جہاں تک ضمیر کے احکام کا تعلق ہے، اس کا کوئی اختیار ساعت نہیں کہ جنگ کا اعلان کرے، کیونکہ نہ تو مذہب کا کوئی معاملہ درپیش ہے اور نہ کلیسا کے اقتدار کا۔ جو حکمران پوپ سے جنگ کر رہا ہو، اسے اس کا حق ہے کہ حملے کی مدافعت ہتیاروں سے کرے لیکن کلیسا کے جاگیری ممالک کو فتح کرنے کے بعد وہ ان کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتا۔ ہر عیسائی حکمران کو اس کا پورا حق ہے کہ کسی دوسرے عیسائی حکمران کی اس صورت میں حمایت کرے جب وہ پوپ سے کسی منصفانہ وجہ سے لڑ رہا ہو۔ اور آخر میں یہ کہ جات باہر کرنے کا جو حکم جنگ کی حالت میں دیا جائے، اور اس کے سلسلے میں کوئی رسم وضابطہ ملحوظ نہ رکھا گیا ہو، تو وہ کالعدم ہے۔

188

باب یازدہم

جنگ

قرون متوسط میں جنگ ایک ناقابل بیان بے رحمی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ فریقین جنگ میں سے ہر ایک اس کی کوشش کرتا تھا کہ دوسرے کو جتنا زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہو وہ پہنچائے۔ اور مخاصمانہ کارروائیوں کا بنیادی مقصد یہ ہوتا تھا کہ دشمن کا نام ونشان مٹا دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بربریت کے ایسے ایسے کام کیے گئے، جن کی نظیر کبھی سننے میں نہیں آئی۔ اسی لیے زہریں بجھے ہوئے ہتھیار استعمال کیے جاتے تھے، اور اسی لیے قیدیوں کے ناک کان کاٹ کر مثلہ کیا جاتا تھا، تباہی و بربادی پھیلائی جاتی تھی، آگ لگادی جاتی تھی، اور شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی تھی۔ اور اسی کے باعث غداری اور بے ایمانی کو کام میں لایا جاتا تھا۔ جن جن بے رحمیوں کا ارتکاب ہوا تھا، ان کی ایک مکمل جدول پیش کرنی ممکن نہیں ہے۔ اس زمانے میں

لکھی ہوئی تالیفوں کے کھولنے سے بآسانی یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ صورت حال حقیقت میں کتنی زیادہ تاریک اور ہولناک تھی۔ اخلاق آموز شاعر، ماہرین قانون، مدبر اور سپاہی سچے شاہد سمجھے جاسکتے ہیں اور اس وقت وہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے نظر آتے ہیں۔

رہزنوں کی طرز زندگی کے خلاف اوس تاش دے شاں نے ایک نظم میں لکھا ہے کہ:-

کیونکہ لوگ اس طرح قاتل بن جاتے ہیں۔
ڈاکو بھی۔ زبردستی سے چھین لینا:
اجازت (؟) سے۔ خانقاہوں کی بے حرمتی کرنے والے۔
عورتوں کی عصمت دری کرنا، بد معاشی سے شدت دکھانا۔
اور اپنے ہمسایوں کو شرارت سے دغا دینا۔
ان کی چیزیں چھین لینا، ان کو تکلیف دینا
بغیر اس کے کہ ذرا بھی اس کا باعث پایا جائے۔

189 پانچواں ہنری جو انگلستان کا بادشاہ تھا، کہا کرتا تھا کہ جنگ کے تین وفادار نوکر ہیں: آگ، خون اور قحط۔ ان تینوں میں جو سب سے نرم خو ہے میں نے اس کا انتخاب کیا ہے" یعنی قحط۔ بالدے نے لاطینی میں لکھا تھا کہ: "دشمن کو ہر کہیں اچھی طرح قتل کیا جاسکتا ہے" سے زار نوتر دام ان ہولناک زیادتیوں کا ذکر کرتا ہے جن کا صوبۂ پروفانس میں ارتکاب عمل میں آیا تھا۔ اور برائیوں کا شمار کراتے ہوئے کہتا ہے کہ: "انسانی خون کا عظیم مقدار میں بہایا جانا، غیر محدود تعداد میں شہروں کا جلایا جانا، قلعوں کا توڑا جانا، مزید برآں محلوں اور گڑھیوں کا بیخ و بن سے اکھاڑا جانا، گرجوں کی بے حرمتی اور ان کا تباہ کیا جانا، گرجوں کی قربان گاہوں کا تہتک کرنا، مقدس مقاموں کو غلیظ کرنا، مقدس چیزوں پر چوری اور ڈاکہ ڈالنا، عورتوں بیواؤں اور

راہبات کی عصمت دری کرنا، خونین اور شیطانی انتقام لینا، بے رحمی کے ساتھ اپنے کو بے تعلق کرلینا، ہولناک طور سے جان کالینا، معمولی طور سے قتل کرنا اور ہزاروں دیگر برائیاں جو ہولناک بھی تھیں اور جن کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا"۔ سپاہیوں کے متعلق کرسٹین ڈیپزان کہتی ہے کہ: "جب وہ شہروں میں داخل ہوتے ہیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ گویا وہ فاقہ زدہ ہیں۔ اور عیسائیوں کے متعلق وہ جن ہولناک قتل و خون کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، ان میں رحم نام کو نہیں ہوتا۔ وہ عورتوں کی بے حرمتی کرتے ہیں اور ہر چیز کو تباہ و تاراج کردیتے ہیں"۔ ژاں ڈوتوں ناجی مورخ روایت کرتا ہے کہ: "وہاں کے تمام سپاہی تلوار کی چیر پھاڑ کے لیے ڈالدیے گئے"۔ اور وہ مورخ اس چیز کے متعلق یہ توجیہ کرتا ہے کہ: "حملہ کر کے قبضہ کرنے کے سلسلے میں جو رواج پایا جاتا تھا، اسی کے مطابق سپاہیوں سے برتاؤ کیا گیا"[1]۔

ایک فرانسسی کتاب پائی جاتی ہے جس کا نام "ایک نوجوان شہزادے کی تعلیم" ہے۔ اس کا مولف وہ ذمہ داری یاد دلاتا ہے جو جنگ کی بے شمار برائیوں کے باعث پیدا ہوتی ہے، اور کہتا ہے کہ "افسوس اے میرے بادشاہ اور آقا! ہمیں یہ سمجھ رکھنا چاہیے کہ ہتھیاروں اور فیصلے اور تلوار کے زور سے، جس کا ہمیشہ حق پر ہونا ضروری نہیں، بادشاہ یا حکمران بہادری اور کردار کے ذریعے سے اپنے دشمنوں پر غالب آسکتا ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب سب کچھ جا اور گزر چکا ہو اور جلایا اور ہلاک اور قتل کیا جا چکا ہو۔ لیکن ایک دن وہ آنے والا ہے جب ایسے شخص کو ہمارے

[1] مو ولا کلا فیئیر کی فرانسسی تالیف "ماکیاؤلی کے زمانے کی سفارتکاری" جلد (۱) ص ۲۰۴۔

آقا خداوند تعالیٰ کے حضور ہیں، جو سب کچھ جانتا اور آگاہی رکھتا ہے ان تمام عظیم الشان بے رحمیوں کا جواب دینا ہوگا کہ اتنے کچھ شہامت باز، سوار، معزز جاگیردار، اہل کلیسا، غریب کسان اور دیگر لوگ مارے پڑے۔ یہ کہ ان بے رحمانہ جنگوں کے موقع پر یہ لوگ رقت آور طور پر قتل کر دیے گئے، عورتوں کی عصمت دری کی گئی، ننھے بچوں کو بھوک سے جان دینی پڑی، گرجے اور قلعے ڈھا دیے گئے، جلا اور تباہ کر دیے گئے، اور لوگوں سے کچھ اتنے طور سے استحصال بالجبر ہوتا رہا کہ انسان کی زبان مشکل سے اس کا احاطہ کر سکتی ہے۔ بیشک اس بات کا جان لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ وہی شخص اچھی طرح جوابدہی کر سکتا ہے جس نے احکام خداوندی کو اچھی طور سے ملحوظ رکھا ہو[1]۔

190

دشمن کی تباہ کاریاں خود ملک کی مدافعت کرنے والی فوجوں کی تباہ کاریوں سے زیادہ ہولناک نہیں ہوتی تھیں کیونکہ ان کی لوٹ مار عام ہوتی تھی۔ جو صلحیں ہوتی تھیں، ان سے اس ہولناکی میں اور اضافہ ہو جاتا تھا کیونکہ ان سے فوجوں میں بھرتی ہونے والے کرائے کے ٹٹوؤں کو ایک عارضی چھٹی مل جاتی اور وہ بدقسمت آبادیوں پر ٹوٹ پڑتے اور خود اپنے طور پر اسی جنگ کو جاری رکھتے جو اس سے پہلے ان کو بھرتی کرنے والے سرداروں کے لیے شروع کی گئی تھی[2]۔

شہر لی آیژ کا ایک پادری، آہل گار جو ساتویں شارل اور گیارھویں لوئی کا ہمعصر تھا اور جو ان بادشاہوں میں سے اول الذکر کو شخصی طور سے

---

[1]۔ فرانسیسی تالیف "ایک نوجوان شہزادے کی تعلیم" باب (۶) مخطوطہ کتب خانۂ شاہی بروسیل ۱۰۹۷۶۔

[2]۔ ڈ بنیٹن کی انگریزی تالیف "انگلستان پندرھویں صدی میں" ص ۷۹۔

جاتا تھا، وہ بیان کرتا ہے کہ نارمنڈی کو آزاد کرانے کے لیے جو جنگیں ہوئیں ان میں فرانس کے بادشاہ کے طرفدار بھی اتنی ہی بے رحمیاں اور لوٹ مار کرتے رہے جتنی خود انگریزی فوجیں۔ یہ پادری یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ساتویں شارل کے ماتحت سپاہی اس بات کو بڑے افسوس کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ نارمنڈی کے شہر اور قلعے اپنی رضامندی سے بادشاہ کے حلقہ بگوش ہوجائیں کیونکہ اس رضاکارانہ اطاعت سے ان سپاہیوں کو پیسہ کمانے کی توقع اور ذریعے سے محروم ہوجانا پڑتا تھا۔ اور ان کی تجویز یہ ہوتی تھی کہ جب ان علاقوں کو وہ جنگ اور زور کے ذریعے سے حلقہ بگوش بنائیں تو ان پر فاتحانہ قبضہ کریں اور ان کو اچھی طرح لوٹیں۔[1]

تال بو نے جو الفاظ کہے ہیں وہ اپنی نوعیت کے خاص ہیں یعنی "اگر خدا بھی سپاہی ہوتا تو [نعوذ باللہ] ایک لٹیرا ہوتا"

یہ گمان ہوگا کہ عیسائی احساس اور شہامت بازی کی روح کے باعث مخاصمانہ تعلقات میں ایک حد تک نرمی پیدا ہو۔ لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قسم کی زیادتیوں کا منہ کھول دیا گیا تھا اور اکثر اوقات تو جنگ کرنے میں اتنی زیادہ سختی روا رکھی جاتی جتنی خود رومی شہنشاہت کے زمانے میں بھی نہیں ہوتی تھی۔

شہامت بازی میں دوگونہ عنصر پایا جاتا ہے: ایک عنصر تو اس انفرادیت کی روح کا نتیجہ تھا جو جرمن نسل کی خصوصیت ہے۔

[1] فرانسیسی تالیف در کتب خانۂ شاہی سے لیے ہوئے نوٹ اور اقتباسات، مخطوطات ۱۲۲ و ۵ تا ۶۳ کے متعلق نوٹ جن میں کہ ساتویں شارل اور گیارھویں لوئی کے دور حکومت کی تاریخ ہے" مولفہ آرل گار پادری شہرلی آیڈ جلد (۵) ص ۴۱۹

اور دوسرے عنصر کے لیے کلیسا کا اثر ذمہ دار تھا۔[1] لیکن اس اثر کے متعلق زیادہ مبالغہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اکثر اوقات اس کا تذکرہ بڑے شاندار اور خوشامدانہ الفاظ میں ہوتا ہے۔ تیرھویں صدی کی ایک مشہور فرانسیسی نظم ہے جس کا نام "شہامت بازی کے قواعد" ہے۔ اس میں شہامت بازوں کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ جاگیرداری عہد کے عظیم الشان عدل گستر تھے۔ چنانچہ اس نظم میں لکھا ہے کہ "شہامت بازی کا فریضہ یہ ہے کہ عورتوں بیواؤں، یتیموں اور محتاج و بیکس لوگوں کی حفاظت کرے"۔ جس نظم کا ہم نے ابھی ذکر کیا، اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شہامت باز کو اپنا خون بہانے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیئے تاکہ ؎

خدا کی خدمت اور تقدیس کی جائے
اور کلیسائے مقدس کی مدافعت کی جائے

[یہ تو نظریہ تھا]، حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ مزید برآں اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہیئے کہ اگر کہیں ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے کہ ایک حد تک اخلاق کا برتاؤ کیا گیا، یا ایسے کام کیے گئے، جو جذبات لطیف میں لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں، تو شہامت بازی کے قائم کردہ یہ قاعدے صرف مساوی طاقت والوں میں ملحوظ رہتے تھے۔ شہامت بازی نے آن اور ناموس کا جو ضابطہ بنایا تھا، اس کا اطلاق کمزوروں پر مطلق نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ بڑی حقیقت شناسی سے بیان کیا گیا ہے کہ شہامت بازی عملی طور سے وہی کرتی تھی، جو جاگیرداری نظام بطور استحقاق کرتا تھا۔ اور اس کے باعث انسان

---

[1] لاکورن ڈسینٹ پالے کی فرانسیسی تالیف "شہامت بازی کے متعلق یادداشتیں" —— ملز کی انگریزی تالیف "شہامت بازی کی تاریخ" —— ڈے کلوز کی فرانسیسی تالیف "شہامت بازی کے متعلق"۔

اور شہری کے واجبات کی جگہ شخصی فرائض لے لیتے ہیں۔ اور جوں ہی کسی جاگیردار یا کسی شہامت باز کے سوا کسی اور شخص کا معاملہ ہو تو اس بڑے فخر سے پیش کی جانے والی وسعت قلبی کی جگہ جذبات بے رحمی براجنے لگتے۔

ایک اور نکتہ نمایاں کیے جانے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ شہامت باز، اُن اقراروں کی وفاداری کے ساتھ تعمیل کرتا جن کی اکثر مذہبی مراسم کے ساتھ توثیق ہوتی تھی۔ قدیم رومیوں کے ہاں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ بات کا پاس کیا جائے۔ "در جھیل کے لانس لاٹ" نامی قصے میں بادشاہ آرتھر نے ایک شہامت باز سے اس بات کا وعدہ کرلیا تھا کہ اسے اپنی بیوی یعنی ملکہ کو لیجا لینے دے گا۔ اب بادشاہ نہ تو اس بیچاری کی التجاؤں پر کان دھرتا ہے اور نہ ہی اوروں کی توجہ دہانی کو کچھ سنتا ہے۔ اور اسے صرف ایک رٹ لگی ہوئی ہوتی ہے کہ میں نے اس سے اس کا وعدہ کرلیا تھا۔ اس پر لیونل نے، جس نے بادشاہ کو اس تجویز سے ہٹانا چاہا تھا، یوں مخاطب کیا کہ "تو پھر بادشاہ اوروں سے بھی بڑھ کر بیگار و غلام ہے اور جو بادشاہ ہونا چاہے تو اسے شرمانا چاہیے"۔ شہامت بازی کا واسطہ دے کر جو وعدہ کرلیا جاتا، اس کو سب سے زیادہ اہمیت ہوتی تھی۔ ژاں دبر تانیں نے جب چھٹے شارل سے صلح کی، تو معاہدے کی پابندی کی قسم ان الفاظ میں کھائی کہ: "اپنے جسم اور ایک سچے شہامت باز کی قسم کھا کر"۔ پندرھویں صدی عیسوی میں جب "ایک نوجوان شہزادے کی تعلیم" نامی کتاب لکھی گئی تو اس کے مولف نے زمانۂ ماضی کے متعلق ان الفاظ میں افسوس ظاہر کیا ہے کہ: "اس سلسلے میں قدیم زمانوں میں یہ نظر آتا ہے کہ شہنشاہ، بادشاہ اور بڑے سردار کسی ضمانت کے لیے سوائے حکمران کی زبان کے کسی اور طور سے اپنے کو پابند نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ

اس زمانے میں ان کی زبان اور ان کی تحریر کچھ اتنی زیادہ قابل پابندی ہوتی اور ملحوظ رکھی جاتی کہ اس کے متعلق کوئی کوتاہی عمل میں نہیں لائی جاتی تھی"[1]۔ وقت بوقت اس کی کوششیں عمل میں لائی جاتی رہیں کہ جنگ کی بے رحمیوں کو کم کیا جائے۔ چنانچہ تیرھویں صدی میں ان ہتیاروں کا استعمال ممنوع قرار دیا جاتا ہے جو ضرورت سے زیادہ مہلک خیال کیے جاتے تھے۔ پوپ تیسرے انوسنٹ نے ایک حکمنامے کے ذریعے سے اس کی ممانعت صادر کی کہ عیسائی باہم ایسے تیروں کا استعمال کریں جو دور سے آلگتے ہیں اور نہ ان پھینکی جانے والی چیزوں کو جن کے لیے کلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس لاطینی حکمنامے کے الفاظ یہ تھے: مزید برآں حریف عیسائی اور کیتھولک فوجوں کے خلاف مہلک اور نفرت انگیز منجنیق سے پتھر پھینکنے کی ہم ممانعت کرتے ہیں۔ اس کی خلاف ورزی کی صورت میں بطور سزاجات باہر کردیا جائے گا"[2]

عیسائی قیدیوں کو غلام بنا سکنا اصول کی حد تک ممنوع قرار دیدیا گیا۔ کلیسا نے اس کی کوشش کی کہ خاصمانہ کارروائیوں میں ان اشخاص کو محفوظ قرار دیدے جو خانگی جنگوں میں محفوظ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ کلیسا نے اس کی کوشش کی کہ بڑی جنگوں میں بھی ان عارضی "حرام دِنوں" کا طریقہ رائج کرے جن کے خانگی جھگڑوں کے سلسلے میں عائد کرنے کی کلیسا نے کوشش کی تھی۔ لیکن یہ تمام ایسی کوششیں ہیں جو نقار خانے میں طوطی کی آواز

---

[1] ۔ فرانسیسی تالیف "ایک نوجوان شہزادے کی تعلیم" باب دوم مخطوطہ کتب خانۂ شاہی بروسیل ع۱۰۹۷۲۔

[2] ۔ لاطینی تالیف "نویں گریگری کے احکام" کتاب (۵) عنوان (۱۵) باب "تیر اندازاں"

کی معداق نہیں۔ البتہ ان سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ برائی نے کتنی نہ گہری جڑ پکڑلی تھی۔ جہاں تک کلیسا کے منشاء کا تعلق تھا، اس اصول کا اطلاق صرف کیتھولکوں پر ہونا چاہیے تھا لیکن عمل کی حد تک یہ سب ہی جگہ نظر انداز رہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پوپ تیسرے انوسنٹ نے ایک قانون نافذ کیا تھا، اور بتایا تھا کہ کونسی جنگ ناجائز ہے؟ اس سے متعلق شارحین نے اور بھی تنگی پیدا کردی۔ چنانچہ پاں آفورت کے رہبوں نے بھی یہ رائے قبول کرلی تھی اور ماہرین کی اکثریت نے بھی اس کو قبول کرلیا تھا کہ جائز جنگ کی صورت میں منجنیق کا استعمال کیا جاسکتا ہے اور تیر کمان کا بھی۔ کیونکہ راہب گراتیان کی تالیف "پوپوں کے احکام کا مجموعہ" میں اس بات کی اجازت ہے کہ دشمن سے لڑنے میں ہر طریقہ استعمال کیا جاسکتا ہے؛ اور اس کے لیے خود کمین بچھائے جاسکتے ہیں۔ منالڈ کے چوٹی کے مسائل" نامی کتاب نے بھی وہی رائے دی جو شارحین نے دی تھی۔ اور اس نے تیر اندازوں اور منجنیق چلانے والوں کو اس کی اجازت دی کہ عیسائیوں کے خلاف ناجائز جنگ میں اپنی مہارت کا استعمال کریں لیکن ژاں داندریا نے یہ رائے ظاہر کی کہ لوگ منجنیقوں کا استعمال بھلا نہ کہیں، اگرچہ اس نے یہ تسلیم کرلیا کہ گڑھیوں اور جہازوں کی مدافعت کے لیے ان کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔

جنگوں کے زمانے میں جو عارضی صلح ہوا کرتی تھی، وہ یا تو قانون مذہبی کے تحت ہوتی تھی (جسے شرعی صلح بھی کہا جاتا تھا) یا فریقین آپس میں طے کرکے مقرر کرتے تھے (جسے معاہداتی صلح کا نام دیا جاتا تھا)۔ لیکن شرعی صلح کا کبھی بھی احترام نہیں کیا گیا۔ خود اکوئیناس کے ٹامس نے یہ رائے دی تھی کہ اگر ضرورت ہو تو

مذہبی عیدوں کے موقع پر بھی جنگ کی جا سکتی ہے۔ اس کے ڈھائی صدی بعد بلی نے پوپ دوسرے یولیوس کی نظیر کا حوالہ دے کر یہ نتیجہ ایک حد تک افسوس کے ساتھ اخذ کیا کہ جن دنوں کو کلیسا نے مقدس قرار دیا ہے، ان میں عمل میں لائی جانے والی جنگی کارروائیاں جائز سمجھی جائیں گی۔[1]

کلیساؤں کی مجلس شورائے مذہبی نے اشخاص سے برتاؤ کے متعلق جو احکام دیے تھے، ان کے متعلق قانون مذہبی کے بہترین ماہروں نے جن میں نکولاس دے تودس کس سر فہرست ہیں ہے، یہ رائے ظاہر کی ہے کہ رواج مخالفانہ کے باعث وہ منسوخ ہو چکے ہیں۔ گویا اب پادری، راہب، خانقاہوں کے ملازم، زائر، تاجر اور کسان جنگ کی دراز دستیوں سے محفوظ نہ رہے۔ بالتازار دے آیالا نے پادریوں کی حد تک ایک استثنا ضرور کیا: بجز اس کے کہ خود پادری بھی مخاصمانہ کارروائیوں میں دخل ہی کریں۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے موضوع پر لکھنے والے مولف اپنے زمانے کے معیار سے بلند تر رہے ہیں۔ چنانچہ انسانیت اور عفو و درگذر کے جذبات ان میں بھرے ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مولف، جو رومی قانون کے نظریوں سے رچے ہوئے تھے، خاصے سخت احکام بیان کرتے تھے۔ لیکن زیادہ کثیر مولف علانیہ طور سے ان ظالمانہ برتاؤوں کو ملعون ٹھیراتے تھے جو ان کے زمانے کی جنگوں میں ملحوظ رکھے جاتے تھے ایک چیز قابل ذکر ہے۔ گروتیوس کے پیشرؤوں میں ——

[1] اکویناس کے سینٹ ٹامس کی لاطینی کتاب "دینیات کے چوٹی کے مسائل" حصہ دوم، مسئلہ (۴۰): جنگ، عنوان (۴): کیا ایام تقریبات میں جنگ کرنی جائز ہے۔" —— بلی کی لاطینی کتاب "فوجی امور اور جنگ کے متعلق رسالہ"، حصہ دوم۔

کسی مولف کے ہاں بھی اتنے ظالمانہ اور بے رحمانہ صفات نظر نہیں آتے
جتنے بنکر شوئک نے لکھ مارے تھے۔

قرون متوسطہ میں فریقین جنگ میں ہر قسم کے روابط و تعلقات
منقطع ہو جاتے تھے۔ قانون روما کا یہ اصول ہے کہ مخاصمانہ کارروائیوں
کے شروع ہوتے ہی دشمن اشخاص اور دشمن جائداد گرفتار کیے جاسکتے ہیں۔
اس سلسلے میں خانگی اور سرکاری جائداد میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔
دوران مخاصمت میں حربیوں کی رعایا میں ہر قسم کا تجارتی کاروبار
ممنوع ہوتا ہے۔ دشمن سے متعلق ہونے والی ہر چیز دشمن سمجھی جاسکتی
اور مقاتلوں کے رحم و کرم پر رہتی۔ اعلان جنگ حسب ذیل الفاظ
میں کیا جاتا جیسا کہ فرانسوا اول کے ایک اعلان میں جو شارل کیں
کے خلاف تھا، ہمیں نظر آتا ہے کہ: "یہ ہم معلوم کراتے ہیں کہ
ہم نے شہنشاہ مذکور اور اس کے ساتھیوں اور طرفداروں نیز ان
کے جملہ موروثی ممالک کی رعایا کو ہمارا اور ہمارے شاہی علاقوں اور
جاگیرداریوں اور رعایا کا دشمن قرار دیدیا ہے۔ اور اسی باعث ہم
اپنی تمام رعایا کو اجازت دیتے اور مجاز گردانتے ہیں کہ مذکورہ بالا
لوگوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے سمندر اور خشکی میں ہتیار
استعمال کریں۔"

ان سختیوں میں نرمیاں پیدا ہوئے بغیر نہ رہیں۔ ترقی خاصکر
اس معاملے میں عمل میں آئی کہ دشمن کی جو رعایا اعلان جنگ کے
وقت فریق ثانی کی سرزمین میں ہو۔

انگلستان کے ۱۲۱۵ء کے منشور اعظم میں بھی بعض انسانیت پرور
احکام درج تھے۔ چنانچہ دفعہ (۴۱) میں بیان ہوا تھا کہ تمام
تجارت پیشہ لوگوں کو اجازت ہوگی کہ انگلستان سے جائیں، وہاں
آئیں رہیں، خشکی یا تری میں سفر کریں تاکہ کاروبار تجارت انجام دیں
ان پر کوئی غیر معقول محصول عائد نہیں کیے جائیں گے بلکہ قدیم رواجات ہی

194

کے مطابق چنگی وصول کی جائے گی۔ دورانِ جنگ کے لیے اُن لوگوں کی حد تک اِستثناء کیا جاتا ہے جن کے ملک سے جنگ ہورہی ہو۔ اگر اُن کے حکمران اور [انگلستان کے] بادشاہ میں جنگ چھڑ جائے تو اُن کو گرفتار کرلیا جائے گا اور ان کی جائداد قرق کرلی جائے گی، لیکن انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، تاآنکہ یہ نہ معلوم ہوجائے کہ دشمن بادشاہ نے انگریز تاجروں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے۔

بلاکس ٹن کہتا ہے کہ "منشورِ اعظم کا یہ حکم تمام شمالی قوموں کے لیے ایک منصفانہ قاعدہ ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اِشٹیرن ہوک نے بیان کیا ہے گاتھیوں اور سویڈن کے لوگوں نے بھی یہی قاعدہ اختیار کرلیا ہے۔ لیکن یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ انگلستان کے ماگنا کارٹا (منشورِ اعظم) میں، جو بادشاہ اور اس کے علاقے میں پیدا شدہ رعایا کے مابین ایک خالص اندرونی انتظام پر مشتمل ہے، اس کا ذکر عمل میں آیا ہے۔ اسی باعث منٹوں تس کیو نے تعریف و توصیف کے الفاظ میں لکھا ہے کہ "اجنبی تاجروں کی حفاظت کرنا انگریزوں نے اپنے قومی قانون کا ایک جزو بنا لیا ہے۔[1] اور بہ تمام دنیا میں یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ بہتر طور پر یہ معلوم کرلیا ہے کہ ان تینوں بنیادی چیزوں یعنی مذہب، تجارت اور آزادی کو بیک وقت کس طرح برقرار رکھا جائے۔

---

[1] جو اس سے صدیوں پہلے سے اسلامی قانون میں عہد نبویؐ سے نظر آتا ہے۔ چنانچہ امام محمد شیبانی لکھتے ہیں کہ "یہ ایک اصولی قاعدہ ہے کہ غیر ملکی مستامنوں کی ہمارے علاقے کے دوران قیام میں حفاظت کرنا اور ان کے ساتھ انصاف کرنا اسلامی حکمران کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح خود ذمیوں (غیر مسلم رعایائے اسلام) کے ساتھ۔" دیکھیے شرح سیر کبیر، جلد (۴)، ص ۱۰۸۔ (مترجم)۔

یہ قابلِ ذکر ہے کہ انگلستان کی تجارت یکے بعد دیگرے تین مرحلوں سے گزر چکی ہے۔ بارھویں صدی میں وہ ایک بلدیاتی چیز تھی۔ پہلے ایڈورڈ کے زمانے میں وہ قومی چیز بن گئی اور تیسرے ایڈورڈ کے زمانے میں وہ بین الاقوامی چیز ہوگئی۔ پہلے دور میں شہر نارِج کا تاجر لندن میں ویسا ہی اجنبی سمجھا جاتا تھا جیسا شہر بروجس (واقع بلجیم) کا۔ پھر ان مقامی اداروں نے ایک قومی نظامِ معاشیات کے لیے جگہ خالی کر دی، اور گاؤں یا شہر سے اس کا دائرہ پھیل کر پورے ملک کو گھیر لیتا ہے۔ ایک سرکاری اور ہر جگہ یکساں، محصولِ چنگی پورے ملک کے لیے ایڈورڈ اول کے زمانے میں قائم کر دیا جاتا ہے۔ اور آخر میں تیسرے ایڈورڈ کے زمانے میں بین الاقوامی بنا دینے کی کارروائی عمل میں آجاتی ہے۔

195

انگلستان میں "اہم پیداواروں کا نظام" پیشہ ورانہ تنظیموں کے اصول پر قائم کیا گیا تھا۔ اس کے باعث تاجروں کو درآمد و برآمد کا اجارہ حاصل ہوگیا تھا۔ اہم پیداواروں سے مراد اُون، کھالیں، چمڑا، ٹن، اور سیسہ تھے۔ براعظم یورپ میں ایک شہر دساور کے مرکز کے طور پر انتخاب کیا جاتا تھا۔ عرصے تک بروجس کو یہ حیثیت حاصل رہی پھر (فرانس کے) شہر کالے کا اس غرض کے لیے انتخاب ہوا۔ ۱۳۵۳ء میں تیسرے ایڈورڈ نے "اہم پیداواروں کا قانون" نافذ کیا۔ اس میں اس کی کوشش کی گئی تھی کہ خریداروں کے لیے انگلستان میں کشش پیدا کی جائے۔ چنانچہ مختلف شہروں کو دساور کے مرکز کے طور پر قائم کیا گیا اور کالے کی مرکزیت کو برخاست کر دیا گیا لیکن جلدی ہی دوبارہ وہاں پھر مرکز قائم کر دینا پڑا۔

دساور کے ہر مرکز کی تنظیم اسی اصول پر ہوتی تھی جس اصول پر

ے۔ کننگ ہام کی انگریزی کتاب "قرونِ متوسطہ میں انگریزی صنعت اور تجارت کی ترقی" جلد (۱) ص (۳۰۷) و مابعد۔

ہر ہر پیشے میں کام کرنے والوں کی ۔ ہر مرکز کا ایک میر مجلس ہوتا تھا اور چند آلڈرمن یعنی حکام عدالت اور چند کوتوالی کے جوان۔ دساور کا یہ مرکز مقامی اختیار سماعت سے باہر ہوتا تھا ۔ اجنبی تاجروں کے ساتھ رعایتیں برتی جاتیں اور جہاں تک مواخذوں اور انتقاموں کا تعلق تھا "اہم پیداواروں کا قانون" حکم دیتا تھا کہ ان کے حکمران اور انگلستان کے بادشاہ میں جنگ چھڑ جائے تو ان کو چالیس دن کی مہلت اس غرض کے لیے دی جائے گی کہ اپنا اسباب لے کر انگلستان سے چلے جائیں ۔ اور اگر یہ مہلت کافی نہ ہو تو مزید چالیس دن بلکہ اس سے زیادہ کی مہلت دی جا سکے گی ۔ بادشاہ جو نظام قائم کرنا چاہتا تھا وہ بہر حال ۱۳۵۷ء میں ترک کر دینا پڑا۔

شمال مغربی جرمنی کے شہروں میں جو وفاق (ہانزے) قائم ہوا تھا اس کے تحت اسے اکثر ممالک میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی تھی ۔ چنانچہ ان حلیف شہروں کے تاجروں کو چالیس دن سے ایک سال تک کی مہلت دی جاتی کہ اپنی کنسٹیتول میں واپس ہو جائیں ۔ بعض ممالک میں تو اس "ہانز یاتی وفاق" سے بہت زیادہ قابل لحاظ نتیجہ برآمد ہو گیا تھا ۔ اور وہ یہ کہ "ہانز یاتی" تاجروں کو کسی صورت میں بھی ستایا نہ جائے گا' اور وہ اپنے تجارتی کاروبار کو جاری رکھ سکتے ہیں۔[1]

فرانس میں بہت دنوں تک ایک تنگ نظرانہ سیاست کارفرما رہی ۔ سین لوئی کے دور حکومت میں ان انگریز تاجروں کو جو فرانسیسی سلطنت میں سکونت پذیر تھے' گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس پر انگلستان کے بادشاہ نے بھی جواب میں فرانسیسی رعایا کے متعلق

---

[1] پوتہ کی جرمن کتاب "قانون بین الممالک کی تاریخ اور علم پر اضافے" ص ۱۵۱۔

196

سخت کارروائیاں اختیار کیں۔ پچھتر سال بعد چوتھے شارل کے زمانے میں ایک مرتبہ یہ افواہ اڑی کہ اعلان جنگ کے موقع پر ان تمام فرانسیسیوں کا جو انگلستان میں رہتے تھے، قتل عام کردیا گیا۔ اس پر فرانس کے بادشاہ نے تمام انگریزوں کو گرفتار اور ان کی جایداد کو ضبط کرلیا۔ یہ افواہ غلط ثابت ہوئی اسی لیے بادشاہ شارل نے حکم دیا کہ قیدیوں کو تو رہا کردیا جائے مگر ان کی جایداد روک ہی رکھی گئی۔ "خوبصورت فلپ" کے زمانے میں اسی قسم کے واقعات دوبارہ پیش آتے ہیں۔ بہرحال پندرھویں صدی کیسے ایک مکمل انقلاب پیدا ہوجاتا ہے چنانچہ ۱۴۸۳ء میں "ہانزیاتی" وفاق اور گیارھویں لوئی کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا، اس کے مطابق "ہانزیاتی" شہروں کے باشندے اس حق سے مستفید ہونے لگے کہ، وہ جنگ چھڑنے کے ایک سال بعد تک فرانس میں رہ سکتے ہیں سولھویں صدی میں جو معاہدے ہوئے ان میں اس طرح کی دفعہ کا عام رواج ہوگیا۔ اور یہ مہلت مختلف جگہ مختلف تھی۔ اور تین مہینوں سے دو سال تک ہوتی تھی۔ ۱۷۱۳ء میں جو معاہدے اوترخت میں ہوئے، ان میں بھی یہی چیز پائی جاتی ہے۔ جہاں تک ایسی چارہ جوئیوں، قرضوں اور دیگر غیر مادی قسم کے حقوق کا تعلق ہے، جو دشمن کی رعایا کو کسی حکمران سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے متعلق حاصل ہوں، ان کے متعلق ایک دلچسپ سوال پیدا ہوگیا۔ وہ یہ کہ آیا ان حقوق کو بھی ضبط کیا جاسکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں یہ ایک مستقل قاعدہ بن چکا تھا[1]۔ چنانچہ پاپوان نے ایک حکمنامے کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم

---

[1]۔ سر رابرٹ فلی مور کی انگریزی کتاب "قانون بین الممالک کی تشریحیں" جلد (۳) ص ۱۳۳۔

ہوتا ہے کہ فرانس میں کیا خیال تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ پاپوں لکھتا ہے کہ "ایک فلانڈری شخص کسی فرانسیسی کو ایک ہزار ایکو (چاندی کا سکہ جو تین لیرا یا فرانک کے مساوی تھا) قرض دیتا ہے۔ ادائی کا وقت آجاتا ہے اور فلانڈری، عدالت میں، اپنا مقدمہ دائر کر دیتا ہے۔ فرانسیسی ادائی میں کچھ اس طرح دیری کرتا جاتا ہے کہ اس کے باعث اس فلانڈری کا مقدمہ طول پکڑتا ہے اور اسی اثناء میں دونوں قوموں کے حکمرانوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ یہ رقم قرق کر کے خزانۂ شاہی میں جمع کر دی جاتی ہے۔ جس کے بعد صلح ہو جاتی ہے۔ فلانڈری اپنے مدیون کے خلاف دوبارہ چارہ جوئی کرتا ہے۔ وہ جوابدہی میں یہ عذر کرتا ہے کہ رقم وہ ادا کر چکا تھا، جو ضبط کر لی گئی۔ ماہ اگست ۱۳۴۹ء کے حکمنامہ پاریس کی رو سے فلانڈری کا دعویٰ خارج کر دیا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی فرانسیسی کے متعلق یہ حکم نافذ رہا کہ جو رقم اس کو حاصل ہوئی اور اس کے پاس رہی تھی اس کی وہ ادائی کرے۔"[1] پندرھویں صدی کے اواخر میں پیزا اور فلارنس میں جنگ چھڑی۔ پیزا نے اپنے ان افراد رعایا کو جو فلارنس کے باشندوں کے مقروض تھے، اس بات پر مجبور کیا کہ پیزا کے خزانے میں اپنے قرض کی رقم داخل کر دیں۔ صلح ہونے کے بعد فلارنس کے ایک دائن نے اپنے قرض کی ادائی کے لیے نالش دائر کی۔ اس جھگڑے میں فلپ دے دِک سینو کو حکم بنایا گیا۔ اس نے یہ قرار دیا کہ جو ادائی عمل میں آئی تھی، وہ درست تھی۔ بے شبہہ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ مدیون نے جبر اور دباؤ کے تحت وہ کام کیا تھا۔[2]

---

[1] پاپوں کی فرانسیسی تالیف "فرانس کے دربارہائے شاہی کے قابل ذکر احکام کا مجموعہ" جلد (۵) عنوان (۵) حکمنامہ (۲)۔

[2] سر رابرٹ فلی مور کی انگریزی کتاب "قانون بین الممالک کی تشریحیں" جلد (۳) ص ۲۰۵۔

197

جنگ کا ہدف سب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ بلّی نے اس سے نہ تو عورتوں کو مستثنےٰ کیا ہے اور نہ بچوں کو۔ وہ صرف خانگی جنگ اور خدائی صلح کے متعلق قانون مذہبی میں جو احکام تھے، ان پر زور دیتا ہے۔ اور وہ متعدد ماہرین قانون کی رائے نقل کرتا ہے، جو مجالس شورائے مذہبی اور پوپوں کی طرف سے مقرر کی ہوئی امن آرائیوں سے متفق ہیں۔ اور انھیں کی طرح وہ خود بھی تسلیم کرتا ہے کہ جنگ دشمن کی رعایا اور ماتحتوں اور حلیفوں سب کے خلاف عمل میں آتی ہے، بشرطیکہ یہ لوگ دشمن کا اپنی جان ومال سے ہاتھ بٹائیں۔ پھر بھی وہ ہچکچاتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ ملاحظہ ہوں کہ "یہ پابندی کیسے عائد کی گئی جب کہ ماتحت (رعایا) اپنے آقا کو علاً نہیں تو کم از کم عادۃً ضرورت پر اپنی امداد پیش کرتی رہی ہے۔" جنتی لیس بھی عورتوں اور بچوں کو مستثنےٰ نہیں کرتا۔ اور گروتیوس بھی یہی نظریہ بیان کرتا ہے، اگرچہ اس کی کتاب میں جنگ میں اعتدال برتنے کے لیے جو باب ہے اس میں وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس نظریے کے نتائج کی سختی کو کم کیا جائے۔

کتاب "شجرۂ حروب" کا مولف ایک دوسری زبان استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے مولف اونورے بونے[1] نے اس سوال سے بحث کی ہے کہ جنگ کیسے شروع ہوتی ہے؟ اور بیان کرتا ہے کہ "جنگ میں بہت سی برائیاں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ جنگ کی نوعیت کے باعث نہیں، بلکہ برے رواج کے باعث ہیں"۔ وہ ان برے رواجوں پر شدت سے حملہ کرتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ جنگ میں وفاشعاری اور اخلاق برتے جائیں۔ اور وہ جذبات انگیز لہجے میں

[1] اونورے بونے کی فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" حصۂ چہارم باب ۱، ۱۰۱۔

اپنے زمانے کے علدر آمد کو ملعون ٹھیراتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "لیکن ہمارا آقا خدا بہت اچھی طرح یہ دیکھتا ہے کہ سپاہی آج کل کیسی خلاف ورزیاں کر رہے ہیں۔ کیونکہ بغیر کسی رحم و کرم کے وہ قیدیوں کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ بڑی بڑی، طاقت سے زیادہ رقمیں ادا کریں۔ اور خاص کر ان غریب لوگوں سے جو اپنا روزگار کمانے کے لیے زمین جوتتے اور تاکستانوں (انگور کے باغوں) میں کام کرتے ہیں۔ اور خدا کے بعد یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی محنت کے ذریعے سے پوری دنیا کو زندگی کے سامان فراہم کرتے ہیں۔ اور حقیقت میں مجھے دل میں بڑی تکلیف ہوتی ہے جب میں یہ دیکھتا اور سنتا ہوں کہ ان بیچارے کسانوں اور دوسرے لوگوں کو جو بُرا کہنے یا بُرا سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور جو ملک کے تمام لوگوں کے لیے محنت میں لگے رہتے ہیں اور خدا کے بعد جن لوگوں ہی کی وجہ سے پوپ اور بادشاہوں اور دنیا کے بڑے بڑے سرداروں کو ان کے کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں مہیا ہوتی ہیں، — ایسے لوگوں پر کسی بھی رحم و کرم کے بغیر ظلم ڈھائے جاتے ہیں اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔"[1]

سلونے کی خانقاہ کا نیک صدر یعنی بونے پھر اس سوال کی تحقیق کرتا ہے کہ آیا "اس جنگ میں جو فرانس اور انگلستان کے بادشاہوں میں ہو رہی ہو، فرانسیسیوں کو اس کا حق ہے کہ انگریزوں کی سرزمین پر چڑھ دوڑیں اور انگریزوں کو قید کریں اور ان کا مال چھینیں؟" یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس کو حل کرنے کی اولین کوشش کا امتیاز انیسویں صدی عیسوی کو حاصل ہوا۔ اور یہ تسلیم کرانے کی کوشش عمل میں آئی کہ، ژاں ژاک روسو کے الفاظ میں، "جنگ

---

[1] ایضاً حصہ چہارم باب (۷۸)۔

آدمی اور آدمی کے تعلقات کا نام ہرگز نہیں ہے، بلکہ مملکت اور مملکت کے تعلقات کا۔ اور ان تعلقات میں عوام الناس محض ضمنی طور پر داخل ہوتے ہیں، لیکن نہ تو انسان کی حیثیت سے اور نہ ہی شہریوں کی حیثیت سے؛ بلکہ تنخواہ یاب سپاہیوں کی حیثیت سے۔ سلونے کی خانقاہ کے صدر نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ نقل کیے جانے کے قابل ہے۔ اور یہ جواب جنگ کی نوعیت کے متعلق جو صحیح تصورات ہو سکتے ہیں، ان سے پوری طرح متفق ہے۔

چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ: "کوئی شخص دوسرے کے قصور کا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ پھر کیوں بیچارے انگریزوں کو ان کے آقا کے قصور کے باعث نقصان اٹھانا چاہیے؟" اسی لیے اچھے تاجر، زمین جوتنے والے کسان، اور میدانوں میں چرانے والے چرواہے اور اسی طرح کے لوگ "جنگ سے باہر سمجھے جانے کے مستحق ہیں۔" اور بدرجۂ اولیٰ کسی شخص کی طرف اس چیز کو منسوب نہیں کرنا چاہیے جس میں وہ دخل نہیں دیتا۔ لیکن تمام دنیا اچھی طرح جانتی ہے کہ جنگوں کا فیصلہ کرنے یا حکم دینے یا اختیار کرنے میں غریب لوگوں کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ امن سے رہیں۔ لہٰذا پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ ان پر چڑھ دوڑتے ہیں؟ مزید برآں اخلاقی اور قدرتی معقولیت کی بناء پر ہر شخص کو اپنی حیثیت کے مطابق خدمت انجام دینی چاہیے۔ اور تمام دنیا اچھی طرح جانتی ہے کہ غریب لوگ نہ کھانے کو پاتے ہیں اور نہ ان کو ہتھیار چلانا آتا ہے۔ پھر یہ کیسے معقول سمجھا جاتا ہے کہ کوئی ان کو بوجھل ذمہ داریوں سے لاد دے؟... اسی طرح اس صدی کے اصول ناموس کے مطابق کونسی جنگ، کونسی بہادری اور کونسی تعریف حاصل ہوتی ہے، جب کسی ایسے شخص کو پکڑا یا قید کیا جائے جس کے پاس نہ تو ہتھیار ہوں، نہ جسے زرہ پہننی تک آتی ہو اور جو نہ پنڈلی کی حفاظتی زرہ باندھ سکتا ہو اور نہ سر کا خود؟

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کونسی آن بان اور بہادری ہے کہ ایسے غریب اور بے قصور شخص کو ماریں جو سوائے اس کے کچھ نہیں جانتا کہ اپنی بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ کسی میدان میں یا کسی مرغزار یا جھاڑی میں اپنی سوکھی روٹی کھائے؟ میں ہزار کوشش کے بعد بھی یہ معلوم کرنے سے قاصر ہوں۔" اولورے بونے کو بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس کی مخالف رائے ہی کو غلبہ حاصل ہے۔ چنانچہ اسے قبول کرتے ہوئے وہ افسوس ظاہر کرتا ہے اور مروّجہ نظریے کے نتائج کی سختیوں کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "باوجود تمام مذکورۂ بالا وجوہ کے پائے جانے کے، ہمارے اساتذہ کی رائے یہ ہے کہ اگر انگلستان کے بادشاہ کی رعایا حقیقت میں اپنے بادشاہ کی تائید اور اعانت کرتی ہے، تاکہ وہ فرانس کے بادشاہ کے مقابلے میں جنگ کر سکے، تو ایسی صورت میں فرانسیسیوں کو یہ پورا حق حاصل ہوگا کہ انگریزوں سے لڑیں، ان کے مال کو لوٹیں اور ان کے ملک کی کھانے پینے کی چیزیں چھین لیں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اگر رعایا فرانس کے بادشاہ سے لڑنے کے لیے اپنے بادشاہ کو مدد دینی نہیں چاہتی تو فرانسیسیوں کو کسی طرح یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ ان کو جان یا مال کا نقصان پہنچائیں، ورنہ وہ خدا کے روبرو جوابدہ ٹھیریں گے۔"[1]

199

پر امن لوگوں اور ان کے مال کے محفوظ و مامون ہونے کے متعلق یہی نظریہ کتاب "شجرۂ حروب" کے ہر حصے میں دہرایا گیا ہے۔ اس کا مولف جنگوں میں ان قواعد کا احترام کروانا چاہتا ہے جو خانگی جنگ اور "خدائی امن" کے متعلق مجالس شورائے مذہبی اور پوپوں کی طرف سے نافذ ہوئے ہیں۔ وہ کسانوں کے اس

---

[1] ایضاً حصۂ چہارم باب (۴۸)۔

حق و امتیاز کی حمایت کرتا ہے اور اس بارے میں بہت طویل مباحث پیش کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، وہ اس کی تمناؤں کے مطابق نہیں رہے۔ چنانچہ وہ پر جوش طور سے اس کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "خدا کرے کہ بادشاہوں کے دلوں میں یہ بات آئے کہ وہ اس بات کا حکم دیں کہ تمام جنگوں میں کسان لوگ محفوظ سمجھے جائیں"[1] اس کا یہ دلپسند نظریہ اس کی کتاب کے دلکش ترین صفحوں میں سے ایک میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ پوری کتاب اپنے مولف کے دل کی وفا شعاری اور روح کی دیانت پسندی کی آئینہ دار ہے۔

بونے ہم کو ایک بڈھے کا حال سناتا ہے۔ اسے قید کرلیا گیا ہے۔ وہ اس کے خلاف ہر قسم کی مخاصمانہ کارروائی سے باز رہنے کے لیے اس کے بڑھاپے کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ ہم یہ قصہ سنائیں گے:۔ "ایک فرانسیسی شہامت باز اپنی ٹولی کے ساتھ بورڈو جاتا ہے۔ یہاں اس شہر کا ایک باشندہ ملتا ہے، جو ایک گرجا میں جو تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا، نماز اور خطبہ سننے کے لیے آیا تھا، کیونکہ اس گرجا میں ایک بہت نیک راہب رہا کرتا تھا۔ پھر یہ باشندہ لاٹھی ٹیکتا وہاں سے آتا ہے۔ اس کی عمر سو سال کے قریب تھی۔ اس وقت شہامت باز اس سے پوچھتا ہے کہ: بھلے مانس تم کہاں سے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا: خدا بھلا کرے، میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ شہامت باز نے کہا کہ میرے رب کی قسم تم میرے قیدی ہو۔ اس نے کہا:

---

[1] ایضاً حصہ چہارم باب (۱۰۱)۔ [حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نے اسی کے سختی سے احکام دیے تھے جو قانون اسلام کا تا حال جزو ہیں۔ دیکھئے "تاریخ طبری" سلسلۂ اول ص۲۰۲۶ و ص۲۱۳۱ شرح سیر کبیر مولفہ سرخسی جلد (۴) ص۷۹ وغیرہ وغیرہ۔ (مترجم)]۔

مگر سرکار یہ کیوں؟ اس نے کہا: بات یہ ہے کہ میں فرانس کے بادشاہ سے تعلق رکھتا ہوں جو تمھارے آقا کے شہروں اور سرزمین سے برسر جنگ ہے۔ اس نے کہا: سرکار! خدا کی محبت کا واسطہ! براہ کرم مجھے بادشاہ کے سامنے لے چلو۔ اگر وہ فیصلہ کرے کہ مجھے قید کیا جاسکتا ہے تو بہتر، ورنہ میں چھوٹ جاؤں گا۔ شہامت باز نے اسے جواب دیا کہ: بہت بہتر۔ اور وہ بادشاہ کے پاس آتے ہیں۔ 200 شہامت باز نے کہا کہ اس نے کس طرح اس شہری کو گرفتار کیا تھا اور یہ کہ وہ بہ آسانی دس ہزار فرانک ادا کرسکتا ہے۔ اس پر اس نے بادشاہ سے کہا کہ: سرکار! آپ اور انگلستان کے بادشاہ باہم بڑی بڑی لڑائیاں لڑ رہے ہیں۔ اور یہ طویل عرصے تک جاری رہی ہیں۔ کیونکہ ان کا آغاز اس وقت ہوا جب میں بہت نو عمر تھا۔ اب میں بہت بوڑھا ہوچکا ہوں اور پھر بھی یہ جنگیں ختم نہیں ہوتیں۔ لیکن میں آپ سے اپنے دین کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنی تمام عمر میں کبھی فرانسیسیوں کے خلاف ہتیار نہیں اٹھائے، کبھی میرے پاس تلوار رہی، نہ چھرا، اور نہ کوئی دوسرا ہتیار۔ اگر حضور اس کی تحقیقات فرمائیں گے تو یہ صحیح ہی ثابت ہوگا۔ اس سے بڑھ کر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس لڑائی سے ذرا بھی خوشی نہیں ہے اور انگلستان کا بادشاہ ہمیشہ یہ پوچھتا اور سوچتا رہتا ہے کہ آپ سے صلح کس طرح ہو؟ اور میں یہ آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں، اگر آپ کی عظمت و جلالت اسے سننے پر آمادہ ہو۔ سرکار! میں آپ سے یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قوانین موضوعہ کے تحت مجھ جیسے بڈھے شخص کو نہ تو جنگ میں شریک ہونے کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ قید کیا جاسکتا ہے۔ اور اسی لیے قانون کے مطابق آپ نہ تو انگلستان کی بادشاہت میں کسی شخص کو قید کرسکتے ہیں اور نہ اس کا مال لوٹ سکتے ہیں بجز اس کے کہ

ایسے لوگ بادشاہ کو اپنی دلی رضامندی سے اس غرض سے مدد دیتے ہیں کہ آپ کے خلاف جنگ لڑی جائے۔ کیونکہ اگر بادشاہ جبراً ایسے لوگوں کا مال لے لیتا ہے تو اس صورت میں قانوناً اس کو معذور سمجھنا چاہیے۔ اور میں نے تو انگلستان کے بادشاہ کو آپ کے خلاف نہ تو پہلے مدد دی اور نہ اب دے رہا ہوں، سوائے اس کے کہ جبر و قہر سے میرا مال لے لیا گیا ہو۔ بنا برآں آپ مجھے اپنا دشمن نہیں قرار دے سکتے اور اسی لیے مجھے قیدی نہیں قرار دیا جا سکتا"

اتنا بیان کر کے بونے یہ اضافہ کرتا ہے کہ" ان باتوں پر مزید دھیان دیے بغیر ہم یہ دیکھیں گے کہ اس بارے میں قانون کیا ہے؟ میں حقیقت میں یہ باور کرتا ہوں کہ ایک بڈھا اور خصوصی حقوق سے بہرہ ور شخص، جسے قانوناً جنگ میں جانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اسے قیدی بنانے کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ اس جنگ کے لڑائے جانے میں مشورہ اور مدد دیتا ہو۔ اور بارہا ایک بڈھا شخص اپنے مشورے کے ذریعے سے اس سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، جتنا دس ہتیار بند آدمی۔ اور میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اپنی دلی رضامندی سے اپنے آقا کو اس جنگ کے کیے جانے میں مدد دے رہا ہو، تو صرف اسی صورت میں اس کا مال چھیننے کا حق حاصل ہوتا ہے ورنہ دوسری صورت میں اس کی کوئی معقول وجہ نہیں پائی جاتی"[1]

مستقل افواج کے قیام سے جنگ کو مہذب بنانے میں مؤثر مدد ملی۔

جاگیرداری نظام کے زمانے میں صرف چھوٹی چھوٹی اور عارضی فوجیں بھرتی ہوتی تھیں، اور ان کو کوئی بڑا دلی تعلق بھی نہیں

---

[1] ایضاً حصہ چہارم باب (۹۳)۔

پیدا ہوتا تھا۔ فوجی خدمت صرف ایک بہت تھوڑے عرصے کے لیے انجام دینی ہوتی تھی اور ضبط و نظم تقریباً معدوم ہوتا تھا۔ جلدی ہی دور دراز کی مہموں کے باعث شخصی طور سے فوجی خدمت انجام دینے کے بجائے معاوضے میں رقمی چندہ دینے کی اجازت مل گئی، جس کے ذریعے سے تنخواہ یاب آدمیوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کو ترقی ہونے لگی۔ بلکہ ان سے خطرہ ہی پیدا ہوگیا۔ کیونکہ ان کی ٹولیاں ڈاکوؤں، رہزنوں اور لٹیروں کی صورت اختیار کر کے عرصے تک مغربی یورپ میں خدا کا ایک قہر بنی رہیں۔ لیکن اس سے اس کا موقع مل گیا کہ باقاعدہ فوجیں قائم کی جائیں۔ رفتہ رفتہ جاگیر دارانہ فوجیں اور مفت فوجی خدمت، اور صرف بہت محدود عرصے کے لیے خدمت انجام دینے کا وجود اور وہ عدم ارتباط برخاست ہوگئے، جو متقابل عناصر کی بے نیازی اور آزادی کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے، اور جو ایک اچھے ضبط و نظم کے قیام میں روڑے اٹکاتے تھے۔

اس سلسلے میں انگلستان میں ایک دلچسپ نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، وہاں پر جاگیر عطیۂ سلطانی ہوتی تھی۔ ولیم فاتح نے اپنی جملہ رعایا سے وفاداری کا حلف لیا تھا۔ اس کے جانشینوں کے زمانے میں فوجی خدمت میں تخفیف ہو کر صرف رقمی چندہ دینے کی ذمہ داری رہ گئی۔ جسے "معاوضۂ خدمتِ فوجی" کہتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ وہاں خواہشمندانِ ملازمت کو تنخواہ پر بھرتی کرنے لگا۔ چنانچہ خود ولیم فاتح کے زمانے میں فرانس اور بریٹنی کے لوگ تنخواہ کے معاوضے پر بھرتی ہو کر فوجی خدمات انجام دے چکے تھے۔ فلانڈرس کے تنخواہ یاب سپاہی پہلے پہل ہنری اول کے زمانے میں نظر آئے۔ اس بادشاہ نے ۱۱۰۱ء میں فلانڈرس کے حکمراں رابرٹ سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے اس نے وعدہ کیا کہ سالانہ چارسو چاندی کے سکوں (مارک) کے

معاوضے میں وہ پانچ سو سوار انگلستان روانہ کیا کرے گا۔ جب ان فلانڈریوں نے زیادتیاں شروع کیں تو ان کے خلاف سختی کے ساتھ احتجاج کیے جانے لگے۔ اور ان کو بادشاہ اسٹیفن اول کے زمانے میں واپس کردیے جانے کا مطالبہ ہوا۔ منشور اعظم میں ایک حکم اس بارے میں بھی ہے کہ اجنبی سپاہیوں کو نکال باہر کیا جائے۔

اجنبی ممالک اور انگلستان میں کرائے کے ٹٹوؤں کا بھرتی ہونا جاری رہا۔ پھر صرف انگلستان ان کی فراہمی کی جگہ ہوگیا۔ تیسرے ایڈورڈ کے زمانے سے انگلستان کی براعظمی جنگوں میں انگریزی فوجوں کی اکثریت ایسے ہی تنخواہ یاب سپاہیوں پر مشتمل ہونے لگی۔ ان جنگوں کے باعث اس بات کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ "طلبناموں" کے ذریعے سے فوج میں بھرتی ہونے کا حکم دیا جائے۔ لیکن بادشاہ اور اس کے جاگیرداروں میں معاہدے ہونے لگے۔ اور یہ جاگیردار اپنی نوبت پر علدرآمد قدیم کے باعث وہ فوجی جماعت مہیا کرنے لگے جس کی فراہمی کا انھوں نے اقرار کیا تھا۔ فوجی خدمت کی مدت، تنخواہ کی مقدار، مال غنیمت میں حصہ۔ یہ تمام چیزیں معین کی گئیں۔ بلکہ اس کے بھی انتظامات کیے گئے[1] کہ حالت جنگ کی طرح حالت امن میں بھی بسر برد کا انتظام کیا جائے[1]۔

202

[1]۔ اسٹربس کی انگریزی تالیف "انگلستان کی دستوری تاریخ" جلد (۳) ص ۵۸۳۔ ریمر نے فوجی خدمات کے متعلق متعدد قدیم رواجات مرتب کرکے شایع کیے۔ ان میں سے ایک میں یہ لکھا ہے کہ سالسبری کے کونٹ نے اقرار کیا تھا کہ چھے سو ہتھیار بند اور سترہ سو تیر انداز سپاہیوں کی ایک جمعیت بادشاہ کی خدمت میں لا حاضر کرے گا۔ اسی نے یہ بھی اقرار کیا تھا کہ وہ خود بھی خدمت انجام دے گا اور اپنے ساتھ چھے علمبردار مالک جاگیر شہامت بازوں، اور (۴۴) غیر شادی شدہ (نوعمر) شہامت بازوں کو ساتھ لانا بھی اس کے فرائض میں داخل ہوگا۔ تنخواہ مقرر کردی گئی تھی۔ چنانچہ کونٹ کو روزانہ چھے شلنگ آٹھ دینار (پنس) مقرر کردیے گئے تھے بعد علمبردار اور غیر شادی شدہ شہامت بازوں کو علی الترتیب چار اور

تنخواہ یاب فوجوں کا رواج فرانس میں چودھویں صدی کے آغاز سے عام ہوگیا تھا۔ اور سابق میں جو لازمی شخصی خدمت تھی اس کی جگہ دولت کے تناسب سے ایک محصول عائد کردیا گیا تھا۔ انگریزوں نے بریٹنی کے معاہدے کے ذریعے سے جو صوبے لے لیے تھے، ان کو جب پانچویں شارل نے واپس حاصل کیا اور جنگ کے ذریعے سے فرانسیسی بادشاہت پر آئی ہوئی تباہیوں کی وہ تلافی کرنے لگا تو دیکھا کہ دوران جنگ میں بنی ہوئی لٹیروں کی ٹولیاں موجود ہیں۔ یہ لوگ سب دلخواہ دیہات پر لوٹ مار کرکے بسر برد کیا کرتے تھے۔ بادشاہ نے اس میں کامیابی حاصل کی کہ ان کا ایک حصہ اٹلی روانہ کردے اور ایک اسپین، اور باقی کا مزاج اس نے درست کردیا۔ سنہ ۱۳۷۳ء میں جو حکمنامۂ وِین سین نافذ ہوا اس کی رو سے افواج ضابطہ یا باقاعدہ فوج قائم ہوئی۔ اور یہی لوگ ایک مستقل فوج کی بنیاد بنے۔ اس کام کی تکمیل ساتویں شارل نے کی۔ چنانچہ سنہ ۱۴۳۹ء میں اس نے اورلیان کے نمایندگان طبقات ثلاثہ سے اس کی اجازت حاصل کرلی کہ ایک مستقل فوج قائم کرنے کے لیے اپنی تجویزیں عمل میں لائے۔ چنانچہ اس نے سو سو ہتیار بندوں کی پندرہ جماعتیں قائم کیں۔ ان میں سے ہر ہتیار بند کے ساتھ تین تیر انداز، ایک سائیس ایک گھوڑ سوار سپاہی اور ایک نوعمر کار آموز (یا اعزازی خادم) یا خدمتگار لڑکا ہوتے تھے۔ ان فوجوں کو سلطنت کی سرحد پر مختلف چھاؤنیوں پر متعین کیا گیا۔ جاگیرداری فوجی نظام میں ایک بنیادی تبدیلی ہوگئی۔ اس کے نو سال بعد موں تی لے توز کے حکمنامے کے ذریعے سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ دو شلنگ، ہتیار بند سپاہیوں کو ایک شلنگ اور تیر اندازوں کو چھے دینار (پنس)۔ فوج پر اپنے ہتیار آپ ہی فراہم کرلینے کی ذمہ داری تھی۔ اس معاہدے میں یہ بھی لکھا تھا کہ کونٹ فرانس، نارمنڈی، اور دیگر حدود اور سرحدوں میں "جنگی خدمت بجالائے گا۔

اس کی کوشش کی گئی کہ ایک شاہی پیدل جمعیت قائم کی جائے۔ چنانچہ آزاد[1] تیر اندازوں کی فوجی جمعیت وجود میں لائی گئی۔ اور ہر کلیسائی اختیار سماعت کے لیے ملک کی جو تقسیم ہوتی تھی، اس میں سے ہر ایک علاقے کے لیے ایک ایک منتخبہ تیر انداز ہوتا تھا۔ یہ لوگ ہر اتوار نیز عید کے دنوں میں تیر اندازی کی مشق کیا کرتے۔ رفتہ رفتہ ان آزاد تیر اندازوں کی تعداد سولہ ہزار تک پہنچ گئی۔ گیارھویں لوئی نے جنگجو سوئٹسانیوں کو بھرتی کر کے شاہی پیدل فوج کی بنیادیں قائم کیں۔ اور تنخواہ دے کر چھے ہزار چیدہ آدمیوں کی ایک جمعیت قائم کرلی جن کے ساتھ دس ہزار پیدل اور دو ہزار پانسو فرانسیسی تیر انداز بھی تھے۔ آٹھویں شارل نے اپنے زمانے میں پیدل فوج کا ایک حصہ جرمنوں سے بھرتی کیا۔

سسمونڈی نے اپنی فرانسیسی کتاب "اطالوی جمہوریتوں کی تاریخ" میں یہ بتایا ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں اطالویوں کے فن عسکری کی کیا خصوصیت تھی۔ چنانچہ "وزنی سوارہ جمعیت" ہی فوج کا سب سے اہم حصہ ہوتی تھی۔ اور ہر سوار لوہے سے ڈھکا ہوا ہوتا تھا۔ اسی لیے یہ لوگ صرف اسی صورت میں لڑسکتے تھے جب کہ گھوڑوں کو بھاگ دوڑ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اور اکثر لڑائی شروع کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی کہ ہر دو طرف کے سپہ سالار باہم اتفاق کریں اور مقابلے کے لیے ضمانت دیں اور ضمانت قبول کریں۔ چنانچہ ہر کوئی اپنی طرف کے میدان کو ہموار کرلیتا جہاں انھیں لڑنا ہوتا۔ لیکن مبارزے شاذونادر ہوتے تھے۔ اور ان تنخواہ یاب سپاہیوں کے افسر جب سوچ بچار کے بعد جنگ کرتے تو جہاں تک ممکن ہوتا اپنے آدمیوں کا خون نہ بہنے دیتے۔

---

[1] ان کو "آزاد" اس لیے کہتے تھے کہ یہ ملکی محاصل کی ادائی سے آزاد تھے (مترجم)۔

[2] میں یے کا فرانسیسی کتاب "فرانس کی جو ارضی اور سیاسی تنظیم گیارھویں صدی کے اختتام سے پندرھویں صدی کے اختتام تک تھی، اس کے متعلق مقالہ"۔

203

اس طرح کی لڑائی پورا دن ہوتی اور ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مقاتلوں کی جان جاتی۔ کبھی کبھی تو ایک بھی نہ مرتا۔ سِسموندی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ "جنگ رعایا پر ہوتی، فوج کے خلاف نہیں۔ اور قوم کی پوری جماعت دشمن تصور کی جاتی۔ اور جس مقام پر جنگ ہوتی وہاں کے لوگوں کا پورا مال و جائداد ان سپاہیوں کے نزدیک ایک جائز مال غنیمت ہوتا۔ یہ لوگ جائدادوں کے مالکوں اور گاؤں والوں کو گرفتار کرلیتے اور فدیہ لیے بغیر رہا نہ کرتے۔[1]"

ڈےنیس کا ایک سفیر چے زارہ بورجیا کے سپاہیوں کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ وہ بالکل بے اصول اور شتر بے مہار ہیں۔ ابھی تک انھیں لڑائی کی نوبت نہیں آئی ہے لیکن پھر بھی گذر اوقات صرف چوری اور ڈاکے پر ہوتی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ لوگ چاہے فرانسیسی ہوں یا گاسکنی والے یا سوئستانی، سب ہی وحشی ہیں۔ ... اور انھیں نے یہ ملعون عادت اٹلی میں ڈالی ہے۔"

سترھویں صدی عیسوی کے آغاز تک جرمنی میں کوئی منتقل فوج وجود میں نہ آسکی تھی۔ کبھی تو براہ راست رعایا کو بھرتی کرلیا جاتا، اور کبھی کرایے کے ٹٹوؤں کو بھرتی کیا جاتا۔ اگر رعایا کو بھرتی کیا جانا ہوتا، تو مختلف جرمن راجدھانیوں کی مجالس شوریٰ اس مدت کا تعین کرتیں جس میں ان لوگوں کو اپنے حکمران کی صوابدید پر کام کرنا ہوتا۔ اور اگر تنخواہ پر نوکر رکھا جانا ہوتا، تو فوجی افسر ٹھیکہ داری کے اصول پر کام کرتے اور ایک معینہ رقم پر سپاہی فراہم کرتے۔

فوجی قواعد اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ انگلستان میں بہت قدیم سے رائج تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسی ملک میں

204

[1] سِسموندی (سسموندی) کی فرانسیسی تالیف "قرون متوسط میں اطالوی جمہوریتوں کی تاریخ" جلد (۴)، ص ۲۲۳۔

باضابطگی کے ساتھ فوجی نظم و ضبط، دیگر ممالک سے پہلے قائم ہوگیا تھا۔ اور اس کی اس بارے میں عام طور سے مولف تعریف کرتے ہیں۔ چنانچہ کومین لکھتا ہے کہ "جہاں تک مجھے علم ہے، دنیا کی ان تمام سلطنتوں میں، جن سے میں واقف ہوں، ایسی سلطنت جہاں پبلک امور کا سب سے اچھا انتظام ہے اور جہاں رعایا پر سب سے کم زیادتی کی جاتی ہے نیز جہاں جنگ کے لیے کوئی عمارت توڑی اور ڈھائی نہیں جاتی، وہ انگلستان ہے۔ اور جو لوگ [اس سے] جنگ کرتے ہیں ان پر مصیبت اور بدقسمتی ٹوٹ پڑتی ہے"۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ: "اس خوبی کے باعث انگلستان کی بادشاہت کو دوسری بادشاہتوں پر یہ فوقیت حاصل ہوگئی ہے کہ اس ملک اور اس قوم کے لوگ نہ تو کوئی چیز تباہ کرتے ہیں، نہ جلاتے ہیں، اور نہ عمارتوں کو ڈھاتے ہیں۔ اور مقابلہ صرف سپاہیوں اور خاص کر جاگیرداروں سے ہوتا ہے جن کے خلاف وہ بہت رشک و حسد رکھتے ہیں[1]"

ایک اور موقع پر انگلستان کی جنگوں ہی کا ذکر کرتے ہوئے کومین بیان کرتا ہے کہ "ان کا انگلستانی رواج یہ ہے کہ اگر انھیں لڑائی میں جیت حاصل ہو تو وہ کسی کو قتل نہیں کرتے اور خاص کر رعایا کو (کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہر کوئی ان کو راضی رکھنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہی سب سے زیادہ طاقتور ہیں) اور وہ کسی کو جرمانے دینے پر مجبور نہیں کرتے"۔ رُوجرس نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۴۶۱ء میں جب آں ژُو کی مارگریت کی فوج نے لوٹ مار شروع کی تو لوگوں نے جھٹ پٹ چوتھے ایڈورڈ کو تخت نشین کردیا[2]۔

---

[1] ۔ کومین کی فرانسیسی تالیف "یادداشتیں" کتاب چہارم باب (۱۸)۔
[2] ۔ جیمس تھارلڈ روجرس کی انگریزی تالیف "تاریخ کی معاشی تعبیر" کا فرانسیسی ترجمہ از کاستانو صفحہ ۳۵۔

جان بے علاقہ کے زمانے میں وہ قاعدے نافذ ہوئے جن کا منشاء فوج میں زندگی پیدا کرنے میں سہولت مہیا کرنا تھا۔ اس سے پہلے رچرڈ اول نے بھی ۱۱۸۹ء میں ان صلیبی جنگجوؤں کے لیے جو ارض مقدس جانے کے لیے جہازوں پر سوار ہوتے تھے ایک ضابطہ نافذ کیا تھا تاکہ جہازوں میں ضبط قائم رہے۔ ۱۳۸۵ء میں دوسرے رچرڈ نے وہ احکام نافذ کیے جن کا انگریزی نام یہ ہے: "قواعد، احکام اور رواج جو فوج میں ملحوظ رہیں۔" ان کی ترتیب خود بادشاہ نے "صدر حاکم عدالت، سرخیل قصر شاہی، سپہ سالار اور دیگر جاگیرداروں، معاشداروں، نوابوں اور عقلمند خطاب یافتوں کے مشورے سے دی تھی۔" اس دستاویز میں (۲۶) دفعات ہیں۔ اس کا حکم دیا گیا ہے کہ بادشاہ، سرخیل قصر شاہی اور سپہ سالار کی اطاعت کی جائے۔ گرجوں کو لوٹنے یا وہاں چوری کرنے اور پادریوں یا عورتوں کو قتل کرنے، عورتوں کی عصمت دری کرنے اور پادریوں اور عورتوں کو قیدی بنانے کی ممانعت کرکے، خلاف ورزی کی سزا پھانسی مقرر کی گئی۔ مذکورۂ بالا اشخاص اگر ہتیار اٹھائیں تو پھر یہ ممانعت باقی نہیں رہتی۔ کپتان کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ فوج کے لیے لیجائی جانے والی غذا کو چرانے کی ممانعت کی گئی ہے اور خلاف ورزی پر سر قلم کیے جانے کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ جھگڑے پیدا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، ورنہ بانی فساد کے گھوڑے اور ساز و یراق ضبط کر لیے جائیں گے۔ اور اگر وہ "ملازم، نوکر یا کار آموز ہو تو اس کا بایاں کان کاٹ دیا جائے گا۔" بعض دیگر دفعات میں قیدیوں اور قید کنندوں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ اور خاص کر ان میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ قیدی کو کپتان کے سامنے لا پیش کیا جائے اور وہی اسے بادشاہ یا سرخیل قصر شاہی یا سپہ سالار کے پاس حاضر کرائے۔ قیدی کو بلا اجازت پروانہ سفر دینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس ضابطے کا اسی زمانے میں سرکاری طور سے فرانسیسی میں ترجمہ ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی

20

ایک دفعہ ان الفاظ میں ہے کہ "اگر کوئی شخص کسی کو قیدی بنائے تو اس سے اقرار لے نیز اس کا خود یا سیدھا دستانہ اتار لے۔ یہ اس بات کی ضمانت اور علامت ہوگا کہ اس نے اسے قید کیا ہے۔ یا اسے حفاظت کے لیے پہرے میں رکھے"۔ حقیقت میں "اس کا وہی اثر ہوگا جو پہلی صورت میں اقرار کا"۔ اگر قیدی کے متعلق کوئی جھگڑا ہو تو دھمکیاں نہیں دی جانی چاہییں ورنہ خلاف ورزی کرنے والے کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اور اگر یہ آخرالذکر اپنے قیدی کو قتل کر ڈالے تو سپہ سالار اسے قید کرے گا اور اس وقت تک رہا نہیں کرے گا جب تک کہ وہ اپنا حصہ، اپنے گھوڑے، اور اس کا ساز و یراق سرخیل قصر شاہی کی تحویل میں ضبطی کے لیے نہ دیدے"۔ ایک اور دفعے میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ فوج کا ہر شخص "سینٹ جارج کا ایک فوجی نشان نمایاں طور سے اپنے سامنے لگائے اور ایک اپنے پیچھے"۔ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو ایسے شخص کو زخمی یا قتل کرنے والا ہر قسم کی سزا دہی سے بچ جائے گا۔ اسی دفعے میں اس کی بھی ممانعت ہے کہ "کوئی دشمن سینٹ جارج کا مذکورہ نشان نہ لگائے، خواہ وہ قیدی ہو یا کوئی اور، ورنہ اسے سزائے موت دی جائے گی"۔ اسی طرح اس کی بھی ممانعت کی گئی ہے کہ "لوٹو" کا نعرہ لگائیں (یہ نعرہ لوٹ مار کی اجازت کا اشارہ ہوتا ہے) "ورنہ سر کاٹ لیا جائے گا اور جس شخص یا اشخاص نے سب سے پہلے مذکورہ نعرہ لگایا ہو تو ان کا بھی سر کاٹ لیا جائے گا اور پھر ان کی لاشیں ہاتھوں کے بل لٹکا دی جائیں گی"۔

206 ایک اور اتنا ہی اہم ضابطہ، جس میں (۴۳) دفعات ہیں ۱۴۱۵ء میں پانچویں ہنری نے نافذ کیا[1]۔

[1]۔ آپٹن نے پانچویں ہنری کے حکمنامے کی ایک لاطینی عبارت نقل کی ہے۔ گروز کی انگریزی تالیف "فوج کے متعلق قدیم باتیں"۔ جلد (۲) ص ۶۸ میں دوسرے رچرڈ کا حکمنامہ

اس لڑائی کے شروع ہونے سے پہلے ایسی تدبیریں اختیار کرلی گئی تھیں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ درج ہے۔ نکولاس کی انگریزی تالیف "آزن کورٹ کی لڑائی کی تاریخ" ضمیمہ (۱) میں ان دونوں حکناموں کا انگریزی متن چھپا ہے۔ سر ٹر اورس ٹوس بھی ان دونوں حکناموں کو نقل کرتا ہے اور اس کا ماخذ کاٹن اور لانس ڈاؤن کے ذخیروں کے مخطوطات ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو اس کی شایع کردہ انگریزی تالیف "امارت بحریہ کی کالی کتاب" جلد (۱) ص ۴۴۴ و مابعد۔ پانچویں ہنری کا حکنامہ سر ٹر اورس ٹوس کے مطابق ۱۴۱۹ء کا ہے لیکن دوسرے مولف اسے ۱۴۱۵ء کا بتاتے ہیں۔

دوسرے رچرڈ کے حکنامے کے متعدد قلمی نسخے برٹش میوزیم میں پائے جاتے ہیں۔

پانچویں ہنری کے زمانے میں ایک انگریز راہب تھا۔ اس کا نام ایم ام کالاس تھا۔ اس نے لاطینی میں "پانچویں ہنری پر منظوم کتاب" لکھی۔ اس میں اس نے اشعار مندرجہ ذیل میں اس حکنامے کا خلاصہ درج کیا ہے اور اسے ۱۴۱۵ء کے معرکے کے آغاز کا بتایا ہے:—

بادشاہ اپنی فوج کو حکم دیتا ہے
کہ کلیسائی جائداد مامون رہے۔
تمام پادری اور منتظم کلیسا محفوظ رہیں۔
کوئی دست درازی آہنی ہتیار کے ذریعے سے مقدس چیزوں پر نہ کیجائے (۲)۔
اور عورتوں پر ہاتھ ڈالنے کی مانعت ہے۔
خلاف ورزی کی سزا موت ہے —— قانون ایسا ہی تھا۔

سولھویں صدی عیسوی کے نصف اول کا ایک مولف رابرٹ رڈ ہین تھا۔ اس نے اپنی لاطینی تالیف "پانچویں ہنری کی تاریخ" میں بھی اس حکنامے کو مخاصمانہ کارروائیوں کے ابتدائی زمانے کا بتایا ہے۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ ہیں:—

"جب ہنری اپنی فوج کے ساتھ صحیح سلامت فرانس پہنچا تو اس نے
ایک عام ڈھنڈورا پٹوایا کہ کوئی شخص نہ تو دیوتاؤں کے مندروں
کو لوٹے، نہ پادریوں کو نقصان پہنچائے، نہ نہتوں کو زخمی کرے، نہ

جن سے فتح کا اطمینان ہوگیا تھا۔ چنانچہ ایسے معاہدے کیے گئے تھے کہ فوج کے لیے بڑھئی، معمار، ہتیار اور گولی بارود فراہم کی جائے گی۔ ہالینڈ اور زے لانڈ سے جہاز کرایے پر لیے گئے تھے۔ بندرگاہوں میں جو انگریزی اور دوسری کشتیاں تھیں ان کو بھی چھین لیا گیا تھا۔ اس فوج میں نوعمر نوکروں کو چھوڑ کر ساڑھے گیارہ ہزار آدمی تھے۔ تین ماہ کی ملازمت کی تنخواہیں ادا کردی گئی تھیں۔ پارلیمان نے جو رقم منظور کی تھی وہ کچھ زیادہ نہ تھی۔ اور تیاریاں کچھ اتنی مہنگی پڑی تھیں کہ بادشاہ کو تاج کے جواہرات گرو رکھنے پڑے تھے، اور اپنی رعایا سے رقم قرض مانگنی پڑی تھی۔

دوسرے رچرڈ کے حکمنامے کے چند احکام بھی نقل کیے ہوئے ملتے ہیں۔ ان میں اس اصول کی توثیق کی گئی ہے کہ بادشاہ اور سرخیل قصر شاہی اور سپہ سالار کی اطاعت کی جائے۔ اس بادشاہ نے (جسے ایک مورخ نے پادریوں کے حکمران کا نام دیا ہے)، اپنے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ مقدس روٹی اور شراب، مقدس پیالوں، کلیساؤں اور پادریوں کا احترام کریں بجز اس کے کہ یہ پادری ہتیار لیے ہوئے ہوں۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے موت کی سزا مقرر کی گئی تھی۔ اور یہی سزا ان لوگوں کے لیے بھی مقرر کی گئی تھی جو عورتوں کو قتل یا ان کی عصمت دری کریں۔ پادریوں اور عورتوں کو قیدی نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ چند دفعات میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۔ بچوں کو ضرر پہنچائے، نہ عورتوں کی عفت میں خلل ڈالے۔
اور جو بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے اس کے لیے
سزائے موت مقرر کی گئی۔"

"منظوم کتاب" اور "تاریخ" دونوں کو کول نے اپنی انگریزی تالیف "پانچویں ہنری کے متعلق یادداشتیں" میں شامل کیا ہے جو "برطانیہ عظمیٰ اور آئرستان کی تاریخیں اور یادداشتیں"، نامی انگریزی سلسلۂ کتب میں شایع ہوئی ہے۔

سپاہیوں کے فرائض، فوجی معائنوں، محافظوں، اور قیدیوں کا بھی ذکر ہے۔ ہر سپاہی کو چاہیے کہ وہ جنگ میں جو کچھ کمائے اس کا ایک تہائی اپنے کپتان کو پیش کردے۔ اور اگر اس فریضے کی خلاف ورزی کی جائے تو وہ پورے ہی مال غنیمت سے محروم کردیا جائے گا۔ قیدی اسی کا ہوگا جس نے اسے گرفتار کیا ہو۔ لیکن گرفتار کنندہ کو چاہیے کہ اپنے قیدی کو اپنے کپتان کے پاس لا حاضر کرے۔ اور اس کپتان کو چاہیے کہ آٹھ دن کے اندر اسے بادشاہ یا سرخیل قصر شاہی یا سپہ سالار کے پاس پیش کردے۔ کوئی شخص اپنے افسروں کی اجازت کے بغیر فدیہ قبول کرنے کا مجاز نہ تھا۔ ایک دفعے میں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ چودہ سال سے کم عمر بچوں کو قیدی بنایا جائے، بجز اس کے کہ وہ کسی سردار، کسی معزز شخص یا کسی کپتان کا بیٹا ہو۔ ایسی صورت میں اسے کپتان کے سامنے لا حاضر کیا جانا چاہیے، جو اسے بادشاہ کے پاس روانہ کردے گا۔ اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ کسی ایسے کمرے میں داخل ہوں جہاں کوئی عورت وضع حمل کی حالت میں ہو۔ اسی طرح اس کی بھی ممانعت لکھی گئی ہے کہ ایسی چیزیں چرائی جائیں جو اس زچہ کی ہوں، یا خود ایسا شور و غوغا کیا جائے جس سے اس کی یا اس کے بچے کی صحت کو نقصان پہنچے۔ اس کی خلاف ورزی کی جائے تو مجرم کے قبضے میں جو بھی چیزیں ہوں ان کا نصف اس زچہ عورت کو دلایا جائے گا اور باقی نصف سرخیل قصر شاہی اور سپہ سالار کو۔ اور خود مجرم کو بادشاہ کی صوابدید پر قید رکھا جائے گا۔ سپاہیوں کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ ہل جوتنے والے کسانوں کو بے روک ٹوک جانے دیا جائے۔ بادشاہ نے اور بھی احکام اپنے افسروں کو دیے۔ اور کہتے ہیں کہ اس جنگ کے دوران میں فوج میں ضبط قائم رکھنے کے لیے جو ضابطے نافذ کیے گئے ان کی تعداد (۳۷) سے کم نہیں ہے۔ جنرلوں میں سے ایک کا نام تال بو تھا جو شروزبری کا کونٹ بھی تھا۔ اس نے اپنے ماتحت سپاہیوں کے لیے ایک تفصیلی ضابطہ بنایا تھا۔ اسی نے

سزائے موت نہ صرف لٹیروں کے لیے مقرر کی تھی، بلکہ ہر اس سپاہی کے لیے بھی جو گھوڑے، بیل یا کسانوں کے کوئی اور جانور لے اڑے۔ اس نے اس کی بھی ممانعت کی کہ انگور کے باغ اور میوہ دار درخت تباہ کیے جائیں۔ ان مختلف حکمناموں میں اشیائے مایحتاج کی فراہمی کے نظام کی طرف بھی اشارہ نظر آتا ہے۔[1]

ساتویں ہنری کے زمانے میں کچھ نئے حکمنامے نافذ کیے گئے۔ اور آٹھویں ہنری نے خاص کر ۱۵۴۴ء میں ایک اہم حکمنامہ نافذ کیا جس میں پانچویں ہنری کے حکمنامے کا ایک جزو دہرایا گیا تھا اور کچھ نئے احکام بڑھائے گئے تھے، جو خاص کر قیدیوں کے متعلق تھے، نیز کپتانوں کے اس فریضے کے متعلق کہ جو لوگ ان کے ماتحت ہوں ان کی تنخواہ ادا کرتے ہیں۔ قیدیوں کے متعلق جو احکام دیے گئے تھے وہ بڑے تفصیلی ہیں۔ اگر فرانس کا بادشاہ، بادشاہ کا بیٹا، ڈیوک، لفٹنٹ جنرل، اعلیٰ سر تحصیل یا سپہ سالار سپاہیوں کے ہاتھ میں پڑے تو وہ براہ راست بادشاہ کے قیدی سمجھے جائیں گے۔ اگر کوئی ان کو چھوڑ دے تو اس کے لیے سزائے موت مقرر کردی گئی تھی۔ اور گرفتار کنندہ کے لیے ایک انعام مقرر کیا گیا تھا۔

الیزابتھ کے زمانے میں بڑی کثرت سے حکمنامے شایع ہوئے۔ بعد میں سنہ ۱۶۴۰ء میں نارتھمبرلانڈ کے کونٹ نے ایک فوجی ضابطہ چارلس اول کی فوجوں کے لیے مدوّن کیا۔ اور سنہ ۱۶۴۳ء میں ایسیکس کے کونٹ نے انگریزی میں "جنگ کے قوانین اور احکام" نامی ایک ضابطہ جس میں (۹۷) دفعات تھیں، پارلیمانی فوجوں کے لیے نافذ کیا۔

مزید براں انگلستان میں فوجی انصاف کا نظام بہت پہلے ہی

۱۔ مونٹے گومبر نارڈ کی انگریزی تالیف "مضامین آکسفرڈ" بابت ۱۸۵۶ء مضمون "جنگ کے قانون اور رواج کا ارتقاء" ص ۹۹۔

قائم ہوگیا تھا۔ شروع شروع میں یہ سرخیل قصر شاہی کے ہاتھ میں تھا جو جنگ کے زمانے میں اہل فوج کے تمام جھگڑوں اور ہنگاموں کی تمام خلاف ورزیوں کے متعلق فیصلہ کرتا۔ اعلیٰ سرخیل کو مدد دینے کے لیے سپہ سالار اور چند ماہرینِ قانون، چند اہمیت رکھنے والے لوگ اور ایک کلرک (؟ پادری) مامور تھے۔ اس فوجی عدالت کو، جس میں یہ سب شریک ہوتے، اُن معاملات کے تسویے کا بھی اختیار تھا جو جنگوں میں حاصل ہونے والے تخشکی کے مالِ غنیمت کے سلسلے میں پیدا ہوں۔ اسی طرح اس کو قیدیوں اور ان کے فدیے کے متعلق بھی اختیار حاصل تھا۔ جب آٹھویں ہنری کے زمانے میں بکنگھام کے ڈیوک کی سزائے موت کے عواقب کے باعث اعلیٰ سرخیل کا موروثی عہدہ برخاست کردیا گیا، تو اس عدالت کی صدارت سپہ سالار کرنے لگا۔ لیکن فوجی معاملات میں اس کے اقتدارات کے متعلق جھگڑا پیدا ہوگیا۔ اور جلدی ہی فوج کے اعلیٰ افسروں نے اس کے اختیارات خود غصب کرلیے، اور ایک نیا محکمہ قائم ہوا جو "فوجی مجلس شوریٰ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس قسم کی ایک مجلس شوریٰ خود سنہ ۱۶۴۰ء میں اجلاس کرچکی تھی۔ یہ بیان کیے جانے کے قابل ہے کہ ان اختیاراتِ سماعت [یعنی عدالتوں] کے سامنے جنگ کے رسم و رواج اس حد تک ملحوظ رہتے تھے کہ جب فوجی عدالت کی جگہ مجلس شورائے جنگ قائم ہو کر طویل عرصہ گزر گیا تو بھی بیرونی ممالک کے ضابطوں کو دیکھا جایا کرتا تھا۔

فوجی ضبط کے متعلق دوسرے ملکوں میں بھی ضابطے بننے لگے۔ "سات ارکان" نامی قسطیلہ کے قواعد، سپاہیوں کے متعلق قیمتی معلومات کے حامل ہیں۔ اور جیسا کہ ہم آیندہ دیکھیں گے، اس میں مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق بھی احکام تھے۔

اس زمانے میں اسپین کو باقی یورپ کے مقابلے میں، جہاں جاگیرداری نظام رائج تھا، ایک عجیب خصوصیت حاصل تھی۔ چنانچہ

دوسرے ملکوں میں انتخاب کا اصول رفتہ رفتہ برخاست ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ وراثت کا اصول قائم ہونے لگا لیکن انتخاب کا اصول قسطیلہ میں برقرار رہا۔ چنانچہ وہاں فوج کے "آدالید" (دلیل) یعنی رہبر اور "الموکادین" (مقدم) یعنی پیدل فوج کے کپتان برابر انتخاب کے ذریعے سے مامور ہوتے رہے۔ اور اگر بادشاہ کو کوئی "دلیل" یا "مقدم" مقرر کرنا ہوتا تو اسے بارہ ماہر ترین لوگوں کو بلانا پڑتا۔ اور یہی لوگ نئے شخص کو چنتے اور قسم کھا کر بیان کرتے کہ اس میں مطلوبہ صفات پائے جاتے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ "اسپین کا عامی، جو سپاہی اور شہری ہوتا، شہری حلقوں میں اگر وہ اپنے مشیروں کا انتخاب کرتا تو میدان جنگ میں اپنے افسروں کا[1]"۔ بحریے کے متعلق بھی یہی قاعدہ تھا۔ بے شبہ امیر البحر کو تو بادشاہ نامزد کرتا تھا لیکن جہازوں کے کپتانوں کی (جن کو کومیتر کہتے تھے) نامزدگی بارہ ایسے لوگ کرتے تھے "جو سمندر سے واقف" ہوں۔

یہاں ہمیں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اسپین کا قانون جنگ بھی، اسپین کے پورے فوجی نظام کی طرح، عربوں کے قانون جنگ سے براہ راست متاثر تھا۔

مسلمانوں نے جنگ کے قواعد بہت قدیم زمانے ہی میں مدون کر دیے تھے[2]۔

---

[1] ۔ ژدیبوٹ سینت ای لیر کی فرانسیسی تالیف "اسپین کی تاریخ"، جلد (۳)، ص ۴۹۸۔

[2] ۔ ریلانڈ کی لاطینی تالیف "جنگ کے متعلق مسلمانوں کے قانون کے احکام" کا فرانسیسی ترجمہ جو سول تے نے ۱۸۳۸ء میں شایع کیا ـــــ سول تے نے ایک اور کتاب عربی سے ترجمہ کر کے فرانسیسی میں شایع کی جس کا نام "کافروں سے جنگ کے متعلق مسلمانوں کے قانون کے احکام" تھا ـــــ نیز دیکھیے ہولتسہن دورف اور ری شیے کی فرانسیسی تالیف"

[عربوں کا] قانونِ جنگ مقابلۃً بہت انسانیت لیے ہوئے ہے۔ جنگ کا اعلان کیا جانا لازمی ہے۔ اس کی بھی عادت تھی کہ دشمن کو اسلام لانے یا خلیفے کو خراج (یعنی جزیہ) دینے کا بھی بدل پیش کیا جاتا۔[1] عورتیں، بچے، بوڑھے، معذور اور مجنون جنگ کے اثرات سے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ گفت و شنید کے لیے آنے والے ایلچیوں کا احترام کیا جاتا۔ منبعوں اور چشموں میں زہر ملانے کی ممانعت تھی۔ صرف ایک معاملے میں عرب بڑے سخت تھے۔ وہ یہ کہ جنگی قیدیوں کو اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں یا تو قتل کر دیا جاتا یا غلام بنا لیا جاتا اور سیاسی مصلحت کے تحت فدیہ قبول نہیں کیا جاتا۔[1] ابوالحسین [؟ القدوری] نے، جن کی وفات بغداد میں سنہ ۱۰۳۶ء میں ہوئی تھی، غیر مسلموں سے جنگ کے قانون پر ایک رسالہ لکھا تھا۔[2] ایک اور مولف نے بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں دس باب ان قواعد کے متعلق لکھے تھے جو مسلمان اپنے دشمنوں سے ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور آخر میں وقایہ نامی کتاب کا ذکر کرنا چاہیے جو تقریباً سنہ ۱۲۸۰ء میں برہان الشریعہ محمود المحبود (؟ المحبوبی) نے لکھی تھی۔ 210

مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ مرتدوں، بت پرستوں اور خدا کو نہ ماننے والوں کے خلاف ایک ختم نہ ہونے والی جنگ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ "قانون بین الممالک کی تہمید" ص ۲۰۷۔

[1] ۔ معلوم نہیں اس غلط خیال کا ماخذ کیا ہے کیونکہ قرآن مجید (۴۷/۴) کے مطابق نہ صرف فدیہ لینے بلکہ مفت بھی رہا کرنے کا صریح حکم ہے جس پر ہر زمانے میں عمل بھی ہوتا رہا ہے (مترجم)۔

[2] ۔ اس سے بہت پہلے امام زید بن علی (فوت سنہ ۱۲۲ھ) اور امام ابو حنیفہؒ (فوت سنہ ۷۶۷ء) اور ان کے ہمعصروں نے قانون جنگ پر یا تو اپنے مجموعہ ہائے قانون کے مستقل ابواب میں بحث کی تھی یا اس موضوع پر خود مستقل رسالے تالیف کیے تھے (مترجم)۔

جاری رکھیں۔ چنانچہ یہ جنگ اس وقت تک کی جاتی رہے کہ یا تو وہ مسلمان ہوجائیں یا جزیہ دینا قبول کریں۔ جزیہ صرف اہل کتاب سے لیا جاتا ہے جو ایک تحریری قانون کو مانتے اور اسے خدا کی وحی سمجھتے اور اسے اپنا دینی قانون قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ بھی چاہیے کہ کم سے کم سال میں ایک مرتبہ کافروں کے خلاف کوئی مہم اختیار کریں[1]۔ اسی سے اسپینیوں کو عربوں کی سرزمین میں گھسا کرنے کا ابتداءً خیال پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ان کارروائیوں کے متعلق (جن کو کابل گادا یعنی سواروں کا رسالہ کا نام دیا گیا) دسویں الفونسو نے نہایت تفصیل کے ساتھ "سات ارکان" نامی ضابطے میں احکام صادر کیے ہیں۔ غالباً ٹیوٹانی سلسلے کے راہب شہامت بازوں نے اپنی فلسطینی جنگوں کے سلسلے میں عربوں کے اسی رواج کو دیکھ کر یاد رکھا اور "سفر" کے نام سے اپنی مہیں جاری کیں جن کے متعلق کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی کے بھرے اجلاس میں برادزے ٹو کے پاول ولاڈی میر نے انھیں ملامت کی۔ یہ لوگ سال میں دو مرتبہ غیر عیسائیوں کے علاقوں میں لوٹ مار اور تباہ کاری کے لیے نکلا کرتے تھے۔ ایک تو مریم عذرا کے تزکیے کی عید کے موقع پر (اور بی بی مریم ہی کو انھوں نے اپنی روحانی سرپرست قرار دیا تھا) اور دوسرے حضرت عیسےٰ کے آسمان پر جانے کی عید کے موقع پر۔

فرانس میں دوسرے ژاں نے ۱۳۵۱ء میں جو حکمنامہ نافذ کیا تھا اس میں صرف فوجی یرغمالوں کے متعلق اشارے پائے جاتے ہیں۔ ۱۴۱۳ء میں چھٹے شارل کے زمانے میں ملک کی عام کوتوالی کے متعلق جو حکمنامہ نافذ ہوا، اس میں بھی سپاہیوں کے متعلق چند احکام پائے جاتے ہیں۔ وہ جنگی حکمنامہ جو زہیباخ کی جنگ کے موقع پر صادر ہونے کے باعث

---

[1] ۔ ایسا کوئی حکم قرآن یا حدیث میں نہیں ہے چاہے واقعے کی حد تک کہیں ایسا عملدرآمد رہا ہو (مترجم)۔

"زمپاخ نامہ" کہلاتا ہے، وہ بھی فن جنگ کے متعلق کوئی حکمنامہ نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایک معاہدہ تھا جس کی تکمیل کرنے کا سوئٹان (سوئٹزرلینڈ) کے تمام صوبوں (کانٹونوں) نے اقرار کیا تھا۔ اس پر ۱۰؍ جولائی ۱۳۹۳ء کی تاریخ ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا تھا کہ "کوئی بھی اس وقت تک کوئی عام یا خانگی جنگ شروع نہیں کر سکتا جب تک کہ ہم، جو باہم حلیفی رکھتے ہیں، اس کی ضرورت کو تسلیم نہ کریں۔ لیکن جب جھنڈے کھول دیے جائیں تو ہم اپنے دشمنوں کے خلاف سب کے سب چڑھ دوڑیں گے اور اسی بہادری سے لڑیں گے جیسے ہمارے آباو اجداد اور ہم متحد اور باہمت اور وفا شعار رہیں گے۔ جو کوئی صفوں کو چھوڑ دے یا اس حکمنامے سے کسی اور طور پر تجاوز کرے تو اسے وہ حکومت گرفتار کرے گی جہاں کا وہ باشندہ ہو اور اس کی ذات اور جائداد کو سزا دے گی تاکہ سب کو تنبیہ ہو اور کوئی خلاف ورزی نہ ہو ..... میدان جنگ کی مدافعت کی جائے گی اور خطرہ ختم ہونے تک دشمن کو ہراساں کیا جاتا رہے گا جیسا کہ زمپاخ میں پیش آیا ہے کہ دشمن نے ہمارے لوٹ مار میں مصروف ہونے کے دوران میں اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا، اور اسے اس سے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا اگر ہم مال غنیمت کے پیچھے اتنا زیادہ نہ دوڑتے۔ لہذا آیندہ کوئی شخص غنیمت پر اس وقت تک ٹوٹ نہ پڑے جب تک کہ افسر اس کی اجازت نہ دیں۔ ہر شخص جو کچھ پائے اسے لاکر ان کے سپرد کرے اور یہی افسر اس غنیمت کو فوجی ٹکڑیوں کی قوت کے تناسب سے ان سب لوگوں میں تقسیم کریں گے جنھوں نے لڑائی میں حصہ لیا ہو۔ چونکہ خدائے تعالی نے کلیساؤں کو اپنے گھر قرار دیا ہے اور نوع انسانی کی نجات کے لیے ایک عورت سے خدمت لی ہے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے لوگوں میں سے کوئی بھی کسی خانقاہ، کلیسا یا گرجا پر نہ تو جبر کرے نہ تباہ، اور نہ آگ لگائے بجز اس کے کہ دشمن ان کے اندر پناہ گزیں ہو

211

اسی طرح وہ کسی عورت یا نوجوان لڑکی پر نہ تو حملہ کرے نہ اسے زخمی کرے۔ اس سے وہ صورت مستثنیٰ ہے جب عورتیں اس زور سے چلائیں کہ اس سے ہماری سپاہ کے لیے کوئی نقصان کا خطرہ لاحق ہو۔[1]

سنہ ۱۴۶۸ء اور سنہ ۱۴۷۱ء میں "چارلس مند شارل" کے متعدد اہم فوجی حکمنامے شایع ہوئے اور سنہ ۱۴۷۳ء میں وہ حکمنامہ نافذ ہوا جو سیں ماگزیھم نے ٹریف کی خانقاہ سے شایع ہوا اور اس کا نام تھا "وہ قواعد و احکام جو ہتیار بند لوگوں اور پیدل اور سوار سپاہیوں کی جماعتوں میں ملحوظ رکھے جائیں۔"

شبستان ہالینڈ میں شارل کیں نے سنہ ۱۵۴۷ء میں فوجی نظام عدالت کے ایک باقاعدہ ضابطے کا خاکہ مرتب کیا۔

صوبجات متحدہ میں ایک فوجی "حکمنامہ" متعدد ماہرین قانون اور فن داں لوگوں نے مل کر مرتب کیا۔ اور سنہ ۱۵۹۰ء میں اسے ہر سہ طبقات رعایا کے نمایندوں کے حکم سے شایع کیا۔

شہنشاہیت کی طرف سے دو قانون سنہ ۱۵۷۰ء میں بمقام اسپیی رے صادر ہوئے۔ یہ "سواروں کا حکمنامہ" اور "پیدل فوج کا حکمنامہ" کے نام سے مشہور ہیں۔

کتاب "سات ارکان" میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "بحری جنگ ایک یاس انگیز چیز ہے"۔ قرون متوسط کی ابتدائی صدیوں میں سمندر کی جنگ محض بحری قزاقی تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، کہ ایران، شام اور مصر کے مالک بن جانے کے بعد عربوں نے اسے ویرانہ کی کہ بحر متوسط کے ساحلوں پر بسنے والی قومیتوں کو دھمکانے لگیں۔ عرب اور عیسائی ایک بہت عظیم الشان لوٹ مار میں مشغول ہو گئے۔ شمالی سمندروں میں بھی ایسی ہی بے امنی تھی۔ مزید برآں ان مخاصمانہ

[1] ملی ٹین کی فرانسیسی تالیف "سولتانی عہد کی تاریخ" جلد (۱)، ص ۱۷۵۔

کارروائیوں میں ایک ہولناک بے رحمی بھی برتی جاتی تھی۔ جہاز لوٹ لیے جاتے، ملاحوں کو سمندر میں پھینک دیا جاتا، یا ان کا قتل عام عمل میں آتا، یا ان کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ سمندر میں کوئی قانون ہی نہ تھا۔ عرصے تک مختلف حکمرانوں میں عارضی امن یا صلح کے لیے جو معاہدے ہوتے رہے، ان سے بحری جنگوں کے جاری رہنے میں کسی طرح سے بھی کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوئی۔ سنہ ۱۳۴۲ء میں بریٹنی کے ڈیوک کی رعایا انگریزوں کے خلاف بحری قزاقی میں مشغول رہی، حالانکہ ان کے حکمران نے انگریزوں سے ابھی ابھی ایک صلح کی تھی۔ اور جب تک ئیس لوئی نے دخل دہی نہیں کی، اس وقت تک بریٹنی کے بحری قزاقوں کی طمع آرائیوں کو روکنے پر بریٹنی کا ڈیوک مجبور نہ ہوا۔ سنہ ۱۴۰۴ء میں غالباً کسی عارضی صلح کے دوران میں اسکاٹ لینڈ کا ولیعہد سمندر پر جو تھے ہنری کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا اور تقریباً (۱۹) سال تک وہ قید میں رکھا گیا۔ ساحلوں پر جو شہر آباد تھے، وہ ساتھ ہی پناہ گاہوں کا بھی کام دیتے تھے اور یہیں سے جانباز بحری قزاق نکل کر تجارتی جہازوں کو لوٹا کرتے تھے۔ انگلستان اور فرانس کی طویل جنگوں کے دوران میں ایک موقع ایسا بھی پیش آیا کہ بحری قزاق ہی سمندر کے مالک بن گئے تھے۔ انگلستان کے ساحل اور جزائر، فرانسیسی جہازوں کی لوٹ مار کا شکار تھے تو دوسری طرف ڈوفر، رائی، پورٹسمتھ، پلائی متھ اور دوسری بندرگاہوں سے بہت سے قسمت آزما جہازوں پر بیڑے چڑھاتے تاکہ فرانسیسی ساحلوں کو لوٹیں۔[1] ایک سرکاری دستاویز میں بحری قزاقوں کا یوں ذکر کیا گیا ہے کہ: "چند لوگ جو سمندری سیاح کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں ڈاکو ہیں جنھیں قانون کی حفاظت سے باہر کردیا گیا ہے، جو بھگوڑے ہیں اور جن کو مختلف مقاموں سے نکالا گیا اور مختلف مملکتوں سے

---

[1] ڈیوٹن کی انگریزی تالیف "انگلستان پندرھویں صدی میں" ص ۸۶۔

جلا وطن کیا گیا تھا یا ایسی ہی دیگر مماثل صورتیں ۔ یہ لوگ اپنی لوٹ مار اور سامان اور تجارتی اسباب کی ڈاکہ زنی پر بسر بسر برد کرتے ہیں، چاہے اس مملکت کا ہو یا دیگر ممالک کا ۔ یہ بڑی تباہی پھیلاتے ہیں اور مذکورہ مقاموں میں سے متعدد کو انھوں نے نابود کر دیا ہے[1]۔"

سمندروں پر جو بے امنی تھی اس کے باعث بحری سفر پہ جانے والے اس بات کے معاہدے کر لیتے تھے کہ باہم مل کر سفر کریں اور یہ پہلے ہی طے ہو جاتا تھا کہ بحری قزاقوں اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے میں جو مال غنیمت حاصل ہو، اسے کس طرح سے بانٹا جائے ۔ یہ اتحاد صرف مدافعت ہی کے لیے محدود نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ اتحاد اس خصوصی غرض کے لیے ہوتا تھا کہ دشمن اور بحری قزاقوں کو ضرر پہنچائیں ۔ اور انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی تھی کہ اپنی مہموں کو کوئی قانونی حیثیت عطا کریں ۔ اس کے علاوہ محافظانہ اتحاد بھی عمل میں آتے تھے ۔ چنانچہ پیزا میں تاجروں کا ایک اتحاد عمل میں آیا جو ایک زمانے میں ایک مستقل قوت بن گیا اور اپنے جنگی جہاز حکمرانوں کو تک مستعار دینے لگا ۔

ساحلی شہر بھی باہم اتحاد کرنے لگے ۔ چنانچہ اس طرح کی حلیفیاں اٹلی میں اکثر ہوتی رہیں ۔

بعض اور کوششیں بھی عمل میں لائی جاتی رہیں ۔ چنانچہ صلحناموں اور معاہدوں کے ذریعے سے بیچ بچاؤ کرانے والوں اور امن کی حفاظت کرنے والوں کا تقرر عمل میں آنے لگا جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ۔ جس شخص کو مضرت پہنچتی، اسے اس طرح تلافی حاصل کرنے کا موقع ملتا اور اگر انصاف سے انکار کیا جاتا یا خود اس صورت میں جب کہ وہ شخص جس کے خلاف فیصلہ صادر ہوتا، اطاعت سے انکار کرتا تو ان افراد کو جنھیں مضرت پہنچی ہوتی اپنے حکمرانوں سے اجازت نامۂ انتقام

213

---

[1]۔ انگریزی کتاب "پارلیمان کے اوراق"، جلد (۴) ص ۲۲۵۔

حاصل ہو جاتا۔

کچھ اور تدبیریں اختیار کی گئیں جو زیادہ موثر تھیں۔ چنانچہ قزاقوں کے ہر بیڑے کی روانگی کو ایک پیشگی اجازت کا محتاج قرار دیدیا گیا۔ سنہ ۱۲۸۸ء میں تیسرے الفونسو نے آراگون کے ساحلی شہروں کو اس کا پابند کیا کہ وہ اپنے ہاں کے بحری قزاقوں کے متعلق یہ اطمینان کرلیں کہ وہ اپنے ہموطنوں ہی کو نہ لوٹ لیں، دشمن پر صلح کے دوران میں یا غیر جانبدار بندرگاہوں میں حملہ نہ کریں، اور انھیں جو کچھ لوٹ حاصل ہو اُسے اس بندرگاہ پر لائیں جہاں سے وہ بیڑا لے کر روانہ ہوئے تھے۔ بادشاہ نے ناجائز لوٹ کی پیش بندی کر لی تھی۔ اس لیے اس نے حکم دیا تھا کہ ایسا جہاز یا اس پر لدا ہوا بار واپس کر دیا جائے اور سرکاری کارندوں کو حکم دیا گیا کہ لٹیروں کے جہازوں کا بیڑا تیار کرنے یا ان کی مہموں میں حصہ لینے سے اجتناب کریں۔

اس نگرانی کا براہِ راست یہ نتیجہ نکلا کہ "اجازت نامہائے سرحد" عطا ہونے لگے۔ اور چودھویں صدی عیسوی میں بحری قزاقی آراگون اور قسطیلہ میں اتنی زیادہ منظم ہو گئی تھی کہ اس کو چلانے کے لیے کمپنیاں تک قائم ہونے لگیں۔ تقریباً اسی زمانے میں آراگون کے تیسرے پیئیر نے ایک حکمنامے کے ذریعے سے یہ ضروری قرار دیا کہ ہر روانہ ہونے والا بیڑا ایک ضمانت دیا کرے۔ اور اس پر یہ حلف لینے کی پابندی عاید کی جانے لگی کہ اس بارے میں جو ہدایتیں ہیں، ان کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

اسی کا مماثل ایک ضابطہ اٹلی میں بھی ملحوظ رکھا گیا تھا۔ چنانچہ وہاں مختلف ساحلی شہروں کے حکام بحری قزاقوں پر ایک نگرانی رکھتے تھے جن کو ایک حلف لینے اور ایک ضمانت دینے کا پابند کیا گیا تھا کہ دوست ممالک کے بیڑوں کے خلاف مخاصمانہ کارروائیاں عمل میں نہیں لائیں گے۔

شمال نے بھی رفتہ رفتہ اسی مثال کی تقلید شروع کی۔ خود

چودھویں صدی کے آغاز پر فلانڈرس والوں اور فریزہ والوں میں جو لڑائیاں
ہوئیں ان میں بھی اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ طے یہ ہوا تھا کہ تمام
بحری قزاق ایک تقرر نامہ حاصل کریں گے اور ایک امیرالبحر کے اپنے
آپ کو ماتحت تسلیم کریں گے۔ اور اگر کسی کو ضرر پہنچنے کی شکایت ہو تو
وہ اس امیرالبحر سے شکایت کرسکیں گے۔

214

ایک صدی بعد یورپ کی تمام مملکتوں میں قزاقوں کے بیڑے ایک
اجازت نامہ حاصل کرنے کے پابند ہوگئے جو صرف حکمران یا اس کا
نائب عطا کرسکتا تھا۔[1]

مرکزی اقتدار ساتھ ہی بحری قزاقی کے خلاف بھی لڑتا رہا۔ ایک
قابل توجہ قانون سازانہ تدبیر وہ حکمنامہ ہے جو ۱۴۱۴ء میں انگلستان کے
پانچویں ہنری نے نافذ کیا۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کا
"قتل، غارتگری، چوری، صلح کا توڑنا اور بادشاہ کے پروانۂ امن کی پروا
نہ کرنا" نیز ملزموں کو دی جانے والی ہر مدد یا اعانت "تاج اور مرتبت شاہی
کے خلاف کی جانے والی بڑی غداری" کے افعال سمجھے جائیں گے۔ اس
حکمنامے میں یہ بھی بیان ہوا تھا کہ آیندہ سے ہر بندرگاہ میں بادشاہ
"ایک وفادار شخص کو، جس کا نام صلح اور شاہی پروانۂ امن کا محافظ
ہوگا،، نامزد کیا کرے گا اور اس کا کام یہ ہوگا کہ صلح اور پروانہائے امن
کی ان خلاف ورزیوں کی تحقیقات کرے جن کا "سمندر پر، کونٹیوں کے
حدود کے باہر اور سینک پطس (نامی پانچوں بندرگاہوں) کی گزر کے
باہر" ارتکاب عمل میں آئے۔ اور وہ اشخاص "جن کا بھی وہی انتخاب کرتا"
اس محافظ کے نائب ہوتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جہازوں کے

[1]۔ زوتنگ اور ول کر دونوں کی اجتماعی جرمن تالیف "مملکتی لغت" باب (۵)، مال غنیمت —— کال تون بورن کی جرمن تالیف "بحری جنگ کے مال غنیمت کی تاریخ" (جو تاریخ اور سیاسیات کے نئے سالنامے" نامی سلسلے میں ۱۹۰۹ء میں بطور جلد دوم شایع ہوئی)

تمام مالکوں پر یہ لازمی قرار دیا گیا کہ اس محافظ کے ہاتھ پر حلف لیں کہ وہ صلح اور پروانہ ہائے امن کا احترام کریں گے۔ اگر وہ بادشاہ کے دشمنوں کو لوٹتے تو ان پر واجب تھا کہ لوٹ کو اس محافظ کے پاس بندرگاہ میں لاکر پیش کریں بجز اس کے کہ کوئی ایسی رکاوٹ ہو جس پر قابو حاصل نہ کیا جاسکتا ہو۔ اس کی خلاف ورزی پر مال کی ضبطی اور قید کی سزا دی جاتی۔

سولھویں صدی میں جب بڑی بڑی بحری مہیں اختیار کی جانے لگیں تو ایسی بحری قزاقی ترقی کرنے لگی جس کے لیے باقاعدہ ضابطے تیار ہوتے تھے۔ اور سترھویں صدی میں یہ اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ عہد جدید کے آغاز پر جو افسوسناک جنگیں واقع ہوئی تھیں، وہ سب سے زیادہ تجارتی حیثیت رکھتی تھیں۔ اور چونکہ ہر مملکت کی سیاست کے پیش نظر یہ تھا کہ دوسروں کی تجارت کو کمزور اور برباد کردے، اس لیے ان لوگوں کی مدد بڑی قابل قدر سمجھی گئی جو محض لالچ کے لیے ہر قسم کی زیادتیوں کا ارتکاب کرنے پر آمادہ ہوجاتے تھے۔ اور یہ مدد اتنی زیادہ قابل قدر تھی کہ اس سے دستبردار ہونا ممکن نہ تھا۔ بحری قزاقی شاہی بیڑے کی معاون بن گئی۔ اس کی ہر طرح حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ دو صدیوں تک قانونی قزاقی سمندروں پر مسلط رہی اور اس ادارے کو کچھ اتنا زیادہ قبول کرلیا گیا تھا کہ سلطنتیں اپنے معاہدوں میں تک بحری قزاقوں کے حقوق اور واجبات کی تفصیل و تعین کرنے لگی تھیں۔

جب سترھویں صدی ختم ہونے لگی تو صرف اسی وقت ظلم و زیادتی کی اس سیاست میں کچھ استثنا نظر آنے لگے۔ چنانچہ جب سویڈن اور صوبجات متحدہ میں جنگ چھڑی تو اس کے دوران میں ہر دو حریبوں نے یہ اقرار کیا کہ بحری قزاقوں سے کوئی مدد نہیں لیں گے۔

لیکن جب ۱۶۷۹ء میں انھیں دونوں حکومتوں میں صلح نامہ طے ہوا تو یہ نظر آیا کہ ۱۶۷۵ء کا وعدہ طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا تھا۔

دشمن سے کیے ہوئے وعدے کا احترام ایک ایسا امر ہے جس پر بکثرت مولفوں نے بحث کی ہے۔

گراتیان نے اپنے (حکمنامے) میں وہ فقرہ داخل کر دیا تھا جس میں سینٹ آگسٹائن نے اپنی رائے ظاہر کی تھی یعنی (لاطینی میں) "وہ اقرار جو خود دشمن سے کیا گیا ہو اس کا بھی احترام کرنا چاہیے۔ اور بدرجۂ اولیٰ اس اقرار کا جو کسی دوست سے کیا گیا ہو اور جس کی خاطر کوئی لڑائی کی گئی ہو"[1] بولونیا کے اس ماہر قانون مذہبی یعنی سینٹ آگسٹائن کی رائے واضح تھی کہ دشمن سے جو معاہدے کیے جائیں ان کی پوری وفادارانہ تعمیل کی جانی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک بالکل دوسرا ہی رجحان پیدا ہو گیا تھا۔

اس کے ذمہ دار سب سے زیادہ پوپ تھے۔ پوپوں کو یہ دعویٰ تھا کہ انھیں اعلیٰ ترین اقتدار حاصل ہے، اور اسی اقتدار کے استعمال میں وہ کسی کیے ہوئے اقرار کی ذمہ داری سے کسی کو بری بھی کر سکتے ہیں کیا خود حضرت مسیح نے سینٹ پیٹر اور اس کے جانشینوں کو حل و عقد (یعنی پابند کرنے اور ذمہ داری سے براءت دینے) کا مکمل اختیار نہیں عطا کر دیا تھا؟ پوپ چھٹے کلےماں نے فرسے ای کے اسقف کے نام لکھا تھا کہ مقام مقدس یعنی پوپ کے علاقوں کے مفاد کے خلاف جو معاہدے عمل میں لائے گئے ہوں، وہ کالعدم سمجھے جائیں گے حتیٰ کہ اس وقت بھی جب ان کی حلف کے ذریعے سے توثیق کر دی گئی ہو کیونکہ حلف کو کسی ناانصافی کا رشتہ نہیں بننا چاہیے۔ اسی پوپ نے فرانس کے بادشاہوں کے شخصی پادریوں کو (جن کے سامنے وہ اعتراف گناہ کا

---

[1] "پوپوں کے مذہبی احکام" (لاطینی میں) حصۂ دوم بحث (۲۳) مسئلہ (۱) باب (۳)۔

مذہبی فریضہ انجام دیا کرتے تھے) یہ اختیار عطا کیا تھا کہ وہ ان بادشاہوں کو ان تمام معاہدوں کی ذمہ داری سے بَری کرسکتے ہیں جن کی تعمیل سے بے آرامی لاحق ہوتی ہو۔ پوپ دوسرے یولیوس نے "راسخ العقیدہ فردیناند" کو یہ اجازت دی تھی کہ وہ بارھویں لوئی سے کیے ہوئے اقراروں کو نظر انداز کردے۔

اس سے جو خطرہ پیدا ہوگیا تھا، وہ قابل لحاظ تھا۔ پھر کیا نظر آیا؟ حکمران پیشگی ہی اس کا اعلان کرنے لگے کہ اگر پوپ، تعمیل کی ذمہ داری سے بَری کرنے کے متعلق، اپنا مزعومہ حق کام میں لائے تو وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ ایک مثال درج ذیل ہے۔ مجریط (میڈرڈ) کے معاہدے میں طے پایا تھا کہ "شارل کیں اور پہلا فرانسوا کسی صورت میں بھی اس کی استدعا نہیں کریں گے کہ انھیں ان کے حلف کی ذمہ داری سے بَری کردیا جائے۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک اس کی استدعا کرے یا اسے حاصل کرلے تو فریق ثانی کی رضامندی کے بغیر اسے اس سے استفادہ نہیں کرنا چاہیے"۔ یہ پیش بندیاں بے سود ثابت ہوئیں جیسا کہ لوراں نے بیان کیا ہے۔ وہ پہلا شخص جس نے فرانس کے بادشاہ سے اس کا اقرار لیا کہ وہ اپنے حلف کی پروا نہیں کرے گا وہ پوپ تھا۔ اس نے اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کیا کہ فرانس کے بادشاہ سے شہنشاہ کے خلاف ایک حلیفی کرلی۔[1]

یہ صحیح ہے کہ پہلا فرانسوا اپنی پیش بندیاں کرچکا تھا۔ ایک قابل فخر نظارہ ۱۳ جنوری ۱۵۲۶ء کو پیش آتا ہے۔ بادشاہ مجریط کے قلعے میں محصور تھا اور اس نے فرانسی پارلیمان کے صدر نشین اول یعنی ژاں ڈسلفٹ اور دوسرے تمام فرانسسی سفیروں کو وہاں بلایا۔ جس معاہدے کی شرطیں طے ہوئی تھیں، اس پر دوسرے دن دستخط

[1] لوراں کی فرانسسی تالیف "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد ۱۰ "دو قومیتیں" ص ۳۲۴۔

کیے جانے والے تھے۔ اور بادشاہ نے کہا کہ اس معاہدے میں "انصاف اور معقولیت کے خلاف چیزیں" پائی جاتی ہیں۔ یہ کہ اسے خود اپنے ہاتھ سے دستخط کرنے ہیں۔ یہ کہ اسے ایسی حالت میں حلف لینا پڑ رہا ہے جب کہ وہ قید ہے۔ اور یہ کہ شہنشاہ نے اپنے لیے یہ حق محفوظ رکھا ہے کہ اس وقت تک نہ تو دستخط کرے اور نہ حلف اٹھائے جب تک کہ پہلا فرانسوا اپنی آزادی کے بعد معاہدے کی توثیق کا اطلاع نامہ روانہ کرے۔

قیدی بادشاہ نے ژاں ڈ سلفٹ کو حکم دیا کہ تمام حاضرین سے حلف لے۔ اور ان پر یہ پابندی تھی کہ وہ راز رکھیں اور جو کچھ کہا جائے وہ کسی کو ظاہر نہ کریں بجز بادشاہ کی ماں اور بادشاہ کی بہن یعنی آلاں سوں کی ڈچیس اور اس شخص کے جس کو یہ ڈچس نامزد کرے۔ جب اقرار پر حلف لے لیا گیا تو ژاں ڈ سلفٹ نے ان شکایتوں کی تفصیل بیان کی جو فرانس کے بادشاہ کو شارل پنجم کے خلاف پائی جاتی تھیں۔ اور یہ طے ہوا کہ جس معاہدے پر فرانسوا اول کو دستخط کرنے تھے، اسے کالعدم سمجھا جائے کیونکہ وہ "جبر اور دباؤ، نظر بندی اور طویل قید کے ذریعے سے" طے کرایا گیا تھا۔ اور یہ بیان کیا گیا کہ "جو کچھ طے ہوا ہے وہ کالعدم اور بالکل بے اثر رہے گا۔ اور ہم نے بحث کے بعد یہ طے کیا ہے کہ تاج فرانس کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔"

پوپ چوتھے نکولاس نے عیسائی قوموں کو اس کی ممانعت کی تھی کہ غیر مذہب والوں کے ساتھ کوئی معاہدے کریں۔ پوپ چھٹے اربان نے باضابطہ طور سے یہ بیان کیا تھا کہ جو معاہدے غیر عیسائی حکمرانوں کے ساتھ کیے جائیں وہ قانوناً ناجائز اور کالعدم ہیں اور یہ کہ تمام عیسائی بادشاہوں کو ان کے اقراروں سے بری کیا جاتا ہے، چاہے انھوں نے ان پر کتنے ہی مقدس حلف کیوں نہ لیے ہوں۔ پوپ

تیسرے پاؤل نے یہ اعلان کیا کہ جو معاہدے ملحدوں سے کیے جائیں وہ پیشگی ہی کالعدم ہوجائیں گے۔

مزید برآں کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی نے بھی بڑے تقدس کے ساتھ یہ حکم دیا تھا کہ کوئی حکمران ایسا پروانۂ امن نہیں عطا کرسکتا جو عیسائی مذہب یا کلیسائی اقتدار کے مفاد کے خلاف ہو اور یہ کہ کلیسا کا حاکم عدالت، ملحدوں کے خلاف کارروائی کرسکتا اور انہیں سزا دے سکتا ہے، اگرچہ وہ عدالت میں صرف اس وجہ سے آئے ہوں کہ انھیں بادشاہوں نے مکمل امن و حفاظت کا یقین دلانے کے لیے جو پروانے عطا کیے تھے ان پر انھیں پورا اطمینان تھا[۱]۔ اگرچہ شہنشاہ زیگس مونڈ نے یوحان ہوس کو ایک نہایت مکمل و باقاعدہ پروانۂ امن عطا کیا تھا لیکن اس [مصلح] کو مجلس شورائے مذہبی کے پادریوں کے حکم سے زندہ جلادیا گیا تھا۔

مولفوں میں سے اکثر تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دشمن سے کیے ہوئے وعدے کی تعمیل کی جانی چاہیے۔ لیکن چند نے اس پر کچھ شرطیں لگادی ہیں۔ آیالا نے اگرچہ اس کلیے کو قبول کیا تھا کہ "دشمن سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا جانا چاہیے" لیکن اسے پراٹسٹنٹ مذہب سے جو مخاصمت تھی اور شہزادۂ آریخ سے اس کو جو نفرت تھی، اس کی رو میں وہ بہہ جاتا ہے اور وہ اس کلیے سے باغیوں کو خارج کردیتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ کوئی شخص اس اقرار کی تعمیل کا پابند نہیں جس سے خدا کی ناراضی لاحق ہوسکے یا جس سے کلیسا کا مفاد متاثر ہو[۲]۔

۱۔ نوراں کی کتاب مذکورہ ص ۳۳۴ — گیزےلر کی جرمن تالیف "کلیسائی تاریخ" جلد ۲ حصۂ چہارم ف ۱۵۰ تعلیق ج ج۔

۲۔ آیالا کی لاطینی تالیف "جنگ کے حقوق اور فرائض اور فوجی ضبط و نظم" کتاب اول باب (۲) ف ۱۳ و ۱۴۔

کیا جنگی چالیں درست کہی جاسکتی ہیں؟ یہ نازک معاملہ ہے۔ ماہرین قانون اور ماہرین دینیات دونوں نے اپنے علوم کی کتابوں میں ایسے احکام پائے جن سے جنگ میں چال چلنا درست قرار دیا جاسکتا تھا۔

قانون روما نے دشمن کے خلاف چلی جانے والی چال کو درست قرار دیا تھا۔ اور وہ اسے "جائز دھوکا"[1] کہتے تھے۔

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے کہا تھا کہ "الحرب خدعة" (جنگ ایک مکر ہے)۔ عربوں کے ہاں ایک ضرب المثل ہے کہ "بعض وقت ایک چال چلنے میں اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے جتنا ایک قبیلے کی مدد سے بھی نہیں حاصل ہوتا۔" عرب مولف ابن خلدون نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں بیان کیا ہے کہ "جنگوں میں فتح عام طور سے ایسے اخلاقی اسباب کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو روح اور خیال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لشکروں کا زیادہ ہونا، ہتھیاروں کا عمدہ ہونا، حملہ کرنے میں شجاعت دکھانا بعض وقت فتح حاصل کرنے میں کافی ثابت ہوتے ہیں لیکن یہ ذرایع، بمقابل اخلاقی اثرات کے بہت کم کارگر ہوتے ہیں۔ اسی لیے چال کا چلنا جنگ میں زیادہ مفید ہوتا ہے اور اسی سے اکثر فتح حاصل ہو جاتی ہے۔[2]"

---

[1] کتاب اول ف ۳، (د) "برا دھوکا" یعنی فریب، ۴، ۳۔

[2] مولف نے یہاں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ باوجود تلاش کے مقدمۂ ابن خلدون میں کوئی ایسی عبارت نہیں ملی جو اس ترجمے کی اصل قرار دی جاسکے۔ البتہ ایک فصل اس موضوع پر ہے جس کی تفصیل دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ غالباً اسی کا خلاصہ یہاں پیش کردیا گیا ہے۔ ہم اس فصل کا اصل عربی سے ترجمہ درج ذیل کرتے ہیں:۔
"جنگ میں فتح کا کبھی یقین نہیں کیا جاسکتا چاہے اس کے اسباب یعنی سامان اور سپاہی بھی فراہم کیوں نہ ہو جائیں۔ اصل میں فتح بخت و اتفاق پر منحصر ہوتی ہے۔ ان کی

جنگی چالوں اور حربیاتی کارروائیوں کے جواز کے مسئلے میں پوپ گراتیان نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ جائز ہیں اور اس نے اس بارے میں سینٹ آگسٹائن کے یہ الفاظ بطور سند پیش کیے کہ جنگ کا جواز محض اس لیے ختم نہیں ہوجائے گا کہ کوئی یا تو علانیہ جبر و زور کا استعمال کرے یا چالاکی کو کام میں لائے یا اس حکم سے فائدہ اٹھانا چاہے جو خدا نے حضرت یوشع علیہ السلام کو دیا تھا کہ دشمنوں کے لیے کمین گاہیں قایم کریں۔[1] 218

مذکورۂ بالا حوالہ جس باب میں ہے، اس سے پہلے کے باب میں گراتیان نے حاکم عدالت کا ذکر کیا ہے۔ مذہبی شروح نے عدالتی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ تفصیل یہ ہے کہ غلبے کے اسباب اکثر (دو قسم کے امور میں) مجتمع ہوتے ہیں۔ ایک تو ظاہری امور یعنی لشکروں کی کثرت، ہتھیاروں کا مکمل اور عمدہ ہونا، بہادروں کا زیادہ ہونا، میدان جنگ کی ترتیب، نیز لڑائی سچے دل سے لڑنا اور اسی کے مماثل اشیاء۔ دوسرے مخفی امور [جن کی دو صورتیں ہیں] یا تو انسان کا چال چلنا اور حیلہ و مکر کر کے افواہیں پھیلانا اور ایسی دعایہ کاری کرنا کہ [حریف کے] لوگ ساتھ چھوڑ دیں نیز بلند مقاموں پہ پہنچ جانا تاکہ پستی میں ہونے والا وہم اور بد فالی کرنے لگے۔۔۔۔۔ وغیرہ، یا یہ مخفی امور آسمانی اسباب ہوں جن کا حاصل کرنا آدمی کے بس کی چیز نہ ہو۔ یہ اسباب دلوں میں ڈالے جاتے ہیں جن سے ان پر رعب غالب آکر ان کے مرکز میں خلل پیدا ہوجاتا ہے اور شکست ہوجاتی ہے۔ ہزیمتیں اکثر انھیں مخفی امور کے باعث ہوتی ہیں فریقین میں سے ہر ایک چونکہ غالب آنے کی خواہش میں اس کا بکثرت استعمال کرتا ہے اس لیے کسی ایک پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ الحرب خدعۃ (جنگ ایک مکر ہے) اور ایک عربی مثل ہے کہ رب حیلۃ انفع من قبیلۃ (بسا اوقات ایک چال، ایک قبیلے سے زیادہ مفید ہوتی ہے)۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جنگوں میں غالب آنا اکثر غیر ظاہر مخفی اسباب کے باعث ہوتا ہے اور بخت کے یہی معنے ہیں۔" (مقدمۂ ابن خلدون کتاب اول فصل سوم باب ۳۸ ذیلی فصل (۲))۔

[1] لاطینی کتاب "پوپوں کے احکام" حصۂ دوم بحث (۲۳) مسئلہ (۲) باب (۲)۔

کارروائی کے ذریعے سے حق کا مطالبہ کرنے اور جنگ کے ذریعے سے حق کا مطالبہ کرنے میں مماثلت قائم کی ہے۔ چنانچہ انھیں شروح نے یہ تسلیم کیا کہ اگر کوئی وکیل کسی بظاہر منصفانہ مقدمے کی پیروی کر رہا ہو تو اسے اجازت ہوگی کہ کوئی چال بھی چلے۔

اکوی ناس کے سینٹ ٹامس نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ (لاطینی میں) "جنگ میں کمین گاہ میں بیٹھنا کس طرح جائز ہے؟" اس کی اپنی رائے میں ایک امتیاز ضروری ہے۔ کمین گاہوں کا مقصد دشمن کو دھوکا دینا ہوتا ہے۔ غرض کسی کو دو طرح سے دھوکا دیا جاسکتا ہے۔ یا تو شروع میں اس سے ایک جھوٹی بات بیان کی جائے اور وعدے کا لحاظ نہ کیا جائے۔ یا اس کو وہ چیز صاف صاف نہ بتائی جائے جس کے اس کے متعلق کیے جانے کی تجویز ہے یا جو اس کے متعلق ذہن میں ہے ان میں سے پہلی قسم بالکل ناجائز ہے اور دوسری جائز۔[1]

اکویناس کے سینٹ ٹامس کے خیالات مختلف مولفوں نے قبول کیے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ لنانو کے ژاں نے اس کی کتاب "چوٹی کے مسائل" سے لفظ بلفظ وہ عبارت نقل کر لی ہے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا۔ کرسٹین ڈیپزان اپنی فرانسیسی کتاب "ہتیاروں کے کارناموں اور شجاعت بازی پر کتاب" میں اپنے استاد بونورے بونے سے یہ کہلواتی ہے کہ "خدا اور بائبل کے احکام کے تحت دشمن پر فتح حاصل کرنے کے لیے چالاکی، کلدار ہتیار اور مکاری کام میں لائے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ جنگ دو فریقوں میں انصاف کرتی ہے اور اعلان کے ساتھ ہوتی ہے" لیکن مکاری کے ایسے بھی ذریعے پائے جاتے ہیں جن کو لڑائیوں کے موقع پر بھی اسی طرح ناپسندیدہ

---

[1] اکویناس کے سینٹ ٹامس کی لاطینی تالیف "دینیات کے چوٹی کے مسائل" حصہ دوم مسئلہ (۴۰)، مقالہ (۳)۔

اور ممنوع قرار دیا جاتا ہے جس طرح دوسرے موقعوں پر۔" پھر وہ یہاں مختلف مفروضے شمار کراتی ہے مثلاً کوئی عارضی صلح، حریف سے گفت و شنید کے لیے کسی ملاقات کا تعین وغیرہ۔ اس نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بہت صاف ہے کہ "کوئی جھوٹی چالبازیاں نہ کی جائیں۔" اس کے برخلاف نووی کے مارتن نے فرشتہ خصال ماہر [سینٹ ٹامس] اور قانون مذہبی کے حوالے سے یہ (لاطینی میں) بیان کیا ہے کہ: جائز جنگوں میں کمین گاہوں میں بیٹھنا روا ہے تاکہ فتح حاصل کریں بغیر اس کے کہ ہم بد عہدی کے مرتکب سمجھے جائیں۔" آریا نامی مولف نے صرف اسی پر اکتفا کی ہے کہ سینٹ ٹامس کی کتاب "چوٹ کے مسائل" ہی کے الفاظ دہرا دے۔

ژدل نے رتی کا یہاں ذکر کیا جانا چاہیے جس نے قانون روما کے "جائز دھوکے" سے اپنے طور پر فائدہ اٹھایا ہے اور (لاطینی میں) کہتا ہے کہ "وہ دھوکا جائز ہے جو دشمن کو دیا جائے۔ اس میں بھی کوئی بات نہیں کہ وہ غیر مذہب والوں، چوروں، بحری قزاقوں، ملحدوں اور اسی قسم کے تمام ناپاک غیر اطاعت شعاروں کے متعلق ہو۔" یہ دلچسپ نتیجہ ایک ایسی تالیف میں بیان کیا گیا ہے جو ترکوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ کے لیے لکھی گئی تھی اور جس کا آغاز شارل کیں کو سراہنے سے ہوا تھا۔ آیالا نے سینٹ آگسٹائن کے الفاظ کی تائید میں قدیم تاریخ کے بعض واقعات بطور نظیر پیش کیے ہیں۔

البیریکس جنتی لیس اس سے بھی زیادہ وضاحت سے خیال آرائی کرتا ہے اور جنگی چالوں اور خلاف عہدیوں میں بہت احتیاط سے فرق کرتا ہے۔ اور اگر وہ اول الذکر کو درست قرار دیتا ہے تو آخرالذکر کو کھلم کھلا مردود ٹھہراتا ہے۔

له۔ ژدل خے رتی کی لاطینی تالیف "قانون اور بحری مسائل کا رسالہ"۔ "رسائل قانون عمومی جلد (۲)، ورق (۳۴۳)۔

له۔ البیریکس جنتی لیس کی تالیف "قانون جنگ"، کتاب دوم باب سوم۔

شیپیوجنتی لیس "قانون جنگ" کے عنوان کے تحت جو نظریے شمار کراتا ہے، ان میں وہ بیان کرتا ہے کہ بعض صورتوں میں اور بعض طریقوں سے دشمن سے جھوٹ کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ یہ جائز ہے کہ کوئی ایسی چیز لکھ کر دشمن کی طرف پھینک دی جائے جو اُسے بھڑکا سکے۔

اس سلسلے میں اس واقعے کا ذکر کیا جاسکتا ہے جس کی گروتیوس نے روایت کی ہے اور جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جنگی چالوں کے متعلق کیا تصور پایا جاتا تھا۔ سنہ ۱۵۹۷ء میں ناساؤ کے حکمران موریس نے چاہا کہ شہر فن لو پر اچانک قبضہ کر لے۔ اس میں وہ ناکام رہا اور اسپین والوں نے چند ولندیزی سپاہیوں کو جنھیں انھوں نے قید کر لیا تھا، سزائے موت دی۔ گروتیوس کہتا ہے کہ "فریقین کی رضامندی سے قانون کا یہ نیا استعمال رائج ہو گیا تھا تا کہ اس طرح کے خطروں کا سدباب کیا جائے"۔ کوہین کی ایک عبارت سے ہمیں ایک مماثل رواج کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ کوہین بیان کرتا ہے کہ اٹلی اور اسپین میں ایک رواج پایا جاتا تھا جس کی رو سے "اگر کوئی حکمران کوئی محاصرہ کرتا اور کسی مقام کے سامنے گولہ باری کرتا اور جو کوئی اس مقام پر داخل ہوتا اور محاصرہ کنندہ کے خلاف اس کو مستحکم بنانے میں مدد دیتا تو قانون جنگ کے مطابق وہ سزائے موت کا مستحق سمجھا جاتا۔"

دشمن سے تعلقات کے سلسلے میں سفیروں کی ذات کو قابل احترام سمجھنا چاہیے۔

جب کبھی ہتیار روکے جائیں اور عارضی صلح ہو تو اس کا پورا پورا احترام کیا جانا چاہیے۔ عارضی صلح کو جنگ سے زیادہ قربت ہے یا صلح سے؟ اس مسئلے کی سب سے زیادہ قانون مذہبی کے ماہروں نے تحقیق کی ہے کیونکہ "زرین خلاصہ" نامی لاطینی کتاب کی ایک عبارت میں سوسے کے ہنری نے یہ بیان کیا تھا کہ عارضی صلح، امن

ہوتی ہے [جنگ نہیں]۔ اور مولفوں نے اس میں امتیاز پیدا کرنا شروع کیا چنانچہ جو عارضی صلح کسی مختصر مدت کے لیے کی گئی ہو اس کا تعلق جنگ ہی سے زیادہ ہوتا ہے، اور جو صلح چند سالوں کے لیے کیگئی ہو اس کا تعلق امن سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس حل کو عارضی صلح کے اختتام پر ایک عملی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک اور سوال پیدا ہوا کہ عارضی صلح کے اختتام پر آیا کسی نئے اعلان جنگ کی ضرورت ہے یا نہیں۔ عام طور پر رائے یہ تھی کہ نہیں۔ بالدے نے مختلف اور متضاد رائیں دی ہیں اور اسی بناء پر بلی نے اس پر غیر مستقل مزاجی کا الزام لگایا ہے اور وہ (لاطینی میں) کہتا ہے کہ "بالدے تو ہر ایک معاملے میں غیر مستقل مزاج ہی ہوتا ہے......"۔ بلی کی رائے یہ ہے کہ عارضی صلح کے اختتام پر کسی نئے اعلان جنگ کی ضرورت نہیں کیونکہ (لاطینی میں) "عارضی صلح ختم ہوجائے تو ہم مکرر اسی کام میں داخل ہوجاتے ہیں جو ملتوی کر دیا گیا تھا"۔[1]

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ عیسائیوں کے ساتھ ترک کبھی مستقل صلح نہیں کیا کرتے تھے بلکہ صرف عارضی صلح، جو ایک مولف کی رائے کے مطابق صرف جنگ کی تیاری کہی جاسکتی ہے۔

ہم اوپر ان بربری رواجوں کا ذکر کرچکے ہیں جو جنگ کے متعلق پائے جاتے تھے۔ زہر میں بجھے ہوئے ہتیاروں کا استعمال شاذ ہی ہوتا ہے۔ لیکن بہرحال اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ رچرڈ شیردل کی موت ایک زہر میں بجھے ہوئے تیر ہی کے باعث ہوئی تھی۔ ۱۵۶۳ء میں وارک کے آل بُرواز کی موت اس زخم سے ہوئی تھی جو ایک زہر آلود گولی کے لگنے سے پیدا ہوا تھا۔ اور ریال نے ڈتو نامی مورخ کے حوالے سے، بیان کیا ہے کہ جب تک

---

[1] بلی کی لاطینی تالیف "فوجی مسائل اور جنگ کے متعلق رسالہ" حصہ پنجم عنوان سوم۔

قرابین (بندوق) کا رواج نہیں ہوا تھا اور تیر کمان ہی سب سے اہم ہتیار رہے، تو اسپینیوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ تیروں کو زہر میں بجھا دیا کریں[1]۔

پانی کے کنوؤں میں زہر ملا دینے کا بھی اسی طرح ذکر کیا جاتا ہے۔ جب ۱۲۱۸ء میں شہر بورگیس کا محاصرہ کیا گیا تھا تو اس کا ذکر کرتے ہوئے مونسترلے بیان کرتا ہے کہ "جب بڑی پیاس کی وجہ سے ان کنوؤں میں سے پانی کھینچتے جو شہر کے مضافات میں تھے، تو اس کا پینے والا فوراً ہی مرجاتا۔ اور معلوم ہوا کہ بدمعاشی اور فریب کیا گیا تھا...... بعد میں حریفوں نے تصدیق کی کہ یہ الزام صحیح تھا کہ مذکورہ کنوؤں میں انھوں نے ایک بوٹی ڈالدی تھی...... اور یہ اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ مرجائیں[2]۔"

شتی یوں کے جاگیردار میشل داں بوانز نے "خوش قسمت غلام" کے نام سے فرانسیسی میں چند کتابیں سولھویں صدی میں تالیف کی تھیں۔ ان میں سے "سپاہیوں کا ہدایت نامہ" نامی فرانسیسی رسالے میں اس نے فن جنگ سے بحث کی ہے اور وہ پوری طرح تسلیم کرتا ہے کہ دشمن کے پانیوں کو بند کردیا جاسکتا ہے، ان میں مضر چیزیں ڈالی جاسکتی ہیں، نشہ آور چیزیں ملائی جاسکتی ہیں اور زہر ڈالا جاسکتا ہے[3]۔

البیری جنتی لیس یہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ بالدے کی اس رائے کی تردید کرے کہ دشمن کو زہر دے کر مار سکنا اور پانیوں میں زہر ملا سکنا جائز ہے۔ خود جنتی لیس نے ناجائز کارروائیوں کی ایک عجیب مثال بیان کی ہے جو اسپینیوں اور فرانسیسیوں کی لڑائی کے

---

[1] ریال دکوربان کی فرانسیسی تالیف "علم حکمرانی" جلد (۵) ص ۴۴۱۔

[2] مونسترلے کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" کتاب اول باب (۹۹)

[3] میشل داں بوانز کی فرانسیسی تالیف "سپاہیوں کا ہدایت نامہ" مطبوعہ ۱۵۴۳ء۔

زمانے میں اٹلی میں پیش آئی تھی[1]۔

شہروں کو تباہ کرنے اور جلانے کے متعلق ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں جہاں تک اصول کا تعلق ہے، بلّی نے اسے مردود ٹھیرایا اور نادرست قرار دیا ہے اور وہ (لاطینی میں) کہتا ہے کہ: "شہروں کو ہرگز نہیں لوٹنا چاہیے بجز شدید ضرورت کے۔ اور صرف تمام آبادی یا اس کے اکثر حصے کے سازش کرنے پر ہی احترام شکنی کی جاسکتی ہے[2]"۔ لیکن پھر بھی یہ تسلیم کیا جاتا رہا جب کسی شہر پر بزور قبضہ کیا جائے تو اسے فاتح سپاہی اپنے سپہ سالار کی مرضی سے چند گھنٹوں تک لوٹ سکتے ہیں[3]۔ ایسے شہر کو معاوضہ دیکر لوٹ سے بچایا جاسکتا ہے۔ پندرھویں صدی کی جنگوں میں ہتیار ڈالنے اور اطاعت کرنے کے لیے جو معاہدے ہوتے تھے ان میں عموماً یہ فقرہ ہوتا تھا کہ شہر کی محافظ فوج کی جان بخشی کی جائے گی اور وہ ایک سفید ڈنڈا اپنے ہاتھ میں لے کر وہاں سے چلی جاسکے گی یعنی وہ کوئی اور چیز اپنے ساتھ نہیں لے جاسکی گی سوائے اس لباس کے جو وہ پہنے ہوئے ہو، یا زاد راہ کے لیے پانچ سے دس "اے کو" (سکوں) کے جو فی کس ساتھ رکھ سکے گا۔ عورتوں کو اپنے لباس اور زیوروں کے ساتھ لے جانے کا حق ہوتا تھا[4]۔ ان بربری رواجات سے ہمارے مولف کو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ان کے جواز کے لیے صرف یہ چیز پیش کی جاتی تھی کہ انسانیت کے ضمیر نے جنگ کی نوعیت کے متعلق وہی تصورات قائم کر لیے ہیں۔ حقیقت میں کبھی تو اعلان جنگ کے متعلق یہ

---

[1] جنتی لیس کی لاطینی تالیف "قانون جنگ" کتاب دوم باب ششم۔
[2] بلّی کی لاطینی تالیف "فوجی مسائل اور جنگ کے متعلق رسالہ" حصہ چہارم عنوان (۸)
[3] ریال دِکوربال کی فرانسیسی تالیف "علم حکمرانی" جلد (۵) ص ۲۵۴
[4] ان دِبوے ای کی فرانسیسی تالیف "نو مجربجے پر کامی فاقر کا دیباچہ" ص ۱۶۴۔

تصور کیا جاتا کہ وہ ایک حکمنامۂ موت ہے جو ایک حکمران نے دوسرے حکمران کی پوری رعایا کے خلاف صادر کیا ہے اور کبھی جنگ کو ایک واقعی عدالتی فیصلہ تصور کیا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا کہ مفتوح ہی ملزم تھا۔ ان دونوں تصوروں میں سے اول الذکر کے تحت فریقِ ثانی کے خلاف ہر ایک چیز جائز تھی حتیٰ کہ دشمن سردار کے سر کے لیے قیمت مقرر کی جاسکتی تھی اور آخرالذکر کے تحت فاتح کو مفتوح کے متعلق زندگی اور موت کا اختیار حاصل ہوتا۔

بعض وقت سیاسی الجھنوں کے باعث کسی قدر انسانیت آمیز برتاؤ بھی کیا جاتا۔ چنانچہ ۱۴۵۱ء میں شہر بورڈو نے ساتویں شارل کے سامنے اپنے دروازے کھول دیے۔ یہ شہر انگریزوں کی وجہ سے دولتمند ہوگیا تھا اور وہاں کے معززین انگلستان کے طرفدار تھے۔ بادشاہ نے اس کا انتظام احتیاط سے کرنا چاہا۔ چنانچہ نہ صرف یہاں بلکہ گاس کنی کے دوسرے شہروں سے بھی کسی محصول کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اور جو لوگ فرانسسی بن کر رہنا نہیں چاہتے تھے انھیں چلے جانے کی اجازت دی گئی۔ تاجروں کو چھ مہینے کی مہلت دی گئی کہ اپنے معاملات ٹھیک کرلیں۔ اور جاگیرداروں نے اپنی جاگیریں اپنے بچوں کے نام منتقل کردیں۔ ہمارے اچھے اور بڑے مولف بیش لے نے اس کے متعلق بیان کیا ہے کہ "ایسی نرم اور رحمدلانہ جنگ کی کوئی اور مثال نہیں ملتی"۔

جدید قانونِ بین الممالک کی ایک نہایت اہم ترقی اس امر پر مشتمل ہے کہ ناطرفداروں کے فرائض معین کیے گئے۔ ہمارے زمانے میں ان پر یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ اگر حربیوں میں سے کوئی ایک بھی ناطرفدار سرزمین پر دوسرے حربی کے خلاف کسی مخاصمانہ کارروائی کی کوشش کرے تو یہ اس میں آڑے آئیں۔ ان پر یہ فریضہ بھی عاید کیا گیا ہے کہ ہر اس کام سے باز رہیں جس کے باعث

222

ناطرفدار سرزمین کے باہر کسی بھی حربی کو فوجی کارروائیاں کرنے میں زحمت پیش آئے۔ نیز ان پر یہ بھی فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ ہر دو حربیوں سے اپنے تعلقات میں پوری طرح غیر جنبہ دار رہیں اور ہر ایسے کام سے باز رہیں جس سے کسی ایک حربی کو دوسرے کے خلاف کوئی امداد و اعانت حاصل ہو۔ اور اس کو کوئی اہمیت نہیں کہ انھوں نے فریقین میں سے ایک کو وہی مدد پیش کی ہے جو وہ دوسرے فریق کو دے چکے ہیں۔

قرون متوسطہ میں ناطرفداروں کے واجبات معین نہیں تھے۔ پھر بھی پندرھویں اور سولھویں صدی میں چند نظریے ترقی کرنے لگے۔ چنانچہ پوپ نے اپنے اعلانوں کے ذریعے سے اپنی رعایا کو اس کی ممانعت کی کہ بیرونی ممالک میں جاکر وہ ملازمت اختیار کریں۔ اسی طرح وینس نے یہ نظیر چھوڑی ہے کہ فرانس کے حکمران کو نہ چھیڑنے کے لیے اپنے جہازوں کے تمام مالکوں کو اس بات کی ممانعت کرے کہ اسپین کے لیے کرایے پر کوئی خدمت بجالائیں۔[1] اسی اثنا میں ساتھ ہی یہ نظر آتا ہے کہ جنگ میں جو لوگ کسی کا ساتھ نہ دیتے، اور فریقین جنگ میں سے کسی کی بھی جنبہ داری نہیں کرنی چاہتے، ان کو اس کی اجازت ہوتی کہ اپنی مرضی پر اور جنگ میں گھسیٹ لیے جانے کا خطرہ مول لیے بغیر، فریقین میں سے کسی ایک کو امداد اور افواج مہیا کریں۔ اور یہ چیز دکھائی دیتی ہے کہ ایک ہی قوم فریقین جنگ میں سے ہر ایک کے ساتھ دوستی اور حلیفی رکھتی ہے مگر ساتھ ہی اس کی رعایا فریقین کی فوجوں میں کرایے کے ٹٹوؤں کی طرح بھرتی ہوتی ہے۔

اس کا رواج تھا کہ مختلف حکمران سالانہ کوئی معین رقم کے

۱۔ ہیفٹر کی فرانسیسی تالیف "یورپ کا قانون بین الممالک" ف ۱۴۶۔

۲۔ موڈ لاکلا فییر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱)، ص ۱۹۷۔

معاوضے میں اس کا اقرار کریں کہ کسی دوسرے حکمران کے لیے فوجوں کی ایک معینہ تعداد تیار رکھیں گے۔ خود اٹھارھویں صدی میں امدادی رقوم کے ایسے معاہدے ہوتے نظر آتے ہیں جن میں یہ امر طے ہوا تھا کہ ابتدائی فوجی بھرتی کے لیے کتنی رقم ادا کی جائے، رنگروٹوں کے لیے کتنی، ہلاک شدہ لوگوں کے لیے کتنی، اور وطن واپسی کے کرایے کے لیے کتنی۔ سوئستان کے خود مختار صوبوں (کانٹونوں) سے جو معاہدے طے ہوئے تھے، وہ کافی معروف ہیں۔ ان نظائر کے علاوہ ایک ملک کی فوجیں بارہا کسی جنگ میں حصہ لیتیں، بغیر اس کے کہ ان کے اپنے ملک اور اس ملک کی جس کے خلاف یہ جنگ میں حصہ لیتی ہیں باہمی حالت صلح ختم ہوجائے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب نشیبستان (ہالینڈ) نے ہسپانی تسلط کے خلاف بغاوت کی تھی۔ چنانچہ انگریزی فوج کے دستے صوبجات متحدہ کی نئی جمہوریت کی مدد کرتے رہے۔ چوتھے ہنری نے رجمنٹوں کی رجمنٹیں اس آخرالذکر مملکت کی خدمت کے لیے بھجوادی تھیں۔ تیس برس والی جنگ میں ہاملٹن کے مارکوئیس نے چھے ہزار اسکاٹ لینڈ والوں کو ساتھ لے کر شہنشاہی فوجوں سے مقابلہ کیا تھا۔ ان مختلف واقعات کی موجودگی میں انگلستان اور فرانس برابر یہ دعویٰ کرتے رہے کہ وہ ان جھگڑوں میں پڑنا بالکل نہیں چاہتے جو رونما تھے۔ ناطرفداری کا تصور کتنا زیادہ غیر ترقی یافتہ تھا، اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ بہت دنوں تک ایسے معاہدے کیے جاتے رہے جن میں دستخط کنندوں نے یہ اقرار کیا تھا کہ ایک دوسرے کے خلاف نہ تو لڑائیاں کھڑی کریں گے اور نہ کسی تیسرے کو مدد دیں گے اگر وہ ان میں سے کسی ایک سے جنگ کرے۔ گویا ناطرفدار رہنا اس امر پر منحصر تھا کہ صراحت کے ساتھ اس کا اقرار کیا جائے، ورنہ بطور قاعدہ تو دخل دہی جائز تھی۔

کوئی طاقتور حکمران بعض صورتوں میں اپنے کسی کمزور ہمسایے کو ناطرفداری کے منشور عطا کرتا۔ چنانچہ ۱۵۴۲ء میں فرانسوا نے اس طرح کے منشور کامبرے کو عطا کیے تھے۔ اس دستاویز میں لکھا تھا کہ کامبرے کی اسقفی، وہاں کی کونٹی، اور علاقہ ناطرفدار ہیں اور رہیں گے اور وہ فریقین (جنگ) میں سے کسی کو بھی راست یا بالواسط کوئی مدد، رقم، رسد، ہتیار، کوئی اور چیزیں، پناہ، رعایت، مشورہ، سہولت یا امداد نہ تو خود دیں گے نہ دلوائیں گے۔ اس طرح فریق ثانی کے لوگوں کو قلعے میں نہیں رکھ سکیں گے"۔

یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا کوئی ناطرفدار کسی فوجی جماعت یا ہتیاروں کی ارسالی کے لیے اپنی سرزمین سے گزرنے کی اجازت دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب کبھی تو اثبات میں دیا جاتا رہا اور کبھی نفی میں۔ اس معاملے میں کوئی چیز معین نہیں تھی۔ اونورے بونے کا بیان تھا کہ "تحریری قانون کے مطابق" فریقین جنگ میں سے کسی کو بھی نہیں چاہیے کہ کسی حکمران کی سرزمین پر سے ہتیار یا دیگر سامان لے جائے، جب تک کہ وہ اجازت نہ دے۔ لیکن ہر حال کسی حکمران کو جنگ کرنے کے سلسلے میں یہ حق ہوتا ہے کہ درمیانی علاقوں میں سے گزرنے اور کھانے پینے کی چیزیں حاصل کرنے کا مطالبہ کر سکے بشرطیکہ گزر پُر امن ہو، اخراجات ادا کیے جائیں اور جو مفادات متاثر ہوں ان کی تلافی کریں۔ اور وہ یہ کہتا ہے کہ "کسی نقصان رسانی کا ارتکاب کیے بغیر ہر طرح گزر سکنا قانون اور فطری دوستی کا عطیہ ہے"۔

اس بارے میں بہت کم چیزیں تالیف ہوئی ہیں سولھویں صدی عیسوی کے آغاز پر ژاں بوتے روئے اطالوی زبان میں "ناطرفداری پر مقالہ" تالیف کیا جس میں وہ کوئی بارہ صفحوں میں ناطرفداری کے فوائد اور نقصانات کی تفصیل کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کے اعلان کو

22

فریقین جنگ میں سے کسی ایک کے لیے کس قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔
سنہ ۱۶۲۰ء میں راس لا کے یوحان دِ لہلم نائے مایر نے جرمن زبان میں ایک کتاب شایع کی جس کا نام "ناطرفداری اور اعانت یا اوقات جنگ میں غیر جنبہ داری اور جنبہ داری" تھا۔ بوہیمیا میں جو جنگ چھڑ گئی تھی اور جس کے باعث جرمن حکمرانوں کے لیے ایک دشوار صورت حال پیدا ہوگئی تھی، اس نے اس مولف کو اس امر پر آمادہ کیا تھا کہ ناطرفداری کی ضرورت اور دخل دہی کے فوائد پر مقالات کا ایک سلسلہ تالیف کرے۔ سنہ ۱۶۲۲ء میں بے زولد نے اسی موضوع پر ایک سطحی بحث ایک لاطینی رسالے میں کی جس کا نام "حلیفیوں کے حقوق پر سیاسی و قانونی بحث اور حمایت و محمیت نیز غیر جنبہ داری کی امتیازی خصوصیت کے متعلق مقالہ" تھا۔

چند خصوصی نظریے ترقی پاتے ہیں۔ ان کا تعلق جنگ کے ممنوعہ اسباب، ناکہ بندی، معائنے اور جھڑتی کے حق اور ناطرفداریوں کی تجارت سے تھا۔[1]

ایک حد تک ہم جنگ کے ممنوعہ اسباب کو شہنشاہی قوانین اور قانون مذہبی کے احکام کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں۔ متعدد رومی قوانین میں اس کی ممانعت کی گئی تھی کہ بربریوں کو ہتھیار اور کھانے پینے کی چیزیں بیچی جائیں۔ سنہ ۱۱۸۰ء کے ایک مذہبی حکمنامے میں بھی اسی قسم کی ممانعتیں صادر کی گئی تھیں اور کلیسا نے ان عیسائیوں کے خلاف سخت سے سخت سزائیں مقرر کیں جو مسلمانوں کو غلہ، لکڑی، اسباب جنگ اور ہتھیار مہیا کریں۔[2]

---

[1] نیس کی فرانسیسی تالیف "بحری جنگ، قانون بین الممالک کے نقطۂ نظر سے تبصرہ" مطبوعہ سنہ ۱۸۸۱ء

[2] ممنوعہ اسباب جنگ کے لیے یورپی زبانوں میں "کونترا بانڈ" کی جو اصطلاح برتی جاتی ہے

دسویں صدی میں ثے نیس والے مسلمانوں کے ساتھ اہم تجارتی کاروبار رکھتے تھے اور وہ ان کو ہتیار اور جہازی تعمیر کی لکڑیاں مہیا کرتے تھے۔ خانوادۂ باسل کے جنگجو شہنشاہ جو ایشیائے کوچک، شام اور اِقریطش (کریٹ) میں جانبازی کے ساتھ مسلمانوں کی حملہ آور طاقت سے لڑ رہے تھے، وہ اس پر شکایت کرنے لگے۔ ۹۷۱ء میں شہنشاہ ژان زِیمی شِس نے ثے نیس کے دوجے (سرحاس) کے ہاں سفیر بھیجے اور دھمکی دی کہ جہاں کہیں وہ اس تجارتی کاروبار میں مستعمل ہونے والے جہازوں سے دوچار ہوگا وہ ان کو آگ لگا دے گا۔ دوجے نے مسلمانوں کے ہاتھ ہتیار بیچنے اور تعمیرات یا جہاز سازی میں کام آنے والی لکڑیوں کی فراہمی کی ممانعت صادر کی اور خلاف ورزی کرنے والے کے لیے ایک سخت جرمانہ مقرر کیا اور جو لوگ یہ جرمانہ ادا نہ کرسکیں ان کے لیے سزائے موت مقرر کی۔ اس سے صرف کُم اور سفیدے کی لکڑی کے ایسے تختے جو پانچ قدم لمبے ہوں نیز لکڑی کے برتن مستثنیٰ رکھے گئے[1]۔

بعد میں صلیبی جنگوں کے زمانے میں کاروبار اور نفع اندوزی کی ذہنیت نے عیسائی تاجروں کو اس پر آمادہ کیا کہ مسلمانوں کو جہازی تعمیر کی لکڑیاں، قطِران (ڈانبر)، دھاتیں اور ہتیار فراہم کیا کریں۔ ثے نیس، جے نوا اور پیزا کے لوگ صلیب کے دشمنوں کو مدد دینے کے لیے اس بارے میں خوشی خوشی محنت اٹھاتے تھے۔ عمومی مجالس شورائے مذہبی اس پر اظہار غیظ و غضب کرنے لگیں۔ جو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ وہ غالباً اس کی ممانعت کے سلسلے میں سزا مقرر کرتے ہوئے جو لاطینی جملہ استعمال ہوا تھا اسی سے ماخوذ ہے کہ (کونترا بانم مرکیس بانوِ انتر دکما)۔

[1] ہائیڈ کی کتاب "قرون متوسطہ میں مشرق قریبہ کی تجارت" کا فرانسیسی ترجمہ از رے نو جلد (۱)، ص ۱۱۳۔

کوئی مسلمانوں کے ہاتھ لوہا یا ہتھیار، جہازی تعمیر کی لکڑیاں یا مکمل طور سے تعمیر شدہ جہاز بیچے اور اسی طرح جو کوئی غیر مسلموں کے ہاں جہازوں کے کپتان (ربّان) یا رہنما کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرے تو اسے جات باہر کردیا جاتا اور اس سزا پر اس کی جائداد کی ضبطی اور اس کی آزادی کے خاتمے کا بھی اضافہ ہوجاتا۔[1] چنانچہ اس ملزم کو جو کوئی موقع پاتا، گرفتار کرکے غلام بنالے سکتا۔

پوپوں نے باضابطہ تنبیہیں جاری کیں۔ تیسرے اِنوسنٹ نے تی نیس والوں کو مخاطب کیا۔ دسویں گرے گری نے جے نوا اور موں پے لیے کے شہریوں کو خط لکھا۔ نفع اندوزی کی یہ غیر معتدل چاہت، جو عیسائیوں کی بدنامی کا باعث ہورہی تھی، وہ مسلمانوں کے لیے ایک طنز کا باعث بن گئی!

اطالوی شہروں نے ان افعال کے خلاف، جن سے عیسائیت کو نقصان پہنچے، تدبیریں اختیار کرنی شروع کیں۔ چنانچہ جے نوا تی نیس اور پیزا میں احکام صادر ہوئے۔ یہ بھی نظر آیا کہ آراگون کے بادشاہ جے نوا اور موں پے لیے کے باشندوں پر ان کا اطلاق کرنے لگے۔ لیکن پھر بھی اس کی تجارت گھٹی نہیں اور پیزا والے مصر کے حکمرانوں سے معاہدے کرکے یہ اقرار کرتے رہے کہ جہازی تعمیر کا سامان اور ہتھیار وہ لا پہنچاتے رہیں گے۔

رومی شہنشاہوں اور مجالس شورائے مذہبی کی ممانعتیں شہریوں اور ایمان والوں کو مخاطب کرکے صادر ہوتی رہیں۔ جنگ کے اسباب ممنوعہ کا جو قانون ترقی کرتا رہا، اس میں پابندی صرف ناطرفدار پر عائد کی گئی اور خود ناطرفداری میں یہ پابندی مضمر سمجھی جانے لگی۔ دو مملکتوں میں جنگ ہورہی ہو تو وہ قومیں جو پر امن

[1] ۔ ایضاً ص ۲۳۶۔

ملتے ہیں۔ چنانچہ ۱۶۰۴ء میں جو معاہدہ اسپین کے تیسرے فلپ
اور آرک ڈیوک البرٹ اور ایزابیلا اور انگلستان کے پہلے جیمس
میں طے ہوا تھا، اس میں اور اس معاہدے میں جو تقریباً اسی
زمانے میں صوبجات متحدہ اور سویڈن میں طے ہوا تھا، ایسی چند
چیزوں کی تفصیل دی گئی ہے جن کے حمل و نقل کو ممنوع قرار
دیا گیا تھا۔ ۱۶۲۵ء میں جنگ کے ممنوعہ اسباب سے متعلق ایک
حکمنامے کے اطلاق کے سلسلے میں بیرگ سینٹ دی ٹوک کی
امارت بحریہ کی کونسل نے اپنے افسران اعلیٰ سے بعض امور پر
استصواب کیا تھا۔ آں برواز اِشپینولا نے اس کا جواب دیا تھا
کہ "تم اپنے صادر کیے جانے والے فیصلے میں ممنوعہ اشیاء کے اندر
کھانے پینے کی چیزیں، دوائیں اور تمباکو شامل کر سکتے اور ان کو
قابل ضبطی قرار دے سکتے ہو۔"[1] چارلس اول کا اعلان مورخہ ۴ مارچ
۱۶۲۶ء معاہدہ ساؤتھ ہامپٹن کے معاہدے (بابت ۱۶۲۵ء) کے
نتیجے کے طور پر جاری ہوا تھا۔ یہ اس سے بھی آگے جاتا ہے اور
ان چیزوں کی فہرست دیتا ہے جو اس نام کے تحت آنے والی
سمجھی جائیں گی۔ اس زمانے سے جو جو بین الممالک معاہدے یا
خصوصی انتظامات عمل میں آتے رہے، ان میں برابر اس کی کوشش
رہی کہ ممنوعہ اسباب جنگ کی فہرست کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں
چاہے ان میں اس انتہا پسندانہ امر کی کوشش نہ کی گئی ہو کہ
دشمن سے ہر قسم کی تجارت ممنوع قرار دیں۔

227

جہاں تک نظریے کا تعلق ہے جنٹی لیس نے اس رائے کی
تائید کی تھی کہ تجارت کرنے کا حق تو منصفانہ ہے لیکن اس حق
کو باقی رکھنے کی مخالفت کا حق اس سے بھی زیادہ منصفانہ ہے۔

۱۔ بروسیل کے کتب خانۂ شاہی کا مخطوطہ نمبر (۱۷۴۱۳)

اور مسالمانہ حالت میں تماشہ بینی کرتی رہیں، ان کو یہ حق ہوگا کہ ہر دو حربیوں سے اپنے ان تجارتی تعلقات کو برقرار رکھیں جو سابق سے چلے آرہے ہوں۔ لیکن اگر ان کی حکمت ناطرفدار ہو تو اسی حیثیت ہی کے باعث ان کو ایک بات سے باز رہنا چاہیے۔ اور وہ یہ کہ حربیوں میں سے کسی ایک کو ایسی چیزیں فراہم کریں جن سے وہ اپنے حریف کو نقصان پہنچانے میں مدد لے سکے۔ تیرھویں صدی میں اس کا رواج ہوگیا کہ جنگ کے آغاز پر ایسے اعلانات جاری کردیے جائیں جن میں تمام جہازوں کو اس کی ممانعت کی جائے کہ دشمن کو کھانے پینے کی چیزیں یا کسی بھی قسم کا اسباب جنگ پہنچایا جائے۔ اور خلاف ورزی کی صورت میں ضبطی کی سزا مقرر کی گئی۔ اس طرح کا ایک اعلان ۱۲۲۳ء میں تیسرے ہنری نے جاری کیا تھا۔ ۱۳۱۵ء اور ۱۳۳۷ء میں جو انگریزی حکمنامے جاری ہوئے تھے ان میں اجنبی تاجروں کو اسکاٹ لینڈ والوں سے تجارت کی ممانعت کی گئی تھی۔ اور خلاف ورزی کی صورت میں ان کی تمام رعایتیں ختم کرنے کی سزا مقرر کی گئی تھی۔ یہاں تک نظر آتا ہے کہ کسی ایک حکمران کے دوست اس کے دشمنوں سے دوران جنگ میں ہر قسم کے تجارتی کاروبار سے دست بردار ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک مثال اس معاہدے میں ملتی ہے جو ۱۳۷۰ء میں تیسرے ایڈورڈ اور فلانڈرس والوں میں طے ہوا تھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر یہ نظر آتا ہے کہ مملکتوں نے عام طور سے اس پر اکتفا کی کہ چند قسم کے اشیاء کی حمل و نقل ممنوع قرار دیدیں۔

ایسے بھی معاہدے طے ہونے لگے جن میں خاص کر ممنوعہ اشیاء کی فہرست دی جائے، بجائے اس کے کہ سابق کی طرح ان کو مبہم ممانعت کی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ ایسے معاہدے سترھویں صدی عیسوی میں

یہ گویا ممنوعہ اسباب جنگ کے بارے میں ہر قسم کے مبالغہ آمیز مطالبوں کو جائز قرار دینا تھا۔ گروتیوس نے تو یہ خطرناک امتیاز پیدا کیا کہ بعض چیزیں دُہرے استعمال کی ہوتی ہیں اور نہ صرف جنگ میں کام آتی ہیں بلکہ حالت امن میں بھی۔ بے شبہہ اس کی رائے میں وہ چیزیں جو محض فوجی استعمال کی ہوں انھیں ممنوعہ اسباب جنگ قرار دے کر ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ حربیوں کو یہ حق دیدینا خطرناک امر تھا کہ اس امر کا فیصلہ خود وہ کریں کہ اس قسم کی نام نہاد دُہرے استعمال کی چیزوں میں سے کونسی ممنوع یا غیر ممنوع قرار دی جائے۔

ممنوعہ اسباب جنگ کے حمل ونقل پر مختلف طور سے سزا دی جانے لگی۔ چند ممالک تو اس پر اکتفا کرنے لگے کہ مالیت ادا کر کے ممنوعہ اسباب ضبط کرلیں۔ بعض دوسری مملکتیں ناجائز اسباب کو سیدھے صاف طور سے ضبط کرنے لگیں۔ اور بعض ایسی بھی مملکتیں تھیں جو بعض صورتوں میں مزید برآں نہ صرف جہاز کو بلکہ جہاز کے باقی بے ضرر وغیر ممنوعہ اسباب کو بھی ضبط کر لیتی تھیں۔ اس بارے میں جس نظریے کا اطلاق ہونے لگا تھا وہ قانون کے شرح نویسوں کا مرہون منت تھا۔

ان ممتاز اساتذہ نے قانون کی ترقی میں عام طور پر اور تصادم قوانین یا خصوصی قانون بین الاقوام میں خاص کر جو اثر ڈالا ہے، اس سے سب لوگ واقف ہیں۔ بحری قانون بین الممالک کے وہ قاعدے جو سزاؤں کے متعلق ہیں ان کے سلسلے میں بھی ان کا حصہ بہت اہم رہا ہے۔ قانون روما اور اپنے شہروں کے مالیاتی ضابطوں کے متعلق ان لوگوں نے جو نتائج استنباط کیے تھے، ان میں سے متعدد کو اطالوی جمہوریتوں کے دائرے کے باہر بھی قبولیت

حاصل ہوگئی۔ یہ اس وقت بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے جب یہ سوچا جائے کہ شئے نیس، جے نو، پیزا، فلارنس، ایک طرف تو تجارت کے طاقتور مرکز تھے تو ساتھ ہی چینو، بارتولے، بالدے اور ان کے شاگرد عرصۂ دراز تک علم قانون کے اہم منبع بنے رہے[1]۔

جو جہاز دشمن کی بندرگاہوں سے کاروبار کر رہے ہوں ان کو روکنے اور گرفتار کرنے کا رواج اتنا ہی پرانا ہے جتنا بحری جنگ اور ہر زمانے میں اس کی حاجت اس لیے لاحق ہوتی رہی کہ وہ ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ لیکن جس طور سے اسے عمل میں لایا جاتا تھا وہ محض زبردستی سمجھی جاتی تھی۔ آخر سولھویں صدی میں کہیں یہ ممکن ہوا کہ اسے قانون بین الممالک کے قاعدے کے طور پر استحکام حاصل ہو[2]۔

جن احکام کے ذریعے سے غیر حربی قوموں کو دشمن کے ساتھ تجارتی کاروبار کی ممانعت کی جاتی تھی ان میں ناکہ بندی کے نظریے کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ انگلستان کے بادشاہ تیسرے ایڈورڈ نے فرانس سے جنگ کے وقت ایک فرمان شایع کیا جس میں یہ حکم تھا کہ ہر وہ اجنبی جہاز جو کسی فرانسیسی بندرگاہ میں داخل ہونے کی کوشش کرے، اسے گرفتار کرلیا اور جلا دیا جائے گا۔ اس کے معنے یہ تھے کہ ایک حکمنامے کے ذریعے سے ایک پوری سلطنت کو ناکہ بندی کی حالت کے تحت لا لیا جائے۔

یہ نظریہ اتنا زیادہ آرام دہ تھا کہ اس کی تقلید ہوئے بغیر

۱۔ فلیسی کی ولندیزی کتاب "قانون بین الممالک کا قاعدہ کہ جہاز کی حیثیت سرزمین کی سی ہے"، ص ۴۳۔

۲۔ بارگریٹ ڈین کی انگریزی کتاب "ناکہ بندی کا قانون، اس کی تاریخ حالت موجودہ اور اغلب مستقبل"

نہ رہ سکی ۔ اگرچہ تجارتی شہروں نے احتجاج کیے خاص کر "ہانزیاتی" علیفی والے شہروں نے ۔ لیکن پھر بھی قریب قریب تمام بحری جنگوں میں اس کا اطلاق کیا گیا ۔ سویڈن نے ۱۵۶۰ء میں اس سے اس وقت استفادہ کیا جب وہ روس سے لڑ رہا تھا ۔ اور جب دوسرے فلپ کے اقتدار کے خلاف بغاوت ہوئی تو ہالینڈ کے ہر سہ طبقات رعایا کے نمایندوں نے اعلان کیا کہ فلانڈرس کی ان تمام بندرگاہوں کی، جن پر اس وقت تک اسپینیوں کا تسلط تھا، ناکہ بندی کردی گئی ہے، اگرچیکہ ان بندرگاہوں کے اطراف کسی طرح کا بھی گھیرا نہیں ڈالا گیا تھا ۔ ایک ابتدائی حکمنامہ ۱۵۸۴ء میں شایع کیا گیا ۔ اور ۴ اپریل و ۴ اگسٹ ۱۵۸۶ء نیز ۹ اگسٹ ۱۶۲۲ء اور ۱۲ مارچ ۱۶۲۴ء کے فرامین کے ذریعے سے اس ممانعت کی تجدید کی گئی ۔ اور ۲۶ جون ۱۶۳۰ء کے فرمان نے ناکہ بندی کے متعلق جو اصول قرار دیے اور جن افعال کو اس ناکہ بندی کی خلاف ورزی قرار دیا، وہ جہاں صاف اور واضح تھے، وہیں خطرناک بھی تھے۔

جو فرمان ۱۶۳۰ء میں نافذ ہوا، اس کی ترتیب و تدوین بندرگاہ ایمسٹرڈام کی عدالت امارت بحریہ اور دیگر ماہرترین قانون دانوں کے مشورے اور رائے سے عمل میں آئی تھی ۔ ناطرفداروں کے حقوق پر اس نے بھی اتنی ہی زیادہ دست درازی کی جتنی کہ ممکن تھی ۔ چنانچہ اس نے نہ صرف یہ حکم دیا کہ ان جہازوں اور جہازوں پر لدے ہوئے بار کو ضبط کرلیا جائے جن کے متعلق یہ کوشش کی جاچکی ہو کہ انھیں روکیں اور ان پر جاکر تفتیش و تحقیق کریں، بلکہ یہ کافی سمجھا گیا کہ جہاز کے کاغذوں سے اگر اس کا کوئی مماثل ارادہ پایا جائے، حتیٰ کہ اس صورت میں بھی جب کہ یہ امر یکساں ہو کہ وہ جہاز اپنی منزل مقصود سے ابھی اتنا دور ہے یا نہیں کہ جس سے یہ گمان کیا جاسکے کہ جہاز اپنی منزل مقصود بدل سکتا ہو ———

بہر صورت اسے ضبط کرلیا جا سکتا۔ اس فرمان نے مزید برآں یہ بھی حکم دیا کہ وہ ناطرفدار جہاز جو کسی ناکہ بندی کی ہوئی بندرگاہ میں داخل ہو جائیں، بغیر اس کے کہ انھیں روکا گیا ہو تو، ایسے جہاز بھی واپسی کے وقت گرفتاری کے مستوجب قرار دیے گئے تاآنکہ وہ کسی ناطرفدار بندرگاہ میں داخل نہ ہو گئے ہوں۔ ایک مرتبہ ایسے مامن کو پہنچ جانے کے بعد پھر وہ وہاں سے روانہ ہوتے تو اپنا سفر بے خرخشہ جاری رکھ سکتے بجز اس صورت کے کہ ناکہ بندی کرنے والی سلطنت کا کوئی جنگی جہاز جو اس کا پیچھا کرتا چلا آرہا تھا، وہ اپنی تاک میں لگا رہا ہو اور واپس نہ گیا ہو۔

یہ صحیح ہے کہ ان احکام کے ذریعے سے کوئی ایسی نئی چیز وجود میں نہیں لائی گئی جس پر اس وقت تک عمل نہ ہو گیا ہو۔ لیکن سنہ ۱۶۳۰ء کے فرمان نے ان رواجات کو مدوّن کر دیا جو مسلمہ ہو چکے تھے۔ اسی بناء پر فرضی ناکہ بندی یا کاغذی ناکہ بندی یا رسمی و دفتری ناکہ بندی کا نظریہ اسی زمانے سے ملنے لگتا ہے۔ اس نظریے میں فرض یہ کرلیا جاتا تھا کہ بندرگاہوں پر گھیرا ڈالدیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت حال تو یہ ہوتی کہ ایک سادہ اعلان کے ذریعے سے جملہ تجارتی کاروبار کو ممنوع قرار دیدیا جاتا [اور اس ممانعت کے نفاذ کے لیے کوئی تدبیر نہیں اختیار کی جاتی]۔

ناکہ بندی میں فرضی پن کا جو عنصر تھا، وہ بے انتہا خطرناک تھا۔ اسی لیے سترھویں صدی کے نصف دوم سے بعض تالیفوں میں اس کا مطالبہ کیا جانے لگا کہ ناکہ بندی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ واقعیت کی حامل ہو۔ سنہ ۱۶۹۳ء میں گروے نِنگ نے ایک لاطینی کتاب تالیف کی جس کا بڑا لمبا نام یہ تھا: "مقالہ اس امر کے متعلق کہ قانوناً مُسالم [جنگ میں حصہ نہ لینے والے، ناطرفدار] لوگ حربیوں سے کاروبار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح شمالی علاقوں کے لوگ گال (فرانس)

کے ساتھ جب کہ وہ باہم دوست ہوں تو وہ اس وقت آزادی کے ساتھ کاروبار کر سکتے ہیں جب کہ ان [آخر الذکر] اور انگریزوں اور ولندیزیوں میں جنگ ہو۔ اور اس امر کی قانون اقوام کے ذریعے سے توضیح و تائید"۔ اس نے زور و شور کے ساتھ برطانیہ اور صوبجات متحدہ کی سیاست پر تنقید کی کیونکہ اس کی رائے میں ان ممالک نے فرانس کے ساتھ تجارت کی عمومی ممانعت کا اعلان کر کے قانون بین الممالک کی خلاف ورزی کی تھی اور وہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ ڈنمارک اور سویڈن والوں کو تجارت کا پورا حق حاصل ہے۔

اگر ناکہ بندی کو جنگ کا کوئی جائز ذریعہ قرار دیا جائے تو ہر وہ شخص جو اس ناکہ بندی کو توڑنے کی کوشش کرے اسے ایک مخاصمانہ فعل کا مرتکب سمجھا جائے گا، اور اس کی حیثیت اس حربی ہی کی سی ہوگی جس کی بندرگاہ کی ناکہ بندی کی گئی ہو۔ حربیوں کے اس حق کی وسعت کتنی ہے اور اس حق کی خلاف ورزی سے کیا سزا لاحق ہوتی ہے؟ گروتیوس نے کوشش کی کہ اس کے متعلق ایک قاعدہ بیان کرے۔ چنانچہ اس کے مطابق اگر ناکہ بندی کی خلاف ورزی سے کوئی حقیقی نقصان پہنچا ہو تو خلاف ورزی کرنے والے پر یہ ذمہ داری عاید ہوگی کہ اس نقصان کی تلافی کرے۔ بنا بر آں ناکہ بندی کرنے والوں کو یہ حق ہوگا کہ اس نقصان کی تلافی کرانے کی غرض سے جہاز اور اس پر لدے ہوئے بار کو گرفتار کر لیں۔ نقصان کی تلافی کے ساتھ ساتھ گروتیوس نے ایک تعزیری کارروائی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ کارروائی اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ سلطنت جس کی ناکہ بندی کی گئی ہو بادی النظر میں غیر منصفانہ جنگ کر رہی ہو۔ یہ نظام مبہم ہے۔ بنکر شوئک نے اس کا تکملہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ

230 سزا کا مستوجب ہونے کے لیے ناکہ بندی کی خلاف ورزی کافی ہے اور اس سے بحث نہیں کہ نقصان پہنچا ہے یا نہیں۔ اور چونکہ ناکہ بندی کرنے والے کو ناکہ بندی کیے ہوئے مقام کی ضرورتوں کا جاننا نا ممکن ہوتا ہے، اس لیے یہ امر ممنوع قرار دیا گیا کہ کسی بھی قسم کے سامان تجارت کی درآمد کی جائے۔

اگر قانون بین الممالک یہ تسلیم کرتا ہے کہ حربیوں کے جنگی جہاز اپنے دشمن کے جہازوں کو گرفتار کر سکتے ہیں اور اس بات میں آڑے آسکتے ہیں کہ دشمن تک ممنوعہ اسباب جنگ تجارتی حمل ونقل کے ذریعے سے پہنچایا جائے، تو اسے یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ اس حق کے استعمال کی شرط یہ ہے کہ وہ ان تمام جہازوں کا معائنہ کر سکیں جو مختلف مملکتوں سے تعلق رکھتے ہوں بجز سرکاری جنگی جہازوں کے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ معائنے اور تفتیش کا حق خاصا پرانا ہے۔

کتاب "بحری قواعد" میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اور فرانس و انگلستان کے ابتدائی بحری قواعد و ضوابط نے اسی کو اختیار کر لیا تھا۔ پندرھویں صدی کے معاہدوں میں اس کو روا رکھا گیا ہے اور اس کے استعمال پر یہ حد عائد کی گئی ہے کہ زبانی اطلاع دے کر اس کی توثیق کے لیے قسم کھائی جائے۔ جو امیر البحر ۱۵۱۲ء میں گوی ینن کی مہم پر روانہ ہوا تھا، اس کو ہدایت دیتے ہوئے آٹھویں ہنری نے صراحت کے ساتھ یہ قاعدہ بھی بیان کیا تھا۔ لیکن بہرحال سترھویں صدی میں اسی قاعدے نے ایک معین صورت اختیار کی، اور ترقی کرنے لگا۔ چنانچہ ۱۶۲۵ء میں انگلستان نے ولندیزیوں اور ان کے حلیفوں سے جو معاہدہ کیا تھا، اس میں یہ طے ہوا تھا کہ ان دیگر سلطنتوں سے جو اسپین کی شان و شوکت کے پرخچے اڑانے سے دلچسپی رکھتی ہوں، یہ استدعا کی جائے گی کہ اسپینیوں کے ساتھ

ہر قسم کی تجارت روکدیں۔ اور اگر وہ انکار کریں تو ان ممالک کے جہازوں کا معائنہ کیا جایا کرے گا تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ کہیں وہ جنگ کا سازو سامان تو نہیں لے جا رہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ معائنے کی اکثر ایک پرجوش مخالفت ہوتی رہی ہے گروتیوس نے لکھا ہے کہ ورقیں کی صلح کے بعد ملکہ الزابتھ نے اسپین کے ساتھ اپنی جنگ جاری رکھی اور فرانس کے بادشاہ سے اس نے یہ استدعا کی کہ وہ اسے ان فرانسسی جہازوں کا معائنہ کروانے کی اجازت دے جو اسپین جاتے ہوں تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ کہیں وہ جنگ کا سازو سامان تو چھپا کر نہیں لے جا رہے ہیں۔ گروتیوس نے بیان کیا ہے کہ اس درخواست کو قبول نہیں کیا گیا۔ اور وجہ یہ بتائی گئی کہ اس سے لوٹ مار کی سرپرستی سی ہو گی اور تجارتی کاروبار میں حرج پیدا ہوگا۔ اس روایت کے صحیح ہونے سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ رڈمی نے بیان کیا ہے کہ الزابتھ نے ہرگز یہ خواہش نہیں کی تھی کہ فرانسسی جہازوں کا معائنہ کراسکنے کی اجازت دی جائے۔ بلکہ چوتھے ہنری کے محض گوارا کرلینے کی بنا پر ملکہ نے فرانسسی جہازوں کو اس کی اجازت دی تھی کہ اسپین آیا جایا کریں بشرطیکہ وہ یہ اقرار کریں کہ جنگ کا ساز و سامان نہیں لیجائیں گے۔ اور جب اس اجازت سے بیجا فائدہ اٹھانے کے بعض واقعات رونما ہوئے تو الزابتھ نے دربار فرانس کو اطلاع دی کہ وہ آیندہ اس طرز عمل کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

معائنے کے باعث خاصے ناگوار نتائج نکلنے لگے۔ ان کے علاج کے لیے یہ کوشش کی گئی کہ ناطرفدار اپنے ملک کے کسی جنگی جہاز کی حفاظت اور بدرقے میں سفر کریں۔ اور اگر جنگی جہاز کا افسر یہ اطمینان دلا دے کہ جملہ تجارتی جہاز ناطرفداروں کے ہیں اور ان پر

2

کسی قسم کا ممنوعہ اسباب جنگ لدا ہوا نہیں ہے تو اس اطمینان دہانی ہی کو معائنہ سمجھ لیا جاتا۔

بدرقے کا رواج خاصا پرانا ہے۔ ۱۳۵۳ء میں تیسرے ایڈورڈ نے ایک اہم تدبیر اختیار کی تھی۔ وہ یہ کہ گاسکنی جانے والے جہاز سوتھ ہامپٹن کے قریب چالس فرڈ میں بی بی مریمؑ کی ولادت کے دن جمع ہوا کریں اور پھر وہاں سے وہ سرکاری افسروں کے زیر ہدایت روانہ ہوا کریں۔ نشیبستان ہالینڈ میں تجارتی جہازوں کے لیے بدرقے مہیا کیے جاتے تھے۔ اور اگر بدرقہ ناکافی ہوتا تو بحری شہر بعض محاصل عائد کر کے خود ہی اپنے صرفے سے ضروری ہتھیار فراہم کر لیتے۔ چنانچہ اسی طرح سے ۱۵۵۱ء میں شہر ہروگیس نے ان مختلف جنگی جہازوں کو ہتھیار مہیا کیے جو تجارتی بیڑے کے ساتھ جانے والے تھے۔ اور تقریباً اسی زمانے میں نشیبستان ہالینڈ کی نگران حکومت یعنی آسٹریا کی ماری نے شہر آن ویر کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اس بندرگاہ سے روانہ ہونے والے جہازوں کی حفاظت کے لیے جو بدرقہ مامور ہو، اس کو مسلح کرنے کے مصارف کا ایک تہائی حصہ حکومت کی طرف سے ادا کروائے۔ جو اجازت نامہ ہائے سفر خود حربیوں سے حاصل کیے جاتے اور جن کی مہنگی قیمتیں تاجر ادا کیا کرتے، ان کا عام طور پر کم احترام ہوتا تھا۔

وے ٹن[1] نے بیان کیا ہے کہ قدیم زمانے میں ہر وہ قوم جو حلیف نہ ہوتی، اسے ایک دشمن تصور کر لیا جاتا تھا۔ اس کے یہ الفاظ قرون متوسطہ کے اکثر حصے پر بھی اسی طرح صادق آتے ہیں۔ جب صورت حال یہ تھی تو اس سے سب سے زیادہ تجارت ہی متاثر ہوئی۔ بہر حال بحری تعلقات کی ترقی سے کچھ بہتری

[1] وے ٹن کی انگریزی تالیف "قانون بین الممالک کے عناصر" مع حواشی ولیم بیچ لارنس ص ۶۹۷۔

پیدا ہوئی ۔ یہ ناممکن تھا کہ حربیوں کو ان قوموں کے جہازوں پر حملہ کرنے یا ان کو گرفتار کرنے کی اجازت دی جائے جو جنگ سے بے تعلق ہوں ۔ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں تجارت کے جو سب سے اہم مرکز تھے وہ وینیس، جے نوا، پیزا، فلارنس، مارسیلیا اور برشلونہ تھے ۔ اور دیگر مقاموں کو چھوڑ کر صرف ان اہم مرکزوں کی تجارت نے رواجات میں یکسانی پیدا کردی ۔ جو جنگیں ان شہروں میں آپس میں ہوتیں یا ان شہروں یا دیگر قوموں میں تو ان سے بھی ایسے قواعد پیدا ہونے لگے، جن کا عمومی اطلاق ہونے لگا ۔ حربیوں کو اپنے دشمن کے متعلق جو حقوق تھے، انھیں وضاحت کے ساتھ معین کیا گیا ۔ بحری رواجات کی اصطلاح میں "دوست" کے متعلق باضابطہ طور سے کلیے بننے لگے، جن سے حفاظت حاصل ہونے لگی[1] کتاب "بحری قواعد" میں بھی بیان ہوا ہے کہ یہ قواعد مسلمہ ہیں ۔

کتاب "بحری قواعد" بحری قوانین کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں ہے جسے کسی ایک یا زیادہ مملکتوں کی مجلس قانون ساز نے مرتب اور شایع کیا ہو[2] بلکہ یہ ایسے بحری رواجات کا مجموعہ ہے جو برشلونہ کی قنصلی عدالت نافذ کیا کرتی تھی ۔ اور یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان مسلمہ بحری رواجات کا خلاصہ ہے جن کو بحر متوسط کے مختلف ساحلی شہروں میں قبول کیا جاتا تھا ۔ بحری قنصل برشلونہ میں سنہ ۱۲۷۹ء سے مامور ہونے لگے تھے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] ۔ کاچے نوفسکی کی انگریزی تالیف "بحری غنیمت کا قانون، خاص کر حربیوں اور ناطرفداروں کے فرائض و رواجات کے حوالے سے" ص ۲۰ ۔

[2] ۔ پارڈیسو کی فرانسیسی تالیف "اٹھارھویں صدی سے پہلے کے بحری قوانین کا مجموعہ" جلد (۲)، باب (۱۲) ۔

یہ مجموعۂ قواعد بڑا پرانا ہے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۴۹۴ء میں چھپی چنانچہ اس کا پہلا اڈیشن برشلونہ میں کٹلونی زبان میں شایع ہوا۔ بعد میں مختلف زبانوں میں ترجمے ہوتے گئے۔ اس کا ایک اطالوی متن شہر نیس میں ۱۵۳۹ء میں شایع ہوا۔ اور ایک فرانسیسی متن مارسیلیا میں ۱۵۷۷ء میں۔ سب سے زیادہ اطالوی اڈیشن ہی نے اس کو اسپین کے باہر روشناس کرایا[1]۔ اس مجموعۂ قواعد کے پیش نظر خاص کر یہ امر تھا کہ ایسے قاعدے بیان کرے جن کا اطلاق ان خانگی جھگڑوں کے فیصلے کے لیے کیا جائے جو تجارت اور ملاحی کے سلسلے میں رونما ہوں۔ ضمناً اس میں ایسے اصول اور کلیات کو بھی جمع کیا گیا ہے جن کا اطلاق حالت جنگ میں حربی قوموں کے تجارتی جہازوں پر ہوتا ہو نیز ان قوموں کے جہازوں پر جو مخاصمانہ کارروائیوں میں کوئی حصہ نہ لے رہے ہوں۔

اس کا باب (۲۳۱) اعلاً اس صورت سے بحث کرتا ہے جب کوئی جہاز جاتے ہوئے یا آتے ہوئے یا بحری قزاقی کے دوران میں کسی تجارتی جہاز سے دو چار ہو۔

چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ: "اگر یہ آخرالذکر تجارتی جہاز اور اس پر لدا ہوا اسباب دونوں دشمنوں کے ہوں تو اس کے متعلق کچھ بیان کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ ہر کوئی اچھی طرح جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسی لیے اس صورت کے متعلق کسی قاعدے کا بیان کرنا ضروری نہیں ہے"۔ اسی کے ایک گزشتہ باب یعنی باب (۱۸۷) میں وہ قواعد بیان ہو چکے ہیں جن کا ایسی صورت میں اطلاق ہوتا ہے۔

---

[1] انگریزی تالیف "امارت بحریہ کی کالی کتاب" پر ٹراورس ٹوس نے جو عالمانہ دیباچہ لکھا ہے، اس کا بحری تنصیفہ کی تاریخ کے سلسلے میں حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

لیکن اگر جہاز دوستوں کا ہو تو اس مجموعۂ قواعد کے مطابق جہاز پر کا وہ سامان ضبط کرلیا جاسکتا ہے جو دشمنوں کا ہو۔ اس دوست جہاز کے کپتان کو ضبط کردہ سامان کے حمل ونقل کا کرایہ ادا کردیا جانا چاہیے گویا کہ اس نے اُسے منزل مقصود کو پہنچادیا ہو۔

آخری صورت وہ ہے جب دوستوں کا اسباب کسی دشمن جہاز پر حمل ونقل پا رہا ہو۔ ایسا اسباب ضبط نہیں ہوسکتا لیکن اس غانم (گرفتار کنندہ) کو جو اس جہاز کو اپنے وطن کی بندرگاہ میں پہنچائے، یہ مطالبہ کرنے کا حق ہوگا کہ دوستوں کے اسباب کو لانے کا کرایہ اسے ادا کیا جائے گویا کہ اس نے اسے منزل مقصود پر پہنچا دیا ہو[۱]۔

دوسرے الفاظ میں برشلونہ کی قنصلی عدالت کے رواجات کے مطابق دشمن کی جائداد کو تو چھین لینے کا حق ہے لیکن ناطرفدار جائداد کا احترام کیا جانا چاہیے۔ یہاں یہ بیان کردینا چاہیے کہ ان قواعد میں باقاعدہ حربیوں اور بحری قزاقوں میں کوئی فرق کیا جاتا نظر نہیں آتا۔

گروتیوس بیان کرتا ہے کہ ۱۴۳۸ء میں ہالینڈ نے اسی کتاب "بحری قواعد" کے اصول کا اطلاق اس جنگ میں کیا جو "ہانزیاتی" شہروں کے خلاف پیش آئی تھی۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس پر انگلستان میں بھی عمل ہوتا تھا، فرانس میں بھی اور شمالی یورپ میں بھی۔ ۱۲۲۱ء میں پیزا اور آرل میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی

---

[۱] - پارڈسو کی فرانسیسی تالیف "اٹھارھویں صدی سے پہلے کے بحری قوانین کا مجموعہ" ج ۲ باب ۱۲ ص ۳۰۳۔

[۲] - رڈی کی انگریزی تالیف "بحری قانون بین الممالک پر تاریخی وتنقیدی تحقیقات" ج ۱ ص ۵۶۔

رو سے یہ طے ہوا تھا کہ اگر کسی دوست جہاز پر دشمن اسباب پایا جائے تو اسے ضبط کرلیا جاسکے گا لیکن دوست جہاز پر جو دشمن اشخاص موجود ہوں انھیں قیدی نہیں بنایا جاسکے گا۔ بعد میں جو معاہدے ہوئے، وہ "بحری قواعد" کے بیان کردہ اصول کلیہ کے اندر ہی رہے۔

ناطرفداروں کو جو تکلیفیں ہوتی تھیں ان کے باعث بارہا احتجاج کیے جاتے رہے۔ ۱۴۳۲ء میں ہانزیاتی شہروں کے نمایندے لوبک میں جمع ہوئے۔ اور ان شہروں کے امتیازات کی جو خلاف ورزی ہورہی تھی، اس پر غور کیا۔ ۱۴۹۳ء میں انھیں شہروں نے ان نقصانوں کے خلاف زور وشور سے شکایت کی جو ڈنمارک کے بادشاہ اور اس کے حلیف اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ کی کارروائیوں کی وجہ سے بھگتنے پڑے تھے۔ اس وقت یہ دونوں ملک سویڈن سے جنگ کر رہے تھے۔ ان حکمرانوں نے دشمن سے ہر طرح کا تجارتی کاروبار ممنوع قرار دیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے جس زمانے میں ہانزیاتی حلیفی اوج عروج پر پہنچی ہوئی تھی، یعنی ۱۳۷۳ء سے ۱۴۹۴ء تک تو اس دوران میں خود اس حلیفی نے اسی نظریے پر عمل کیا تھا جس پر دوسرے عمل کرنے لگے تو اس نے اس نظریے کو مردود قرار دیا۔ چنانچہ جب کبھی یہ حلیفی خود کسی جنگ میں حصہ لیتی تو ناطرفداروں کو اپنے حریف سے ہر طرح کی تجارت سے روک دیتی۔

سولھویں صدی میں فرانس نے منظم طور پر اس "بحری قواعد" کے احکام کو ٹھکرانا شروع کیا۔ چنانچہ فرانسوا اول نے جو احکام ۱۵۳۳ء اور ۱۵۴۳ء میں دیے اور تیسرے ہنری نے ۱۵۸۴ء میں تو ان کے

ﻟﮯ۔ دے بوک کی فرانسیسی تالیف "دشمن جھنڈے تلے دشمن کی خانگی جائداد" ص ۲۳۔

مطابق کسی حلیف کا وہ اسباب ضبطی کے قابل قرار دیا گیا جو کسی دشمن جہاز پر لدا ہوا ہو۔ اور ۱۵۴۳ء اور ۱۵۸۴ء کے حکمناموں کے لحاظ سے حلیفوں کے ان جہازوں کو جائز مال غنیمت قرار دیا گیا جن پر دشمنوں کا اسباب لدا ہوا پایا جائے۔ اس وقت ایک نیا قانونی کلیہ وجود میں آیا کہ ”دشمن کے سامان کے باعث دوست کا سامان تجارت بھی ضبط ہو جاتا ہے“[1]۔

اس وجہ سے انحراف کا باعث سیاسی ضرورت تھی۔ ۱۵۴۳ء کے حکمنامے میں عذر یہ بیان کیا گیا تھا کہ حلیف اور ناطرفدار بکثرت فریبوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حقیقت میں فرانسوا اول نے جب انگلستان کے خلاف وہ بحری مہم تیار کی جس کے نتیجے کے طور پر ۱۵۴۵ء کا بحری اعلان شایع کیا گیا، تو اصل میں اس کی خواہش یہ تھی کہ بحری قزاقی کی حوصلہ افزائی کرے۔ اور اسی کی ترغیب دینے کے لیے اس نے قزاقی بیڑوں کو ایک وافر اور کثیر شکارہ کا پیشکش کیا تھا۔ اس نے جو بھولا بھالا عذر پیش کیا ہے، اس کا ذکر خود حکمنامے میں بھی ہے۔

مزید برآں یہ بیان کرنا بے سود نہ ہوگا کہ اس ناطرفدار جہاز کو ضبط کر لینا جس پر دشمن اسباب لدا ہوا ہو، اس نظریے کی بناء پر بھی حق بجانب قرار دیا جاتا تھا جسے بعض شرح نویسوں نے زور و شور سے پیش کیا تھا یعنی ”چھوت گرفتگی“ کا نظریہ، جس کی رو سے ممنوعہ اسباب ایک طرح سے جائز اسباب کو بھی اپنی ممنوعیت سے متاثر کر دیتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق حمل و نقل کے لیے جو چیز کام میں لائی جا رہی ہو، اس کا بھی وہی

---

[1] ”روبا“ کی اصطلاح سے عام طور پر جبہ اور عبا مراد ہوتی ہے لیکن کتاب بحری قواعد میں اس سے سامان اور اسباب تجارت مراد لیا گیا ہے۔

انجام ہوگا جو اس پر لدے ہوئے ممنوعہ اسباب کا۔ یہ ضبطی "بر بنائے اشیاء" ہے۔

بارتولے نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ممنوعہ اسباب کے حمل و نقل پر صرف "بر بنائے جرم" سزا دی جائے گی[1]۔ "توت کشش" کا نظریہ فرانس میں چل پڑا اور پہلے فرانسوا اور تیسرے آں ری (ہنری) کے سخت حکمنامے اس کی تعمیل کرانے لگے۔ اور انطوان ہورناک نے اس کی حمایت بھی کی تھی[2]۔ لیکن متعدد مولف اس کی تردید میں لگے رہے خاص کر یوحان مرکار نے جو ایک جرمن مولف تھا، اپنی فیاض طبیعت کے تحت اس پر ایک اہم اور قابل ذکر کتاب لکھی[3]۔

235

فرانس نے جو قواعد نافذ کیے ان پر ہر طرف زور و شور سے احتجاج کیے گئے۔ انگلستان نے اپنے حقوق جتائے۔ "ہانزیاتی" شہر کہنے لگے کہ انھیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اور صوبجات متحدہ اس کے جواب میں انتقامی کارروائیاں اختیار کرنے لگے۔ اور یہ یقین کرنا چاہیے کہ ان حکمناموں کے نفاذ میں کچھ بہت زیادہ سختی نہیں برتی گئی ہوگی، کیونکہ پارلیمان شاہی کے اجلاس منعقدہ طور کی ایک قرار داد بابت ۱۵۹۲ء میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ ان کے ہدایات پر عملدرآمد نہیں ہو رہا تھا[4]۔ ۲ فروری ۱۶۵۰ء کے اعلان کے

۱۔ فلپسن کی ولندیزی تالیف "قانون بین الممالک کا قاعدہ کہ جہاز کی حیثیت سرزمین کی سی ہے" ص ۱۴۔

۲۔ ہورناک کا مجموعۂ تالیفات، ج ۱، ص ۱۱۳۵، نیز ج ۳، ص ۹۴۳۔

۳۔ بردی کی انگریزی تالیف "بحری قانون بین الممالک پر تنقیدی اور تاریخی تحقیقاتیں" ج ۱، ص ۶۲۔

۴۔ مرکار کی لاطینی تالیف "تاجروں اور انفرادی تجارت کے حقوق کے متعلق سیاسی و قانونی رسالہ" مطبوعہ ۱۶۶۲ء ص ۲۱۷۔

ذریعے سے نرم تر قواعد نافذ کیے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۶۸۱ء میں ایک اور نظر ثانی عمل میں آئی۔

سولھویں صدی کے نصف دوم میں جو عظیم الشان لڑائیاں ہوتی رہیں، ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ناطرفداروں کے حقوق کو پامال کیا جاتا رہا۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، بعض لڑائیوں میں یہاں تک ہونے لگا کہ ناطرفداروں کے ان حقوق میں سے سب سے اہم یعنی حق تجارت کو تک ممنوع قرار دیا گیا۔

اس کے بعد کی صدی میں ایک مناسب تر رائے قائم ہونے لگی۔ اس کی نمایندگی اور حمایت خاص کر صوبجات متحدہ نے کی۔ چنانچہ انھوں نے کتاب "بحری قواعد" کے احکام کو ٹھکرا دیا، لیکن سترھویں صدی کے وسط سے جب ان کی تجارت انگلستان کے قانون ملاحی کے باعث خطرے میں پڑنے لگی تو ان کو بھی مجبور ہونا پڑا کہ ایک دوسرا طرز عمل اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے اس اصول کے منوانے کی کوشش کی کہ ناطرفدار جھنڈے کے سایے میں جو دشمن اسباب ہو وہ بھی آزاد سمجھا جائے۔ اس کے پہلے بھی ۱۶۰۴ء میں ترکی کے باب عالی نے [فرانس کے] چوتھے آن ری (ہنری) کے متعلق مجبوراً یہ قبول کر لیا تھا کہ دشمن جھنڈے تلے جو ناطرفدار اسباب ہو، اسے آزاد قرار دیں نیز اس دشمن اسباب کو بھی جو ناطرفدار جھنڈے تلے پایا جائے۔ ۱۶۱۲ء میں باب عالی نے اسی طرح کا ایک معاہدہ صوبجات متحدہ سے بھی کیا تھا۔

یہ ذمہ داری پہلے اور دوسرے ہر دو معاہدوں میں یک طرفہ تھی۔ لیکن جب ۱۸ اپریل ۱۶۴۶ء کو فرانس اور صوبجات متحدہ میں ایک معاہدہ ہوا تو اس قاعدے کو اس میں جگہ دی گئی۔ یہ طے ہوا کہ چار سال تک وہ جہاز جو صوبجات متحدہ کی امارت بحریہ میں رجسٹر ہو کر تجارت کریں وہ وہ آزاد رہیں گے اور اپنے پر

236 لدا ہوا اسباب آزادی کے ساتھ اتار سکیں گے۔ خواہ اس اسباب کے اندر ایسا غلہ اور ترکاری ہی کیوں نہ پائی جاتی ہو جو دشمنوں کی ہو۔ صوبجات متحدہ نے یہی قاعدہ اس معاہدے میں بھی شامل کردیا جو سنہ ۱۶۵۰ء میں انھوں نے اسپین کے ساتھ کیا تھا۔ انگلستان نے بھی اس کی مختلف موقعوں پر توثیق کی، خاص کر ان معاہدوں میں جو سنہ ۱۶۵۴ء اور سنہ ۱۶۵۵ء میں علی الترتیب پرتگال اور فرانس کے ساتھ طے ہوئے تھے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ وہ تمام معاہدے جو اس تاریخ سے سنہ ۱۸۴۲ء تک انگلستان اور فرانس میں ہوتے رہے، ان میں اسی اصول کلیہ کو تسلیم کیا جاتا رہا۔

یہ قاعدہ عالمگیر قبولیت حاصل کرنے لگا ہی تھا کہ فرانس نے پہلے فرانسوا اور تیسرے آں ری (ہنری) کی روایتوں کو زندہ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ سنہ ۱۶۸۱ء کے حکمنامے میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ وہ تمام جہاز جائز مال غنیمت سمجھے جائیں گے جن پر کسی دشمن کا اسباب لدا ہوا ہو، نیز بادشاہ کی رعایا اور حلیفوں کا وہ اسباب بھی جو دشمن جہاز پر پایا جائے۔

قدیم زمانے میں یہ امر مسلمہ تھا کہ جنگی قیدی غلام بن جاتا ہے۔ قانون روما کا حکم تھا کہ جو شہری جنگی قیدی بن جائے، اسے اپنے وطن کے حقوق شہریت و انسانیت باقی نہیں رہتے، اور وطن اسے ایک دشمن خیال کرنے لگتا۔ اس اصول کی حمایت متعدد شرح نویسوں نے بھی کی۔ بالدے بھی اسی کو تسلیم کرتا نظر آتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ "اصل میں تمام حیوانات ناطق یعنی انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور طبعًا سب مساوی ہیں۔ خدا نے کسی کو کسی کا غلام نہیں بنایا بلکہ سب کو یکساں آزادی عطا کی ہے۔ بعد میں میرا اور تیرا کے ضمائر اضافی پیدا ہوئے تو جنگیں چھڑیں۔ اور انھیں جنگوں سے غلامی

پیدا ہوئی[۱] اس کی رائے میں غلامی جنگ کا ایک ناگزیر نتیجہ ہے۔ ایک اور عبارت میں وہ اس صورت سے بحث کرتا ہے جب شہنشاہ یا پوپ کے حکم سے جنگ کی گئی ہو۔ اور سوال کرتا ہے کہ شہنشاہ دوسرے فرڈیرک کے صلبی بیٹے اینٹ ہیبو نے بولونیا والوں کے قیدی کی حیثیت سے جان دیتے وقت جو وصیت کی تھی، آیا وہ درست سمجھی جائے گی یا نہیں؟ سوال کا جواب وہ نفی میں دیتا ہے، اور وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ (لاطینی میں) "اس طرح کے قیدی بھیڑ بکریوں یا دیگر مماثل مال منقولہ کی طرح کے ہوتے ہیں جو کہ طبعًا ایک شے ہوتا ہے"۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے، اگر واقعات اس تصور کے مطابق تھے تو نظریے زیادہ نرم اور زیادہ انسانیت پرور تھے۔ قدیم تصور، کلیسائی نظریے کے خلاف تھا۔ کیونکہ خود تیسرے الگزانڈر کے زمانے میں لاتران کی تیسری مجلس شورائے مذہبی نے صراحت کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ تمام عیسائی غلام بننے سے محفوظ سمجھے جائیں۔ اور یہ بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ جو مسلمان قیدی جنگ میں ہاتھ آئیں اگر وہ بپتسمہ لینا قبول کریں، تو انھیں یہ حق حاصل ہوجائے گا کہ اپنی جائداد اپنے بچوں کے نام منتقل کرسکیں، نیز وصیت کرسکیں۔ چونکہ قانون کے الفاظ کا احترام مبالغہ آمیز طور سے کیا جاتا تھا اس لیے اس کے بھی مخالف پیدا ہوگئے۔ چنانچہ بالدے سے پہلے کی قانونی تالیفوں میں ایک رائے ظاہر کی گئی تھی جسے بارتولے نے اپنی ذاتی شہرت و استناد کے ذریعے سے مستند قرار دیدیا۔ بارتولے تسلیم کرتا ہے کہ قدیم قانون بین الممالک کے مطابق قید ہونے کا قانون اور قیدی کے بھاگ کر اپنے مامن کو پہنچنے پر دوبارہ آزاد ہوجانے کا قاعدہ مسلمہ امور تھے۔ لیکن بارتولے زور و شور سے بیان کرتا ہے کہ نئے نئے اخلاق اور ایک پرانے

237

[۱] بالدے کی لاطینی تالیف "پرانی ڈائجسٹ کے حصہ اول کی شرح" متعلقہ قانون (۲م)۔

رواج کے باعث عیسائیوں نے اس دُہرے حق پر عملدر آمد ترک کردیا ہے جو اشخاص کو حاصل ہوتا تھا۔ وہ (لاطینی میں) بیان کرتا ہے کہ یہ رواج تھا کہ "پرانے اخلاق کے قانون اقوام کے تحت حق اسیری و حق باز گشت قائم ہو...... لیکن نئے زمانے کے اخلاق اور عیسائیوں میں برتے جانے والے قدیم رواج کے تحت، حق اسیری و بازگشت کو جہاں تک آدمیوں کی ذات کا تعلق ہے، ہم ملحوظ نہیں رکھتے ہیں۔ وہ نہ تو قیدیوں کو غلام بنا سکتے ہیں اور نہ [ایسا ہوتا] نظر آتا ہے (؟) لیکن جہاں تک اشیاء و اسباب کا تعلق ہے، قانوناً اس کی ملکیت حاصل ہوجاتی ہے اس کے متعلق [پرانا] رواج برقرار ہے"[1] (؟) عربوں کی حد تک وہ ایک استثنار قائم کرتا ہے۔

شہنشاہت کا تصور بھی یہاں اپنا کچھ اثر دکھاتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شہنشاہ کارہ اکلا نے اپنے ہاں کے دستور کے تحت رومی شہنشاہت کے تمام آزاد باشندوں کو حقوق شہریت عطا کردیے تھے۔ اس تدبیر کو زیادہ تر ایک مالی اہمیت حاصل تھی، اور وہ چند دن ہی نافذ رہ سکی۔ پھر بھی یوستی نیان (جسٹی نین) کی تالیف میں یہ (لاطینی) الفاظ ملتے ہیں کہ "رومی سرزمین میں شہنشاہ انٹونیوس کے دستور کے تحت، جو لوگ رومی شہری قرار دیے گئے تھے، ان کی وہ حیثیت برقرار رہے گی"۔ ان الفاظ سے ایک ایسا نظریہ پیدا ہوگیا جو قرون متوسطہ کے ماہرین کا بڑا دلپسند تھا۔ رومی آبادی اور اجنبی آبادی میں ایک اختلاف قائم کیا گیا تھا، جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں۔ عیسائیوں کو

---

[1] ساسو فیراتو کے بارتولے کی لاطینی تالیف "نئی ڈائجسٹ" کے حصۂ دوم کی شرح، باب جنگی قیدی اور ان کی بازگشت اور دشمن کے پاس سے رہائی۔

رُومی" آبادی قرار دیا گیا۔ اور بارتولے[1] مختلف قوموں کی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے "رومی" آبادی کے متعلق یوں خامہ فرسائی کرتا ہے کہ: "بعض ایسی قومیں بھی پائی جاتی ہیں جو شہنشاہ کی اطاعت کرتی ہیں گو ہر ایک امر میں نہیں بلکہ چند باتوں میں۔ مثلاً ٹسکنی اور لومبارڈی کے شہر۔ یہ رومی قوم ہی سے ہیں کیونکہ جب شہنشاہ ایک معاملے میں اپنا اختیار سماعت استعمال کرتا ہے تو وہ اس اختیار سماعت کو سب ہی کے لیے ملحوظ رکھتا ہے۔ کچھ اور قومیں ایسی ہیں جو شہنشاہ کی کسی طور سے بھی اطاعت نہیں کرتیں لیکن ان کا دعوٰی ہے کہ وہ اس طرح کا برتاؤ اپنے ایک امتیاز کے باعث کرتی ہیں۔ وِنیس والے ایسے ہی ہیں۔ ان کو بھی رومی قوم ہی سے قرار دیا جائے گا کیونکہ ان کی آزادی ایک عطیہ اور غیر مستقل ہے۔ بعض ایسی قومیں بھی ہیں جو کسی طرح سے بھی اطاعت نہیں کرتیں لیکن انھیں جن صوبوں پر قبضہ حاصل ہے ان پر وہ ایک معاہدے کے تحت تسلط رکھتی ہیں۔ کلیسا کو جو صوبے شہنشاہ قسطنطین نے عطا کیے تھے، ان کی یہی حالت ہے، بشرطیکہ یہ فرض کیا جائے کہ وہ عطا درست تھی اور اسے واپس نہیں لیا جاسکتا تھا۔ آخر میں کچھ ایسے حکمران اور بادشاہ بھی ہیں جو اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ وہ رومیوں کے بادشاہ کے ماتحت ہوں جیسے فرانس اور انگلستان کے بادشاہ۔ یہ بھی رومی قوم سے ہی ہیں۔ ان کو "رومی" شہری ہونے سے محض اس لیے منقطع نہیں کیا جاسکتا کہ وہ عالمگیر اقتدار سے کسی امتیاز، کسی حق قدامت، یا کسی اور وجہ سے اپنے کو باہر رکھتے ہوں"۔ اس مولف نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ (لاطینی میں): "اس اصول کی بناء پر وہ تمام لوگ جو کلیسائے مادر مقدس کی اطاعت کرتے ہوں وہ سب رومی قوم ہی سے سمجھے جائیں گے"۔

---

[1] بارتولے کی لاطینی تالیف وباب مذکور۔

یہ صفحہ بھر عبارت بارتولے نے لکھی ہے جو شاید کسی قدیم تر مولف سے ماخوذ ہے، کیونکہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرون متوسطہ کے مولف دوسروں کے خیالات اور عبارات کو بے انتہا چرایا کرتے تھے۔ بارتولے کی یہی عبارت اس زمانے کے بے شمار مولفوں کے ہاں دہرائی جاتی نظر آتی ہے۔ لنّالو کے ژاں نے اسے لفظ بلفظ نقل کردیا ہے۔ اونورے بونے اس کو اپنی فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" میں ترجمہ کرکے پیش کردیتا ہے، اور فرق صرف اتنا کرتا ہے کہ فرانس کے بادشاہ کے حقوق کی تائید میں ایک تیر مار دیتا ہے کہ وہ شہنشاہ کے بالکل ماتحت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: "شارلیمان، فرانس کا بادشاہ تھا جسے روما کا شہنشاہ بنایا گیا اور کوئی نہیں کہتا کہ اس نے یہ اعلان کیا ہو کہ فرانس کی بادشاہت کسی طرح بھی شہنشاہت کے ماتحت ہوگئی۔ اور اسی بناء پر سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ فرانس میں شہنشاہی قواعد بنائے جایا کریں۔"[1]

بہرحال جو بھی ہو، جب یہ استدلال ایک مرتبہ قبول کرلیا گیا تو اس سے اہم نتائج برآمد ہوئے۔ ان نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ عیسائیوں کا آپس میں ایک دوسرے کو غلام بنا سکنا ایک ایسی چیز ہوگئی جسے حق بجانب قرار دیا جانا یا روا رکھا جانا ناممکن ہوگیا۔ کیونکہ سب کے سب رومی شہری تھے۔ سب ہی آزاد اشخاص تھے۔ اور جنگی قیدی کو اس کے بعد پھر غلام نہیں بنایا جاسکا۔ یہ خیال جلدی ہی ماہرین قانون نے متفقہ طور سے قبول کرلیا۔ ایک اور نتیجہ جو ایک نقطۂ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہم تھا، یہ نکلا کہ وہ تمام جنگیں جو عیسائیوں میں آپس میں لڑی جائیں، انھیں سب خانہ جنگیاں سمجھا جائے۔ اس سے یک بیک مال غنیمت کا

---

[1] - اونورے بونے کی فرانسیسی تالیف "شجرۂ حروب" حصہ ۴ باب ۳ -

حق ساقط ہوگیا۔ یہ نہایت ذہین نظریہ تھا جسے آلجیات نے سولھویں صدی کے لیے قابل اعزاز چیز قرار دیا ہے۔[1]

اپنے نظریے کی توضیح کے سلسلے میں آلجیات نے ماہرین دینیات کا احترام ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ اور وہ ان پر الزام لگاتا ہے کہ وہ محض فضول اور بیکار چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بلّی نے اس ممتاز رومانی مولف کے نظریے پر اس قدر جوش و خروش سے حملہ کیا اور اسے الحاد و بے دینی قرار دیا۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ ہیں: "ایک جدّت [؟ بدعت] جو الحاد کی طرف لے جاتی ہے"۔[2]

لہٰذا عیسائی آپس میں ایک دوسرے کو غلام نہیں بنا سکتے بلکہ صرف قید میں رکھ سکتے ہیں تا آنکہ کوئی فدیہ ادا نہ ہو جائے۔ بلّی کی یہی رائے ہے اور اس کے لاطینی الفاظ ہیں: "ہم بکثرت یہ دیکھتے ہیں کہ ایسے قیدی آزاد رہتے ہیں۔ مگر بہر حال ایک مناسب فدیہ ان لوگوں پر مقرر کیا جاتا ہے جو ادا کر سکتے ہوں۔ اور اسی اثنا میں وہ اس شخص کے قبضے میں بطور کفالت رہتے ہیں جس نے ان کو گرفتار کیا ہو"۔ پھر بھی وہ (لاطینی میں) بیان کرتا ہے: "لیکن کیا بے رحمی ہے کہ اگر وہ اپنے کو رہا کرا لینے سے انکار کریں تو ان کو تکلیفیں پہنچا کر اس پر مجبور کیا جاتا ہے"۔ ابالدی کا آنجیلو اس سے زیادہ انسانیت نواز تھا۔ چنانچہ اس کی رائے میں عیسائی اگر آپس میں ایک دوسرے کو قیدی بنائیں تو نہ تو حقوق قیدی

---

[1] - آلجیات کی لاطینی تالیف "معانی و الفاظ"، کتاب چہارم قاعدہ (۱۸): "دشمن یہ ہیں"

[2] - بلّی کی لاطینی تالیف "فوجی چیزوں اور جنگ کے متعلق رسالہ" حصۂ دوم عنوان ۱۸۔

پیدا ہوتے ہیں، نہ حقوق بازگشت بلکہ اطاعت شعاری یا جاگیردارانہ ماتحتی کی سی کوئی چیز سمجھی جاسکتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عیسائیوں سے یہ سلوک ہو تو غیر عیسائیوں کے ساتھ بھی، کیا وہی سلوک ہوگا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ان کے مقابل قانون روما نظر انداز ہوگا اور جنگی قیدیوں کو غلام بنالیا جاسکے گا اور وہ تمام قواعد جو غلاموں سے متعلق ہیں، ان کا ان پر اطلاق ہوگا۔ جو عیسائی، غیر عیسائیوں کے ساتھ ہوکر لڑتے ہیں، وہ انھیں میں سے سمجھے جائیں گے۔ البتہ اگر یہ عیسائی قید ہوں تو انھیں صرف کسی عیسائی کے ہاتھ فروخت کیا جاسکے گا۔

بالدے کی یہ رائے ہے کہ اگر عرب اور بربری اور دیگر تمام اجنبی قومیں آپس میں لڑیں تو نہ تو حقوق قیدی پیدا ہوتے ہیں اور نہ حقوق بازگشت۔ بلّی نے بالدے کی رائے کا حوالہ دیا ہے اور اس کی تردید ان لاطینی الفاظ میں کی ہے کہ: "مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ آزاد ہیں، انھیں اس بین الاقوامی اور عالمگیر حق سے، جو دائمی اور ابدی ہے، استفادہ کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟"

تقریباً تین صدیاں گزر جاتی ہیں۔ سوار ہیتس مرتدوں اور ملحدوں کے سلسلے میں پھر یہی سوال اٹھاتا ہے۔ جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ غلام ہوجاتے ہیں، کم از کم قاعدے کی حد تک، کیونکہ بعض صورتوں میں فاتح، مجرم مفتوحوں کو سزائے موت دے سکتا ہے۔ اور اسی طرح وہ ان کو قید کرسکتا ہے۔ اس ممتاز یسوعی (جے سوئیٹ) پادری نے سوال کیا ہے کہ جو امتیازی حق عیسائیوں کی حد تک قبول کیا گیا ہے، کیا وہ مرتدوں کی حد تک بھی قابل اطلاق ہوگا؟ وہ جواب دیتا ہے کہ نہیں۔ کیونکہ اس کے بیان کے مطابق یہ لوگ حضرت مسیح سے

انکار کرتے ہیں ۔ اور اسی بنار پر انھیں ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہونا چاہیے، جو عیسائیوں سے مخصوص ہیں۔ اس نے دوسرا سوال کیا ہے کہ ان رعایتوں کا اطلاق ملحدوں پر ہوگا؟ اس کا جواب اثبات میں ہے، کیونکہ یہ کم ازکم حضرت مسیح کا اقرار تو کرتے ہیں۔ گونثارڈو ثیاس نے اس کے خلاف رائے دی ہے اور اس کی رائے میں جو رعایا مرتد ہوگئی ہو، اگر اس سے جنگ کی جائے تو حقوق اسیری نہیں پیدا ہوتے کیونکہ یہ حقیقت میں کوئی جنگ نہیں ہوتی بلکہ معمولی تعزیری کارروائی اور اختیار سماعت کا استعمال ہوتا ہے۔ سوارتیس نے اس سے اختلاف کیا ہے، اور غرناطہ کی جنگ میں جو برتاؤ کیا گیا تھا اس کا حوالہ دیتا ہے۔ اور اس سلسلے میں آیالا کی رائے کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ باغیوں سے جو جنگ کی جائے وہ جائز ترین جنگ ہی سمجھی جائے گی۔

جہاں تک تعمیل کا تعلق ہے، وہ ان انسانیت پرور نظریوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی۔ عرصۂ دراز تک فاتح، قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں انتہائی مطلق العنانی سے جو چاہے طے کرتے رہے۔ کبھی تو ان کو میدان جنگ میں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا، کبھی ان سے فدیہ قبول کیا جاتا، کبھی انھیں بیچ ڈالا جاتا اور کبھی انھیں سخت محنت و مشقت کی بیگاری کی سزا دی جاتی۔

آزن گورٹ میں پانچویں ہنری نے چار ہزار قیدیوں کے گلے کٹوا دیے کیونکہ وہ اس کے لیے دوبھر ہو گئے تھے۔ بارہ سو

۱۔ سوارتیس کی لاطینی تالیف "سہ گانہ الہیاتی نیکی: ایمان، آس اور عفو پر تالیف جو ان تینوں نیکیوں کے متعلق تین رسالوں پر منقسم ہے۔ حصۂ عفو۔ مبحث ۱۳: جنگ، فصل ۷"

تیر اندازوں نے اجتماعی نشانہ اندازی سے بارہ سو قیدیوں کو مار ڈالا اور صرف افسروں کو فدیہ لے کر رہا کیا گیا۔[لہ] انگریزوں اور پرتگالیوں میں ایک مرتبہ لڑائی ہوئی تو یہ ڈر ہوا کہ کہیں ان کے قیدی خود انھیں کے خلاف نہ کارروائی کرنے لگ جائیں۔ اس لیے یہ قرار پایا کہ ان قیدیوں کو مار ڈالا جائے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "ایک قابل رحم حکم دیا گیا۔ کیونکہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ جس کسی کے ہاتھ یہ قیدی ہو تو وہ اسے قتل کردے اور اس سے کوئی مستثنیٰ نہ ہو اور اس کا مطلق لحاظ نہ کیا جائے کہ وہ کوئی بہادر سورما ہے یا طاقتور شخص یا معزز جاگیردار یا شریف یا مالدار۔ چنانچہ جاگیردار بیرن بھی قید ہوئے، شہامت باز بھی اور شہامت بازوں کے ڈھال بردار (اسکوائر) بھی۔ ان کی حالت سخت تھی اور کوئی التجا بھی ان کو موت سے بچانے کے لیے کامیاب نہ ہوسکی۔ یہ لوگ ادھر اُدھر مختلف مقاموں پر بٹے ہوئے تھے اور سب نہتے تھے۔ وہ یقین کرتے تھے کہ ان کی جان بچ جائے گی لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ یہ ایک بڑا قابل رحم نظارہ تھا کیونکہ ہر کوئی اپنے پاس والوں یعنی قیدیوں کو قتل کرتا! اور جو قتل کرتا وہ چاہتا تھا کہ کوئی خود اسے قتل نہ کردے اور پرتگالی اور انگریز، جنھوں نے یہ مشورہ دیا، کہنے لگے کہ: خود مارے پڑنے سے مار ڈالنا بہتر ہے۔ اگر ہم انھیں قتل نہ کریں تو وہ اپنے کو چھڑا کر ہمیں قتل کرنے لگیں گے، کیونکہ کسی کو دشمن پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔" اور فرواسار کے یہ الفاظ پورے غور کے مستحق ہیں کہ "بھلا اس بڑی بد اتفاقی کو تو دیکھو کہ وہ اپنے قیدیوں کو سنیچر کے دن شام کو قتل کرڈالتے حالانکہ ان سے چار لاکھ فرانک وصول ہوسکتے۔"

لہ۔ خود لا کلاڈیئیر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاڈیلی کے زمانے کی سیاست کاری" ج ۱، ص ۲۰۷

فریقین میں سے ہر ایک نے یہی کیا[1]۔ جب ساتویں شارل نے پوں تواز پر قبضہ کرلیا تو انگریز قیدی بیڑیاں پہنا کر نکالے گئے۔ اور جو فدیہ ادا نہیں کرسکتا تھا، اسے دریائے ہیبن میں پھینک دیا گیا[2]۔ اس طرح کی بے رحمیوں کے واقعات بکثرت ہیں۔ ۱۴۴۳ء میں ریس بی کے کونٹ نے شہرلاں کے محافظ دستے پر حملہ کیا۔ تقریباً سو آدمیوں کو قید کرلیا اور حکم دیا کہ وہ سب کے سب مار ڈالے جائیں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ کونٹ کا نو عمر بھتیجا جنگ کا عادی بنے۔ چنانچہ اس نے اپنے بھتیجے کو حکم دیا کہ متعدد قیدیوں کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ مونس ترلے لکھتا ہے کہ "اس چھوکرے نے اس کو بڑی خوشی خوشی انجام دیا[3]"۔

گیارھویں لوئی کا ایک بڑا ملعون خط ہے جس میں وہ اس پر اتراتا ہے کہ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ جنگی قیدیوں کو مال غنیمت کے سرکاری حصے میں شمار کیا جائے "تاکہ آیندہ مرتبہ وہ کسی کو قیدی نہ بنائیں بلکہ سب کو قتل ہی کر ڈالیں" اور انھیں قیدیوں کے متعلق کوئی راست دلچسپی باقی ہی نہ رہے[4]۔

قیدیوں کو غلام بنا لینا کوئی نادر واقعہ نہیں تھا۔ ایسے بھی واقعات پیش آتے رہے کہ جن قیدیوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوتی انھیں محنت و مشقت کے کاموں پر لگا دیا جاتا۔ ۱۳۷۰ء میں تیسرے ایڈورڈ کو جو درخواست دی گئی تھی اس سے

۱۔ فروا سار کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" کتاب سوم باب ۲۰۔

۲۔ مونس ترلے کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" حالات ۱۴۴۱ء۔

۳۔ مود لا کلاتیئیر کی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سیاست کاری" ج (۱) ص ۲۰۶۔

۴۔ ایضاً ص ۲۰۶ — نیز سیال ڈکوریاں کی فرانسیسی تالیف "علم حکمرانی" ج (۵) ص ۴۲۵۔

اس واقعے کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ اس درخواست میں بادشاہ سے التجا کی گئی تھی کہ ایک قانون کے ذریعے سے فرانسیسی فوج کے متعدد خدمتگاروں کی حالت کے متعلق وضاحت فرمادے جن کو قید کرکے انگلستان لایا گیا ہے اور جن کے متعلق معلوم نہیں کہ آیا انھیں معمولی کسان سمجھا جائے، یا ان کے ساتھ جنگی قیدیوں کا برتاؤ کیا جائے[۱]؟

"سپاہیوں کا ہدایت نامہ" نامی تالیف میں بیشل داں بوازیہ مشورہ دیتا ہے کہ جو دشمن قیدی ہاتھ آئیں انھیں زمین جوتنے کے کام پر لگایا جائے۔ کیونکہ وہ بیان کرتا ہے کہ: "اگر ان کو روک رکھا جائے اور کھیتوں کی نگہداشت پر مجبور کیا جائے، تو ان کی مسلسل محنت سے کثیر اور بے شمار مقدار میں غلہ جمع اور حاصل کیا جاسکے گا۔ کافی تعداد میں بادشاہ اس پر عمل کرتے ہیں اور خود ترکوں کا مسلمان حکمران بھی۔" خود سترھویں صدی میں یہ چیز معاہدوں کے ذریعے سے طے کرنی پڑتی تھی کہ جنگ کی صورت میں قیدیوں کو جنگی جہازوں کے کھینے اور چپو چلانے کے کام پر نہیں لگایا جائے گا۔

مزید برآں قرون متوسطہ کی جنگوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ فریقین مخاصمت یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ مطلق جان بخشی نہ کریں۔ چنانچہ ٹرنے ای کی جنگ سے پہلے، جو فرانس اور اس کے حلیفوں یعنی اسکاٹ لینڈ والوں کے لیے اتنی ہولناک ثابت ہوئی، فرانس کے نائب السلطنت ڈیوک آف بڈفرڈ نے ایک فوجی نقیب کونٹ آف ڈگلس کے پاس روانہ کیا جو فرانسیسیوں اور اسکاٹ لینڈ والوں کا سردار تھا کہ یہ معلوم کرے کہ لڑائی کی کیا شرطیں ہیں۔ آخرالذکر نے

---

[۱] بارنگٹن کی انگریزی تالیف "قدیم ترین قوانین موضوعہ پر تبصرے" ص ۱۳۹۔

جواب دیا کہ وہ نہ تو کسی کو پناہ دے گا نہ پناہ چاہے گا۔ اس کے قریب قریب تمام لوگ مارے گئے[۱]۔

زمانۂ حال کا نظریہ یہ ہے کہ جو شخص جنگ میں گرفتار ہو وہ سرکاری قیدی سمجھا جائے گا۔ قرونِ متوسطہ میں مختلف خیالات پائے جاتے تھے۔ ابتدائی خیال یہ تھا کہ جو شخص کسی کو قید کرے تو وہ قیدی اسی کا سمجھا جائے گا اور اسے اس قیدی کے متعلق ہر قسم کے حقوق حاصل ہوں گے۔ اس کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ جو معزز اور ممتاز اشخاص قید ہوں تو وہ بادشاہ کی جائداد سمجھے جائیں گے۔ صرف یہ ہوگا کہ بادشاہ، اصل گرفتار کنندہ کو معاوضہ دلائے گا۔ لیکن جو قیدی غیر اہم ہوں تو وہ اسی شخص کی جائداد سمجھے جائیں جس نے ان کو گرفتار کیا ہو۔ اور سب سے آخر میں یہ تصور پیدا ہوا کہ تمام قیدیوں کے متعلق بادشاہ ہی کو حقوق حاصل ہوں گے اور بادشاہ ہی کے توسط سے اصل گرفتار کنندہ کوئی حق حاصل کرسکے گا۔ یکے بعد دیگرے جو نظریے پیدا ہوتے گئے، ان میں کبھی تو ترقی نظر آتی ہے اور کبھی حالت میں کچھ ابتری ہی پیدا ہوجاتی ہے۔

مولف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قانونِ بین الممالک کے مطابق ہر شخص کو قید کیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہی مولف ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نصفت [اور استحسان و رعایت] نے اس میں کچھ نرمیاں ضرور پیدا کی ہیں۔

بارہ برس سے کم عمر بچے مستثنیٰ ہیں۔ قانونِ موضوعہ نے اس کی توثیق کی ہے۔ فوجی ضوابط نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ یہ بھی پیش آتا رہا ہے کہ حربیوں کے آپس کے معاہدوں کے ذریعے سے

---

[۱]۔ فرانسسک میشل کی فرانسیسی تالیف "اسکاٹ لینڈ والے فرانس میں" دیکھیے ۱۴۲۳ء کے حالات۔

اس بارے میں کوئی انتظام عمل میں آتا تھا۔ بڈھے، عورتیں، اور (جہاں تک کیتھولکوں کا تعلق ہے) راہب اور پادری بھی محفوظ قرار دیئے گئے تھے۔ مولفوں کی اکثریت نے طالب علم کو بھی جنگی اثرات سے بَری قرار دیا ہے۔ مولف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مصلحت عامہ کے تحت تاجروں، کسانوں اور ترجمیوں کو بھی محفوظ قرار دیا گیا ہے۔

فدیے کا ادارہ وجود میں آتا ہے۔ قیدی بطور حق اس سے استفادہ نہیں کرسکتا۔ مختلف بادشاہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ وہ اپنے قیدیوں سے کوئی فدیہ قبول کریں۔ چنانچہ اُورلیاں کے شارل کو جب آزن کورٹ میں گرفتار کیا گیا تو وہ پچیس سال تک قید رہا۔ اسے لندن لایا گیا۔ وہ اپنی رہائی کے لیے اچھی وکالت کرتا رہا لیکن انگلستان کی حکومتیں ذرا بھی متاثر نہیں ہوئیں۔ اسے قید خانے کے ملازموں کو خود ہی تنخواہ دینی پڑی اور انگلستان کے بادشاہ نے اس کے محافظوں کا اس طور سے انتظام کیا کہ گویا وہ کوئی کفالت ہو یا کوئی حقیت اور آمدنی۔ آخر کار ۱۴۴۰ء میں اُورلیاں کے لوئی اور میلان کی ڈالن تین کے بیٹے نے رہائی حاصل کی، جس کے لیے اسے اسّی ہزار ایکو (سکّے) یکمشت اور فوراً ادا کرنے پڑے اور اس کی ضمانت دینی پڑی کہ ایک لاکھ بیس ہزار ایکو کی دوسری قسط چھے مہینوں کے بعد ادا کردی جائے گی۔ اس نے یہ بھی اقرار کیا کہ ایک سال اور چالیس دن تک وہ انگریزوں کے خلاف ہتیار نہیں اٹھائے گا۔ یہ کہ وہ صلح کرانے کی کوشش کرے گا اور اگر اس میں وہ ناکام ہو تو دوبارہ اپنے آپ کو بطور قیدی کے حوالے کردے گا، جس صورت میں اس کی ادا کی ہوئی رقمیں اسے واپس کردی جائیں گی۔[1]

جب چوتھے ہنری نے اسکاٹ لینڈ والوں کے خلاف ایک

[1] موو لاکلاڈیئیر کی فرانسیسی تالیف "بارھویں لوئی کی تاریخ" ج ا ص (۱۴) و مابعد۔

مہم شروع کی تو اس نے سنہ ۱۴۰۲ء میں ایک حکمنامہ جاری کر کے انگریزوں کو اس بات کی ضمانت کی کہ تا حکم ثانی اپنے قیدیوں کو رہا کر سکیں۔ اس حکمنامے میں احتیاطاً یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ اس سے قید کنندوں کے حقوق ذرا بھی جوکھم میں پڑتے نہ سمجھے جائیں۔[1]

قسطیلہ کے "سات ارکان" نامی مجموعۂ قانون کے رکن دوم عنوان (۲۶) میں مال غنیمت کی تقسیم کے (۳۴) قاعدے بیان کیے گئے ہیں۔ بادشاہ کے لیے ⅕ حصہ مقرر کیا گیا ہے جو خمس شاہی کہلاتا تھا۔ اور اس خمس کے علاوہ مال غنیمت میں سے بادشاہوں کو حسب ذیل چیزیں بھی حاصل ہوتیں:—

۱۔ دشمن سردار، اس کی بیوی یا بیویاں، اس کے بچے، اس کے نوکر اور اس کا مال منقولہ۔

۲۔ دشمن کے شہر قلعے اور محل۔

۳۔ دشمن سے چھینے ہوئے جہاز۔

اگر کسی جنگی قیدی کو بیچنے پر ایک ہزار "مراڤے دی" (مرابطی سکے) یا اس سے زیادہ قیمت آئے تو بادشاہ صرف سو "مراڤے دی" ادا کر کے اس قیدی کو حاصل کر لے سکتا۔

ان احکام میں سے چند، عربوں کے قانون جنگ سے ماخوذ ہیں۔

عربوں کے قانون جنگ کے مطابق مال غنیمت کے تین حصے ہوتے ہیں: جائداد منقولہ، جائداد غیر منقولہ اور قیدی یعنی مرد، عورتیں اور بچے۔

سَلَب یعنے دشمن کا لباس، کمر بند، ہتیار، اور جنگی گھوڑا گرفتار کنندہ کا حق سمجھا جاتا۔ مال غنیمت کو امام (بادشاہ) یا اس کا

[1] ریمر کی لاطینی تالیف "حلیفیاں" ج (۴) حصۂ اول ص ۳۵۔

نائب تقسیم کرتا۔ اولاً مالِ غنیمت کے حمل و نقل کے مصارف اور ممتاز خدمات انجام دینے والوں کے غیر معمولی انعامات، مالِ غنیمت میں سے وضع کرلیے جاتے ہیں۔ پھر باقی کے پانچ حصے کرتے ہیں، جن میں سے ایک حکمران کو ملتا ہے یعنی حکومت کے مرکزی خزانے میں ضروریاتِ عامہ کے لیے داخل کردیا جاتا ہے، اور اسی کو حکمران کا حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ایک فرقے نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس خمسِ شاہی کے بھی مزید پانچ حصے کیے جائیں جن پر غریب اہلِ بیتِ نبوی، مسکینوں، یتیموں، محتاجوں اور وطن سے دور مسافروں کو حقوق حاصل ہوتے ہیں۔[1]

244 جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، ۱۵۴۴ء میں آٹھویں ہنری نے جو فوجی حکمنامہ نافذ کیا تھا اس میں قیدیوں کے متعلق بھی احکام ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی قیدی اس کے سپاہیوں کے ہاتھ آئیں تو ان قیدیوں میں سے فرانس کا بادشاہ، شہزادہ، ڈیوک، ڈیوک کا بڑا بیٹا، لفٹننٹ جنرل، کانسٹبل (یعنی سرخیل قصرِ شاہی)، یا سپہ سالار، بادشاہ انگلستان کے اپنے قیدی سمجھے جائیں گے۔ البتہ اصل قید کنندہ کو ایک معاوضہ دلایا جائے گا۔ اگر کوئی شخص ان کو رہا کردیتا تو اس کے لیے سزائے موت مقرر کی گئی تھی۔ دوسرے قیدیوں کی حد تک جو فدیہ ملتا، وہ قید کنندہ کا حق سمجھا جاتا۔ البتہ جس طرح جنگ کے دیگر مالِ غنیمت پر بادشاہ کا حصہ ادا کرنا پڑتا، اسی طرح اس فدیے میں سے بھی دینا پڑتا۔

اس سے پہلے عرصے تک سالارانِ فوج اور بادشاہ میں جو

---

[1] قرآن مجید سورہ (۸) آیت (۴۱) یہ ہے: "جان لو کہ جو کچھ تمھیں مالِ غنیمت حاصل ہو تو اللہ کے لیے اس کا پانچواں حصہ ہے نیز رسول کے لیے اور قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ روؤں کے لیے ہے" (مترجم)

عہد و پیمان ہوتے تھے، ان میں عام طور پر یہ طے ہوتا تھا کہ سپہ سالار خود، اور اپنے آدمیوں کی مدد سے جتنے قیدی گرفتار کرے، وہ سب سپہ سالار ہی کے سمجھے جائیں گے " بجز بادشاہوں، شاہی نسل کے بڑے سرداروں، جنرلوں، سرخیلوں اور سپہ سالاروں کے، جن کے متعلق آقائے نامدار بادشاہ سلامت ان لوگوں سے ایک مناسب و معقول راضی نامہ طے کریں گے جنھوں نے فی الواقع ان لوگوں کو گرفتار کیا ہو"[1]
اگر پاسکئے کی بات پر اعتبار کیا جائے تو فرانس میں یہ رواج تھا کہ "ہر دفعہ اور ہر مرتبہ جب کوئی جنگی فدیہ دس ہزار لیرا [یعنی فرانک فرانسیسی سکے[2]] سے زیادہ ہوتا، تو قیدی بادشاہ کا سمجھا جاتا۔ اور بادشاہ قیدی کے اصل مالک کو دس ہزار لیرا [فرانک] ادا کر کے قیدی کو حاصل کر لیتا"[3]
وارڈ نے پاسکئے کی یہ عبارت نقل کر کے یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ

---

[1] شیکس پیر کا انگریزی ناٹک "بادشاہ ہنری چہارم" پہلا ایکٹ، پہلا منظر:-
کاز، تم کیا خیال کرتے ہو
اس نوجوان پرسی کے غرور کے متعلق؟ وہ قیدی
جو اس نے اس مہم میں پکڑے ہیں
وہ انھیں اپنی ہی منفعت کے لیے رکھتا ہے۔ مجھے بول بھیجتا ہے،
مجھے صرف مورڈیک؛ ارل آف فائف ملے گا۔"
ہنری پرسی نے جنگی رواجات پر عمل کیا تھا۔ مورڈیک شاہی نسل سے ہونے کے باعث بادشاہ کے حصے میں آیا تھا اور باقی قیدیوں کے متعلق گرفتار کنندہ نے اپنی صوابدید پر عمل کیا تھا

[2] قدیم زمانے میں فرانسیسی سکہ بھی لیفر (لیرا) یعنی پونڈ کہلاتا ہے پھر فرانک رائج ہوا (مترجم)

[3] پاسکئے کی فرانسیسی تالیف "فرانس کی تحقیقات" ۲ باب ۱۲

کافی عجیب بات ہے کہ دس ہزار لیرا کی یہ رقم وہی ہے جو تیسرے ایڈورڈ نے وے نیس ڈنور بک کو ژان، بادشاہ فرانس[1] کے متعلق ادا کی تھی۔ اور اس کا فدیہ تیس لاکھ ایکو (سکے) دینا پڑا تھا۔ فرانسسی تالیف "ہتیاروں کے کارناموں اور شہامت کے متعلق کتاب" میں اس کی مولفہ اس کی تصدیق کرتی اور بیان کرتی ہے کہ "سابق میں پورا مال غنیمت بادشاہ کا ہوتا تھا۔ اب صرف وہی چیز جس کی قیمت دس ہزار فرانک سے زیادہ ہو، بادشاہ کی ہوتی ہے۔"[1]

245

اونورے بونے[2] نرمی کی تعلیم دیتا اور کہتا ہے کہ "قیدی کا یہ حق ہے کہ اس کے ساتھ رحمدلی کا برتاؤ کیا جائے۔ اور اس کے آقا کو چاہیے کہ اس کے ساتھ رحمدلی کا برتاؤ کرے اور اس کا لحاظ رکھے کہ اس کے ساتھ بد اخلاقی کا سلوک محض اس لیے نہ ہونے پائے کہ وہ اسی کے اقتدار میں پھنسا ہوا ہے۔ اور اپنی استطاعت کے مطابق اسے مناسب غذا دیا کرے اور ہمارے خداوند [حضرت مسیح] کی راہ میں اس کے ساتھ اچھی رفاقت اور عفو اور نیکی کا سلوک کرے۔ اور اگر وہ اسے مفت رہا کرنا نہ چاہے، تو وہ اس سے مناسب مقدار میں اور اخلاق سے اتنی رقم کا مطالبہ کرے جو قیدی کے لیے، فوجی رواج یا اس کے اپنے ملک کے رواج کے مطابق، ادا کرنا ممکن ہو۔ نہ یہ کہ وہ اپنی بیوی، بچوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو توقع وراثت سے محروم کردینے پر مجبور ہو۔ کیونکہ قانون کی خواہش ہے کہ اس کے پاس فدیہ ادا کردینے کے بعد بھی اتنی جائداد بچ رہے جس سے مذکورہ رشتہ داروں کی پرورش ہوسکے۔"[2]

---

[1] کرستین دپیزاں کی فرانسسی تالیف "ہتیاروں کے کارناموں اور شہامت کے متعلق کتاب" حصہ سوم باب ۱۵۔

[2] اونورے بونے کی فرانسسی تالیف "شجرۂ حروب" حصہ چہارم باب ۴۸۔

شہامت بازی کے دور میں فدیے کا اندازہ اکثر قیدی کی سالانہ آمدنی کے
مطابق کیا جاتا تھا، اور اس سالانہ آمدنی کے لیے اسے سالیانے پر جو
حق ہوتا یا اچھی زمینوں کے معاوضے کو دیکھا جاتا۔[1] لیکن کوئی مستقل
قاعدہ نہیں پایا جاتا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بوربوں کے ڈیوک،
مارشل بوسی کو اور دیگر قیدیوں کے لیے کچھ اتنے بڑے بڑے فدیے
مانگے گئے کہ وہ ادا نہ کر سکے اور قید خانے ہی میں مر گئے۔ سنہ ۱۴۱۳ء
میں زوڑیر ذیل نور کو جو پوپ گیارھویں گرے گری کا بھائی تھا علاقہ بورخ
کے سردار یوحان نون گبرے لی نے قید کر لیا تھا۔ پوپ نے انگلستان کے
بادشاہ کو مخاطب کیا اور اس سے خواہش کی کہ وہ بیچ بچاؤ کرے
اور قیدی سے اس کے ذرائع کے مطابق ایک معقول و مناسب فدیہ
لے کر اس کی رہائی کے لیے کوشش کرے۔

سولھویں صدی میں بھی بلیز ڈموں لوک یہ سوچتا ہے کہ وہ نو عمر
رومی سردار مارک انطوان کو گرفتار کرے جسے اسّی ہزار ایکو (سکوں)
کا لگان وصول ہوا کرتا ہے، تاکہ اس سے اتنی ہی رقم وصول کر سکے۔
موں لوک کی تجویز تھی کہ اس متوقعہ فدیے سے آدھی رقم موسیو ڈلا نوت کو
اور اپنے دیگر کپتانوں اور سپاہیوں کو دے دے اور باقی خود رکھ لے۔
چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: میری دانست میں میں آسانی کے ساتھ اس
سردار کو قیدی بنا لے سکتا ہوں۔ اور اگر میں اسے پھانس سکوں تو
میں خوب مالدار ہو جاؤں گا کیونکہ میں اس سے کم سے کم اسّی ہزار ایکو
بطور فدیہ حاصل کر سکوں گا۔ یہ رقم اس کی ایک سال کی آمدنی ہے، اور فدیے
کے لیے بہت زیادہ نہیں کہی جا سکتی۔[2]

بعض دوسری مثالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوجی افسر اپنے

۱۔ لاکورن ڈ سینت پالے کی فرانسیسی تالیف "شہامت بازی کے متعلق یادداشتیں" جلد (۱)، ص ۲۶۳۔

۲۔ موں لوک کی فرانسیسی تالیف "یادداشتیں" حالات ۱۵۵۵ء

فدیے کے لیے اپنی آدھی تنخواہ ادا کرتے ہیں۔

سنہ ۱۵۸۱ء میں ٹامس اِسٹیورڈ نے ایک انگریزی کتاب شائع کی جس کا نام "فوجی ضبط و نظم کا طریقہ" تھا۔ اس میں یہ نظر آتا ہے کہ انگلستان میں ان تمام لوگوں کا فدیہ جو کپتان سے کم درجے کے ہوں، ان کی ایک ماہ کی تنخواہ ہوتی ہے۔ براعظم یورپ پر بھی یہی رواج پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۵۵۰ء میں ساکسنی کے مورِس نے جب ماگ دے بورگ کا محاصرہ کیا تو اس نے محصوروں سے یہ طے کیا کہ ان میں سے کوئی قید ہو تو اس کی رہائی کے لیے اس کی ایک ماہ کی تنخواہ کافی ہوگی۔

سولھویں صدی کے آخر میں نظام تبادلہ رائج ہوگیا جس کے تحت قیدیوں کا کسی معینہ مدت میں تبادلہ کرنے کے لیے شرطیں طے ہونے لگیں، نیز وہ رقمیں معین ہونے لگیں جو تبادلہ نہ ہو سکنے کی صورت میں بطور فدیہ طلب کی جائیں۔ اسٹیورڈ کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ جو سپاہی اپنا فدیہ ادا نہیں کر سکتے اور اقرار اور بچن لے کر رہا کر دیے جائیں تو ان کو دشمن کے پاس واپس روانہ کر دینے میں غفلت نہیں کرنی چاہیے۔ عزت اور آن کا یہی تقاضا ہے۔

سترھویں صدی کے وسط سے رواج یہ ہے کہ جنگ کے اختتام پر فدیہ مانگے بغیر تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگر فاتح چاہتا تو اپنے قیدی کو رہا کرنے سے انکار کر سکتا۔ اس سلسلے میں اِنت سیو کا واقعہ قابل ذکر ہے۔ یہ شہنشاہ دوسرے فریڈرک کا صلبی بیٹا تھا جسے وہ خاص طور پر چاہتا تھا اور جس کو اس نے سنہ ۱۲۳۹ء میں اٹلی میں اپنا عمومی سفیر مقرر کیا تھا۔ یہ بولونیا والوں کے ہاتھوں میں پھنس گیا۔ انھوں نے اسے رہا کرنے سے انکار کیا۔ اگرچہ وہ اس کے ساتھ عزت و احترام کا برتاؤ کرتے رہے

لیکن (۲۳) سال یعنی اس کے مرنے تک اس کو قید رکھا۔ اس وقت اس علاقے میں اس کی تجہیز و تکفین اور مراسم موت کے لیے بڑے شاندار انتظامات کروائے اور اس کی ایک نفیس یادگار تعمیر کروائی۔ اور لیاں کے ڈیوک کو جتنے طویل عرصے تک قید رکھا گیا تھا، اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ فرواسار بیان کرتا ہے کہ علاقہ بُوخ کا سردار پارلیس لایا گیا اور "تاں پَل کے برج میں قید کر دیا گیا اور وہاں اس کی خوب حفاظت کی جانے لگی"۔ مختلف موقعوں پر انگلستان کے بادشاہ نے دیگر قیدیوں کا تو تبادلہ کرنا منظور کیا لیکن "فرانس کے بادشاہ نے ایسا کرنا بالکل نہیں چاہا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ علاقہ بُوخ کا سردار، جو ایک عمدہ فوجی افسر اور ایک اچھا ماہر جنگ شخص ہے [جس کا رہا کرنا] سخت خطرے کا باعث ہوگا"۔[1] پانچ سال کی شدید نگرانی کے بعد یہ قیدی آخر مرگیا۔

ان افسوسناک واقعات سے قطع نظر بعض ایسے امور بھی ہیں جو شہامت کے مطابق کہے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ قرون متوسطہ کی تاریخوں کے ایک سے زیادہ اوراق میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ بڑے عمدہ اور مکمل اخلاق کا برتاؤ کیا گیا اور واقعی انسانیت کے جذبات ظاہر کیے گئے تھے۔ فرواسار نے سَیں پُول کے نوجوان کونٹ کا قصہ بیان کیا ہے جسے قید کر کے تیسرے ایڈورڈ کے "حوالے کر دیا گیا تھا" اور اسے "یہ اجازت دی گئی کہ اپنا بچن دے کر ونڈسر کے قلعے کے اندر جہاں چاہے آیا جایا کرے"، جہاں اس زمانے میں بادشاہ رچرڈ کی ماں اور اس کی بیٹی مادام ماہو، جو انگلستان کی سب سے خوبصورت عورت سمجھی جاتی تھی، ٹھیری ہوئی تھیں۔ مورخ نے بیان کیا ہے کہ "سَیں پُول کے کونٹ اور مادام ماہو باہم ایک دوسرے کے ساتھ سچی محبت اور

[1] فرواسار کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" کتاب اول حصۂ دوم باب ۳۸۸

24

اور عشق کرنے لگ گئے چنانچہ جہاں تک نظر آتا وہ ناچ کھیل اور تفریح میں ساتھ ہی رہتے۔ اور اس لڑکی نے جو سیس پول کے کونٹ سے پرجوش محبت کرنے لگی تھی، اس کا ذکر اپنی ماں سے بھی کردیا۔ چنانچہ سیس پول کے کونٹ اور مادام ماہو کی شادی رچادی گئی اور کونٹ کو ایک لاکھ بیس ہزار فرانک کا فدیہ مقرر کیا گیا اور مادام ماہو سے شادی کرلینے پر اسے ساٹھ ہزار معاف کردیے گئے[1]۔"

قرون متوسطہ میں ایک خصوصی طریقہ رائج ہوگیا۔ وہ یہ تھا کہ اگر اثنائے جنگ میں کسی کو یہ ڈر پیدا ہو کہ کسی قیدی کو اس کے ساتھی چھڑالیں گے، تو وہ قیدی سے اس قسم کا اقرار لینے لگا کہ چاہے وہ چھڑالیا جائے یا نہ چھڑالیا جائے، وہ بہرحال اس گرفتار کنندہ کا قیدی ہی رہے گا[2]۔

ایک اور رواج یہ تھا کہ اپنا زبانی بچن دے کر یا کسی کو اپنا ضامن بنا کر یا کوئی معاہداتی اقرار کرکے رہائی حاصل کرے۔ وہ شخص جو اس طرح اپنی رہائی حاصل کرلے، کیا اسے واقعی آزاد سمجھا جائے گا؟ مختلف مولفوں نے اس سوال سے بحث کی ہے۔ بالدے تسلیم کرتا ہے کہ قیدی اپنے کو آزاد سمجھ لے گا اگر وعدے یا اقرار کی تعمیل سے ایک سخت خطرہ لاحق ہوتا ہو۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ ہیں: "اور مزید برآں جان کی خاطر دھوکا دینا جائز ہے"۔ پاریس دل پوت ئیو کی رائے یہ ہے کہ حکمران کسی کو اس وعدے سے بری نہیں کرسکتا کہ وہ دوبارہ قیدی بن جائے گا۔ چنانچہ اس مولف کے لاطینی الفاظ میں "خود قانونِ اقوام و قانونِ جنگ کے تحت حقوقِ جنگ کا تحفظ کیا جاتا ہے

---

[1]۔ فرو اسار کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" کتاب دوم باب ۴۶

[2]۔ وارڈ کی انگریزی تالیف "یورپ میں قانون بین الممالک کی بنیاد اور تاریخ کے متعلق تحقیقات" کتاب اول حصہ دوم باب ۳۸۸۔